چراغوں کا دھواں

انتظار حسین

چراغوں کا دھواں

آپ بیتی

انتظار حسین

تاریخ کا جہاز

اب پاکستان کو بنے اور ہندوستان کو آزاد ہوئے پچاس برس ہو رہے ہیں۔ دونوں طرف اپنی اپنی گولڈن جوبلی منانے کی تیاریاں تھیں۔ تاریخ کی اس گھڑی کو ان روزوں کو جن پر پچاس برسوں کی گرد پڑ چکی تھی پھر سے کریدا جا رہا تھا۔ اور لیجئے ہمیں بھی کسی نے پوچھا کل تک طعنے مل رہے تھے کہ یہ شخص نوسٹالجیا کا مریض ہے۔ ہم نے جو پٹاری بند کر کے طاق نسیاں میں رکھ دی تھی اسے یہ روگی ہنوز کھولے بیٹھا ہے۔ مگر اب دور و نزدیک سے فرمائشیں آ رہی تھیں کہ ان دنوں کی یادیں قلمبند کر کے ہمیں نوازئے۔ اور فرمائشیں پاکستان سے کم باہر سے زیادہ۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے رسالہ کی فرمائش کو میں نے رسمی دعوت نامہ جانا تھا۔ مگر چند ہی دنوں بعد اس کی ایڈیٹر گیتی سین لاہور میں آن دھمکیں۔ آرٹسٹوں دانشوروں کو ٹوہتی پھر رہی تھیں کہ اس باب میں کس سے کیا لکھوایا جائے۔ ادھر گوئٹے انسٹی ٹیوٹ نے ایک ایسی ہی فرمائش کر ڈالی۔ اور یہ تو کراچی کی بات تھی۔ برلن سے ہاؤس آف ورلڈ کلچر نے ہندوستان سے اور پاکستان سے چند ادیبوں کو ایسی ہی ایک تقریب کے لیے بلا بھیجا۔ جرمن اس باب میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لیتے نظر آئے۔ شاید وہ اپنی تقسیم کے تجربے کو ہماری تقسیم کے تجربے سے موازنہ کر کے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسی گہما گہمی میں پی ٹی وی کے ایک انٹرویو لینے والے نے (شاید یہ نعیم بخاری تھے) مجھ سے ایک سوال کر ڈالا ''انتظار صاحب آپ نے کس تصور کے تحت ہجرت کی تھی۔''

الفاظ یہ نہ ہوں' خلاصہ اسی کا یہی تھا۔ مجھے اس کے سوا کوئی جواب نہ بن پڑا کہ اکھڑی ہوئی خلقت کا ایک سیلاب امنڈا ہوا تھا۔ اور سیلاب میں بہت سا خس و خاشاک بھی بہتا چلا آتا ہے۔ تو بس ایسے ہی یہ تنکا بھی بہہ کر یہاں چلا آیا۔

ٹی وی اور اخباروں کے انٹرویوز میں جو سوال کیے جاتے ہیں ان کے سلسلہ میں زیادہ تردد تو نہیں ہونا چاہیے۔ مگر ہوا یہ کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ کچھ اسی سے ملتے جلتے سوال ادھر سے آنے والے بعض نامور ادیبوں' دانشوروں سے کیے گئے۔ اور انہوں نے بڑے ٹھکانے سے اپنی ہجرت کی توجیہہ کی۔ بتایا کہ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے کس سرگرمی سے تحریک پاکستان کے جلسوں میں حصہ لیا تھا' کس جوش و خروش سے نعرے لگائے تھے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ مل کر کس طرح تحریک کے لئے کام کیا تھا۔ اور پھر جب پاکستان بن گیا تو اس نوزائیدہ مملکت کی خدمت کے جذبے نے کیسے انہیں اکسایا اور وہ گھر بار چھوڑ کر کس حال میں

یہاں پہنچے۔

ہجرت کی ان توجیہات کو سن کر اس سوال نے مجھے پھر سے آن گھیرا۔ میں نے سوچا کہ ہجرت کی ایسی ہی معقول توجیہہ میرے پاس بھی ہونی چاہیے۔ تب میں نے بیتے دنوں کو یاد کیا' میرٹھ والے دنوں کو' مگر نہ کسی سٹوڈنٹس یونین میں اپنی شرکت کی یاد آئی' نہ کسی سیاسی پارٹی کے جلسے جلوس کی ایسی یاد آئی کہ اس میں شامل ہو کر نعرہ لگایا ہو یا کم از کم تماشائی کی حیثیت ہی سے چار قدم ساتھ چلا ہوں۔ جب شام پڑے میں گھنٹہ گھر سے گزر کر اپنے ٹھکانے کی طرف جاتا ہوں تو درمیان میں ٹاؤن ہال پڑتا تھا۔ کانگریس مسلم لیگ دونوں کے جلسے اسی کے میدان میں ہوا کرتے تھے۔ تو جب میں شام پڑے اس راہ سے گزرتا تو لاؤڈ سپیکر پر شور تقریروں سے جھنجھنا رہے ہوتے۔ بس میں ایک ہی دفعہ اس راہ پر ٹھٹکا تھا۔ اس شام جب پتہ چلا کہ آج مولانا حسرت موہانی آئے ہوئے ہیں۔ وہ مسلم لیگ کے جلسہ کو خطاب کریں گے۔ مجمع بہت تھا۔ بجلی کے ہنڈوں کی روشنی کم تھی۔ حسرت موہانی کی صورت مجھے ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ان کی آواز میں بھی گھن گرج نہیں تھی۔ میں بور ہو کر جلدی ہی واپس ہو لیا۔

اچھا یہ پہلو اگر خالی تھا لو لٹنے پٹنے ہی کی کوئی داستان میرے پاس ہوتی۔ وہ بھی کوئی برآمد نہیں ہوئی۔ اپنے اس بے کیف ماضی نے مجھے بہت مایوس کیا۔ میرے پاس سنانے کے لئے کوئی کہانی اور کرنے کے لئے کوئی دعوی نہیں تھا۔ عجیب بات ہے کہ تقسیم کے اثر سے پیدا ہونے والے ادب پر اکادکا مضمون جو میں نے لکھا اس میں اس وقت کی ہجرت کے عمل کو تو برا بھلا سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے یاروں نے ایک فلسفہ ہجرت مجھ سے منسوب کر دیا۔ حالانکہ مقصود صرف اتنا تھا کہ جب اتنے بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی ہے تو اسے اپنی تاریخ کے کسی بڑے تجربے کے ساتھ پیوست کر کے دیکھا جائے کہ شاید اس سے اس عمل میں کوئی بڑے معنی پیدا ہو جائیں۔ مگر اپنی نجی نقل مکانی کو کسی قسم کے معنی پہنانے کا یا افیڈیلائز کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

رہا ملک اور قوم کی خدمت کا جذبہ تو خود خدمت کا لفظ مجھے اتنا بھاری نظر آتا ہے کہ لگتا ہے کہ اسے اپنایا تو اس کے نیچے دب کر رہ جاؤں گا۔ عمر اردو میں قلم چلاتے اور کہانیاں لکھتے ہی گزری ہے لیکن اردو کی خدمت یا ادب کی خدمت توبہ توبہ' اس متبذل تصور کا تو میں متحمل ہی نہیں ہو سکتا۔

تو مجھے کیا پتہ تھا کہ پاکستان میں پچاس برس گزارنے کے بعد مجھ سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے کیا سوچ کر اس مبارک سرزمین پر قدم رکھا تھا اور میرے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ میں اپنا بہت دھیان دوڑاتا ہوں تو بس اتنا ہی دھیان میں آتا ہے کہ مسافروں سے اٹا اٹ بھری ایک ریل گاڑی ہے کہ آباد اور اجڑی بستیوں کے بیچ سے گزرتی دوڑی چلی جا رہی ہے' اجالے میں

پھر اندھیرے میں۔ ایک اٹھاہ ڈراؤنا اندھیرا' مسافر ٹھسا ٹھس مگر جیسے پتھر کے بنے ہوں۔ سانس تک کی آواز نہیں۔ گاڑی سے باہر نہ آدمی نہ آدم زاد۔ دور دور تک اندھیرے کا ڈیرا۔ اور گاڑی کہاں جا کر رکے گی کچھ خبر نہیں۔ اور اگر رک گئی تو کبھی چلے گی بھی' کچھ خبر نہیں۔

اب پچاس برسوں کے گزرنے پر سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ تو دو وقتوں کے ملنے اور جدا ہونے کی گھڑی تھی۔ صبح و شام کے چھٹپٹے میں دو وقت کیسے چشم زدن میں ملتے ہیں اور جدا ہو جاتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ پہر بدل گیا۔ تاریخ کے اپنے صبح و شام ہوتے ہیں' اپنے ڈھلتے چڑھتے پہر۔ تو وہ تاریخ کا چھٹپٹا تھا۔ ہم پر ایک پہر جا رہا تھا' دوسرا پہر آ رہا تھا۔ جب ہی تو میرٹھ سے لاہور تک کا مختصر سفر قیامت کا سفر بن گیا۔ جیسے گاڑی میں نہیں بیٹھے' تاریخ کے جہاز میں بیٹھے ہیں۔ اور بے اختیار بیٹھے ہیں۔ گھر سے منہ اندھیرے نکلے تھے۔ اب دوپہر ہونے لگی ہے۔ سہارنپور کا سٹیشن گزر گیا ہے۔ یعنی یوپی کی سرحد سے نکل کر اب اس دیار سے گزر رہے ہیں جہاں کل تک بہت قیامت مچی ہوئی تھی۔ اب سناٹا ہے۔ جن کی قسمت میں نکلنا تھا وہ نکل گئے۔ جن کے لکھے میں کھیت ہونا تھا وہ کھیت ہو گئے۔ اب ان کے نام قریب و دور کچھ جلے پھنکے گھر نظر آ رہے ہیں۔ جہاں تہاں اجڑی پجڑی بستیاں۔ اور گاڑی ہے کہ ان سے بے نیاز دوڑی چلی جا رہی ہے۔ سہانپور تک تو ہر سٹیشن پر باقاعدہ رکتی تھی۔ پھر سیٹی بجتی' ہری جھنڈی دکھائی جاتی اور بھرے سٹیشن سے دھیرے دھیرے کر کے نکلتی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے بیٹھے مسافر پیچھے سرکتے جاتے' گاڑی آگے سرکتی جاتی۔ پھر بتدریج رفتار میں تیزی آتی۔ مگر اب سماں دوسرا ہے۔ کسی سٹیشن پر نہیں رک رہی۔ بلکہ جب سٹیشن آتا ہے تو اس کی رفتار مزید تیز ہو جاتی ہے۔ مگر لیجئے رک گئی۔ اور کس شان سے رکی ہے کہ مسلح گارڈ ڈبوں کے آگے کھڑی پہرہ دے رہی ہے۔ مجال ہے کہ پلیٹ فارم پر چلتے پھرتے لوگوں میں سے کوئی گاڑی کے قریب آ جائے۔ کرپان سے مسلح سکھ دور دور سے ہمیں گھورتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر کتنے بہت سے شرنارتھی ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ بیزاری سے ہمیں دیکھتے ہیں اور پھر بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ اور اے لو شرنارتھیوں سے لدی پھندی ایک سپیشل مخالف سمت سے چل کر ٹھیک ہماری سپیشل کے متوازی کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور ہمارا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ کتنی ستم رسیدہ خون بھری نظریں ہماری نظروں سے چار ہوتی ہیں۔ مسافر اندر ٹھسا ٹھس۔ چھت پر جو مسافر لدے ہوئے ہیں وہ ان پر مستزاد۔ یا اللہ گاڑی جب تیز چلتی ہو گی تو یہ کیسے خود کو سنبھالتے ہوں گے۔ مگر جب لوگ جانیں لے کر بھاگتے ہیں تو کچھ نہیں دیکھتے۔ نکلنے کی کوئی بھی صورت ہو غنیمت نظر آتی ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت بڑا سہارا نظر آتا ہے۔ مگر ہماری گاڑی چلتی کیوں نہیں۔ گاڑی سرکے تو غضبناک نظروں کی زد سے نکلیں۔ مگر گاڑی تو جم کر کھڑی ہے۔ سرکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

خیر دن تو جیسے تیسے گزر گیا۔ اب کالی رات ہے اور ہم ہیں۔ اور کالی سی کالی۔ باہر بھی اندھیرا' اندر بھی اندھیرا۔ انجن کی روشنی بھی غائب ہے۔ اندھی گاڑی اندھیرے میں دوڑ رہی ہے۔ اور تاریک ڈبے میں مسافر یوں بیٹھے ہیں جیسے آدم زاد نہیں' بھوت ہیں۔ اور اندھی گاڑی کیسے خوفناک انداز میں دوڑ رہی ہے۔ راہ میں آنے والے سٹیشنوں کو مطلق خاطر میں نہیں لا رہی۔ اندھا دھند دوڑے چلی جا رہی ہے۔ ہم ایک بے حس نابینا انجن کے رحم و کرم پر ہیں۔ دل زور زور سے دھڑک رہے ہیں۔ سو طرح کے وسوسوں نے گھیر رکھا ہے۔ اے لو گاڑی رک گئی۔ یہ اچانک بیچ اندھیرے جنگل میں کیوں رکی ہے۔ دل اور زور زور سے دھڑکنے لگے۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ سانس لینے کی بھی آواز نہیں۔ اندر باہر گھپ اندھیرا۔ ہاں بیچ بیچ میں سرچ لائٹ جھلک مارتی ہے۔ کچھ مسلح سپاہی نیچے اترے ہوئے ہیں۔ شاید انہوں نے خطرے کو سونگھا ہے۔ سرچ لائٹ روشنی کا احساس نہیں دلاتی' خطرے کے احساس میں شدت پیدا کر رہی ہے۔

میرے برابر ہلکی سی جنبش ہوتی ہے۔ برابر میں بیٹھے بھوت نے ماچس کی تیلی کو ڈبیا پر گھسا اور اور اچانک بھوتوں میں کھلبلی مچ گئی' کون ہے یہ۔ سگریٹ بجھاؤ۔ بجھاؤ سگریٹ۔'' میرے برابر جو بھوت بیٹھا ہے اور جس نے سگریٹ سلگائی ہے وہ اصل میں سلیم احمد ہے۔ بھلے مانس کو کیسے وقت میں سگریٹ کی طلب ہوئی ہے۔ سگریٹ اسے بجھانی پڑتی ہے۔ اور پھر پھریری لیتا ہے ''یار' اس پہ مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔'' لطیفہ سناتا ہے۔ پوری ٹولی جسے وہ ساتھ لیکر میرٹھ سے نکلا تھا ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔ غضبناک آنکھیں اندھیرے میں سلیم کو گھور رہی ہیں۔

''آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔'' اندھیرے میں ایک غصیلی آواز۔

''کس بات پر پ'' سلیم معصومیت سے پوچھتا ہے۔

ایک بوڑھی عورت جس نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر اپنا سفید برقعہ اتار کر الگ رکھ دیا ہے شفقت بھرے لہجہ میں کہتی ہے ''پوت یہ ہنسی ٹھٹھے کا وقت نہیں ہے۔ اس وقت کلمہ پڑھنا چاہیے۔''

''کلمہ میں ایمان ہو تو پڑھیں گے کلمہ۔'' وہی غصیلی آواز۔

ڈبے کے برابر سے گارڈ کو گزرتے دیکھ کر ٹولی کا ایک نوجوان پھریری لیتا ہے ''گارڈ صاحب' حملہ کتنی دیر میں ہو رہا ہے۔'' گارڈ ٹھٹھکتا ہے۔ پھر ''شٹ اپ'' کہہ کر آگے گزر جاتا ہے۔

ٹولی پھر ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔

''میں اس گارڈ کو جانتا ہوں۔ وہ جن سنگھیوں سے ملا ہوا ہے۔ جب ہی تو میرے فقرے پر اسے تتے لگ گئے۔'' وہ جیسے اپنے کھسیان پٹ کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہو۔

گاڑی حرکت میں آتی ہے۔ نہ سیٹی نہ جھنڈی۔ نہ پہیوں کی گڑگڑاہٹ۔ جیسے بے سدھ بیر بہوٹی نے بالآخر پنجے کھول کر رینگنا شروع کر دیا ہو۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' بوڑھی عورت کی اطمینان بھری آواز۔

مگر گاڑی تو تھوڑی دور چل کر پھر رک گئی۔ پھر دل دھڑ دھڑ کرنے لگے۔ ''حملہ ہونے والا ہے۔'' کسی نے سرگوشی میں کہا۔ اور سلیم کو پھر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ٹولی نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔

''اے بیٹو! خدا کا خوف کرو۔'' بڑی ہی بیچارگی سے بولیں۔''

''یار تو چپ نہیں رہ سکتا۔ سکھ بعد میں حملہ کریں گے' پہلے یہ..... '' پتہ نہیں میں کیا کہنا چاہتا تھا۔

خیر گاڑی چل پڑی۔ ''الٰہی تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' اطمینان کا لمبا سانس۔ اطمینان کہ حملہ کا خطرہ ٹل گیا۔ مگر اطمینان کی پچھلی گھڑیوں کی طرح یہ اطمینان کی گھڑی بھی عارضی نکلی۔ جلدی ہی بیکلی شروع ہو گئی کہ گاڑی کی رفتار آخر تیز کیوں نہیں ہوتی۔ کیوں اس جنگل سے تیزی کے ساتھ نہیں گزر جاتی۔ بیکلی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ گاڑی ہے کہ چل نہیں رہی' رینگ رہی ہے۔ اور کب سے رینگ رہی ہے جیسے اسے رینگتے زمانہ گزر گیا ہو۔ عجب سا احساس ہو رہا ہے کہ جیسے زمانہ پہلے اس سفر پر نکلے تھے۔ زمانہ گزر گیا اور ہم اسی طرح چلے جا رہے ہیں۔ منزل پہ کب پہنچیں گے۔ پہنچ بھی پائیں گے یا بیچ ہی میں کھیت ہو جائیں گے۔ اس راہ اس سے پہلے کتنی گاڑیاں کٹ چکی ہیں۔ کتنی گاڑیاں منزل پر اس رنگ سے پہنچیں کہ نگ پورے یعنی جتنے سوار ہوئے تھے اتنے ہی مگر زندہ کوئی نہیں۔ لاشیں ہی لاشیں۔ یہ ہم ہیں یا زمانہ قدیم کا کوئی قافلہ ہے کہ رینگتا ہوا چل رہا ہے اور جوکھوں بھری راہوں سے گزر رہا ہے۔ گاڑی سے باہر دن میں ایک اور منظر نظر آیا تھا۔ بیل گاڑیوں کی ایک لمبی قطار اٹبرا اپنے کاٹھ کباڑ کے ساتھ لدے ہوئے۔ اپنی بستیوں سے اجڑ کر نکل ہیں اور چلے جا رہے ہیں۔ گاڑی تیز دوڑ رہی ہے۔ مگر بیل گاڑیوں کی قطار کا کوئی انت نہیں ہے۔ جب باہر جھانکو قطار اسی طرح بندھی ہوئی۔ وہ کہاں جا رہے ہیں اور ہم۔ کچھ پتہ نہیں۔ بے یقینی' وسوسے' طرح طرح کے شک۔ سلیم کا وہی موڈ۔ ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ وہ ڈرا ہوا نہیں ہے۔

مگر جب واہگہ کے قریب آئے تو سہمے ہوئے لوگوں نے کس پھرتی سے جھرجھری لی۔ کس سرعت سے بزدلی کو جھٹکا اور بہادر بن

گئے۔ اندھیرے ڈبے میں تقریریں شروع ہوگئی تھیں۔ میں نے سلیم کو ٹہوکا ''اب وقت ہے تو بھی ایک تقریر ٹکا دے۔''

''میں چپ ہوں۔ اب دوسروں کے بولنے کا وقت ہے۔''

مغلپورہ کا سٹیشن یعنی لاہور آ گیا۔ میری منزل مقصود تو یہی ہے۔ عسکری صاحب کا خاندان بھی اترا پڑا ہے۔ یعنی ان کے تینوں بھائی، بہن، والدہ۔ سلیم کو اپنے گھر والوں اور اپنی ٹولی کے ساتھ کراچی جانا ہے۔

آسمان اجلنے لگا ہے۔ صبح کا دھندلکا ہے۔ پاکستان میں میری پہلی صبح۔

◆◆◆

گنگا جمنا کا پانی لاہور سے گزرا، کراچی بہہ گیا

پتہ نہیں یہ خواجہ معین الدین کے ڈرامہ ''لال قلعہ سے لالوکھیت تک'' کی برکت تھی یا اس علاقہ میں بسنے والے مہاجروں کا کمال تھا۔ بہر حال لالوکھیت نے پاکستان کے ابتدائی برسوں میں بہت شہرت پائی۔ خیر لاہور میں ہمارا اپنا ایک لالوکھیت تھا۔ لالوکھیت تو لالو کھیت نہیں رہا' لیاقت آباد بن گیا۔ مگر کرشن نگر بدستور کرشن نگر چلا آتا ہے۔ اسے اسلام پورہ بنانے کی کوششیں ابھی تک تو بار آور ہوئی نہیں ہیں۔ میں نے پاکستان میں قدم رکھنے کے بعد یہیں آنکھ کھولی تھی۔

خوب جگہ تھی۔ اجڑی اجڑی اور ساتھ ہی میں اتنی آباد کہ بازار سے گزرتے ہوئے کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ یہ سب کھوے پناہ گیروں کے تھے جو رفتہ رفتہ پناہ گیر سے مہاجرین بن گئے۔ انہیں پناہ گیروں میں وہ ایک بوڑھیا بھی تھی جس کے منہ سے نکلا ہوا معصوم سا فقرہ عسکری صاحب نے لپک لیا اور اس میں سے پاکستان کا فلسفہ کشید کر لیا۔ ہمارے آگے آگے پناہ گیروں کی ایک ٹولی میں گھری چل رہی تھی اور اپنی رو میں بول رہی تھی۔ کہنے لگی اے بھیا ملک ولک کیا ہے۔ بس بچارے مسلمانوں نے لشٹم پشٹم ایک کچا گھڑا کھڑا کر لیا ہے۔ چلو سر چھپانے کو ایک کونہ تو مل گیا۔

اسی بازار کے ایک نکڑ پہ ایک دکان کے تھڑے پہ ایک میر صاحب بیٹھے تھے۔ پورا نام تھا میر عترت۔ مظفر نگر سے لٹ پٹ کر آئے تھے۔ مگر اس تھڑے پہ اکڑ ایسے بیٹھے تھے جیسے پشتوں سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پان سگریٹ کی اس دکان پر گاہک تو کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ شعر و شاعری کا چسکا رکھنے والوں اور گپ ہانکنے والوں کی پھڑجمی رہتی تھی۔ جب بے فکروں کا ہجوم زیادہ ہوا تو میر صاحب نے ایک اعلان نامہ لکھ کر دکان پر آویزاں کر دیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہمارے حلقہ خاص میں داخل ہونے کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔ آدمی گریجویٹ ہو' خوش شکل ہو' مذاق سخن رکھتا ہو' زبان صحیح بولتا ہو۔

اس حلقہ خاص کے رکن رکین ڈاکٹر صفدر حسین تھے کہ وہ بھی مظفر نگر ہی سے تعلق رکھتے تھے اور اس دکان سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک مکان میں آ کر بسے تھے۔ دوسرا رکن جو مجھے یاد آ رہا ہے وہ سانولی رنگت والا گورنمنٹ کالج کا ایک ایم اے کا طالب علم تھا۔ نام تھا سلیم گیلانی جو شاعری سے زیادہ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ آگے چل کر ریڈیو پاکستان کے واسطے سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔

تو کرشن نگر کا بازار تو بہت آباد تھا۔ مگر گلیاں اجڑی اجڑی نظر آتی تھیں۔ کتنے گھرانے ابھی تک بے آباد تھے۔ مکان بہت اچھے

بنے ہوئے' دو دو منزلہ' سہ سہ منزلہ۔ باہر تالے پڑے ہوئے۔ اندر فرنیچر سے آراستہ۔ نقشہ بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی فساد نہیں ہوا۔ بس ان مکانوں کے مکین اچانک یہاں سے رخصت ہوئے اور اس طرح رخصت ہوئے ہیں کہ اوپر کی منزلوں کی جو کھڑکیاں کھلی تھیں وہ کھلی ہی رہ گئیں۔ دن میں ان مکانوں پر اداسی برستی۔ رات کے اندھیرے میں وہ بھوت بن جاتے تھے۔ اور جب تیز ہوا چلتی تو کھڑکیوں کے پٹ دھاڑ دھاڑ بولتے تھے۔

جو مکان آباد ہو گئے تھے وہ مکان اپنے مکینوں کے ساتھ گھلے ملے نظر نہیں آتے تھے۔ مکانوں کی اپنی شان' مکینوں کا اپنا رنگ۔ ایک ڈرائنگ روم کا نقشہ اب یہ تھا کہ اندر فرنیچر ایک کونے میں سمیٹ دیا گیا تھا۔ باقی جگہ میں بھونسہ بکھرا ہوا تھا۔ آگے برامدے میں بھینس بندھی ہوئی تھی۔

میرا عسکری صاحب کے ساتھ بسیرا تھا اور عسکری صاحب نے اپنے ایک پھپھیرے ممیرے یا خلیرے بھائی کے گھر میں چھاؤنی چھائی تھی۔ یہ گھر واجبی واجبی تھا۔ میں نے عسکری صاحب سے کہا کہ عسکری صاحب کرشن نگر میں یار تو بڑے اچھے اچھے آراستہ و پیراستہ مکانوں میں آ کر براجمان ہوئے ہیں۔ آپ کے بھائی نے یہ کیسا مکان الاٹ کرایا تھا۔ فرنیچر کے نام یہاں تو ایک کرسی بھی نظر نہیں آ رہی۔

کہنے لگے کہ اس مکان میں ایک ہی چیز ملی تھی وہ بھی مالک مکان آ کر لے گیا۔

میں نے پوچھا ''وہ کیا چیز تھی۔''

بولے ''تمہارے آنے سے کوئی دو تین دن پہلے ایک سکھ فوجی جیپ پر سوار پاکستانی پہرے میں یہاں آیا۔ کہا کہ ''یہ ہمارا مکان تھا۔ باقی سامان تو ہم نے سنگھوا لیا تھا۔ مگر یہاں ہماری مرغیوں کا ٹاپا رہ گیا ہے۔''

''مرغیوں کا ٹاپا۔'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

بولا ''بات یہ ہے جی کہ ٹاپا نہ ہونے کی وجہ سے مرغیوں کے سلسلہ میں ہمیں بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔ مہربانی کر کے ہمارا ٹاپا دے دیجئے۔''

سکھ فوجی نے ٹاپا جیپ پہ رکھا اور پاکستانی سپاہیوں کے پہرے میں بحفاظت تمام..... یہاں سے لے گیا۔

ارے یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے مجھے اپنے پہلے دن کا ذکر کرنا چاہیے۔ میں میرٹھ سے بستر بوریئے کے ساتھ سپیشل میں بیٹھا تھا۔ مگر جب لاہور میں قدم رکھا تو بستر بوریا غائب ہاتھ میں بس ایک بیگ تھا۔ یہ مت سمجھئے کہ میں لٹ پٹ کر پاکستان پہنچا تھا۔ بات یہ تھی

کہ میں نے اپنا بستر بوریا ساز و سامان والے ڈبے میں سنگھوا دیا تھا۔ سپیشل نے ہمیں مغلپورہ سٹیشن پر انڈیلا اور اس بند ڈبے سمیت پنڈی روانہ ہوگی۔ خیر پہلی رات تو جیسے تیسے گزر گئی۔ صبح کو میں نے کہا کہ جاڑا تو شروع ہو چکا ہے۔ بغیر لحاف گدے کے یہ راتیں کیسے گزریں گی۔ عسکری صاحب نے کہا کوئی بات نہیں۔ یہاں ایک لنڈا بازار ہے۔ وہاں کمبل بہت سستے مل جائیں گے۔ تو آج وہاں چلتے ہیں۔

مگر لنڈا بازار جانے سے پہلے عسکری صاحب نے گورنمنٹ کالج کا رخ کیا اور مجھے آفتاب احمد خاں سے ملایا۔ لاہور میں اترنے کے بعد یہ میری یہاں کے کسی شخص سے پہلی ملاقات تھی۔ پھر لنڈا بازار گئے۔ کوڑیوں کے مول دو کمبل خرید لیے۔ لیجئے ہماری تو عید ہوگئی۔ لاہور کے کڑکڑاتے جاڑوں کو یہ ایک پناہ گاہ گیر کا داندں شکن جواب تھا۔

دن ڈھلے عسکری صاحب بولے ''چلو شاہد صاحب کی طرف چلتے ہیں۔''

''شاہد صاحب'' میں نے حیران ہو کر عسکری صاحب کو دیکھا۔

''یار وہ خبر غلط تھی۔ میں جب یہاں آیا تو شاہد صاحب صحیح و سالم یہاں آئے بیٹھے تھے۔''

اصل میں میرٹھ میں اڑتے اڑتے یہ خبر پہنچی تھی کہ جس سپیشل میں شاہد صاحب دلی سے چلے تھے وہ رسے میں پوری کٹ گئی۔ شاہد احمد دہلوی خاندان سمیت اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شاہد صاحب پاس جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک بزرگ بر میں اچکن' سر پہ ترکی ٹوپی' ٹانگوں میں پتلی موری والا پائجامہ' چہکتے بولتے زینے سے اترے اور محفل میں آن شامل ہوئے۔ بامحاورہ اردو میں کتنا تیز تیز بول رہے تھے جیسے بھاڑ میں چنے بھن رہے ہوں۔ پھر ایک جوان وارد ہوا۔ گوری رنگت' لباس موسم سے بے نیاز' بر میں سفید اچکن' اس پر چوڑی دار سفید پائجامہ' سفید پاپوش۔ انہوں نے چہکنا شروع کیا تو چہکتے بولتے بزرگ ماند پڑ گئے۔ وہ بزرگ اشرف صبوحی تھے۔ یہ جوان رعنا حکیم حبیب اشعر تھے۔ لیجئے یکمشت اتنے دلی والوں سے نیاز حاصل ہو گیا۔ بلکہ دلی سے شاید یہ میرا پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔ پھر شاہد صاحب نے اعلان کیا کہ بھئی میاں صاحب کی طرف چلنا ہے۔ انہوں نے ہم سب کو سمیٹا اور چلے بارود خانے میاں ایم اسلم کی حویلی کی طرف۔

میاں ایم اسلم جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔ سامعین فراہم ہو چکے تھے۔ دیر کس بات کی تھی۔ زیر تحریر ناول سنانا شروع کر دیا۔ دو ڈھائی باب سنانے کے بعد بستر لپیٹا۔ اب چائے کی پکار پڑی۔ ناول خوب' چائے مرغوب' ہیرا منڈی سے آئے ہوئے خاص قسم کے سیخ کباب' گرم جلیبیاں' ساتھ میں برفی۔

جب ہم واپس ہو رہے تھے تو رات ہو چکی تھی۔ دن ڈھلے جو بازار اجڑا اجڑا نظر آیا تھا اب وہاں خوب بھیڑ بھڑ کا تھا۔ یار ابلے گھلے پھرتے تھے۔ پاؤں زمین پر نظریں بالا خانوں پر پپ روشن بالا خانوں میں روشن چہرے سجے ہوئے۔ کسی کسی بالا خانے سے ہارمونیم اور طبلے کی آواز آ رہی تھی۔ عسکری صاحب نے اس علاقے کا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ ہیرا منڈی ہے۔ دلی میں چاوڑی بازار حسیناں کی منتقلی سے پہلے جو مقام حاصل تھا وہی اس بازار کا مقام ہے۔

تو یہ تھا پاکستان میں میرا پہلا دن جس کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ اول آفتاب احمد خاں' دوم لنڈا بازار' سوم میاں ایم اسلم' چہارم ہیرا منڈی۔ اول اول ان چار چیزوں کے واسطے سے میں نے پاکستان کو جانا۔ آج بھی ان چاروں اشیاء میں سے کسی ایک کو بھی منہا کر کے میں پاکستان کا تصور نہیں کر سکتا۔

لنڈا بازار تو خیر پاکستان کے اول دن کے بعد جانے کا موقع نہیں ملا۔ بیس بائیس سال بعد ایک مرتبہ کالم نگاری کی تقریب سے وہاں جانے کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ مگر ہیرا منڈی سے ملاقات کی تقریب شاہد صاحب اور میاں ایم اسلم کے واسطے سے ایک ڈیڑھ ماہ تک مسلسل رہی۔ ایک رات میں نے اس راہ سے گزرتے ہوئے عسکری صاحب سے کہا کہ ''ہم روز رات کو یہاں سے گزرتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی تماش بین ہیں۔''

''ارے یار' تم نے ہیرا منڈی ابھی دیکھی کہاں ہے۔ ٹخیائیوں کی گلی دیکھی ہے۔ چلو آج ادھر سے چلتے ہیں۔''

ٹخیائیوں کی گلی۔ واہ واہ۔ ہجوم عاشقاں اتنا کہ سچ مچ کھوے سے کھوا اچھلتا تھا۔ کھڑا کھیل فرخ آبادی۔ سودا نقد۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ مال سامنے دروازے میں سجا ہوا۔ دام کرائے کام۔ تیر کے موافق اندر گئے۔ شتابی سے فارغ ہو باہر آئے۔ پھر سٹ پٹ کرتے اپنی راہ ہو لیے۔

بس اسی طرح چلتے پھرتے مٹر گشت کرتے میں ایک ہفت روزہ کا مدیر بن گیا۔ ہوا یوں کہ بمبئی کے مشہور ہفت روزہ ''نظام'' کے مالک نے بمبئی سے اپنا کاروبار سمیٹا اور لاہور آ گئے۔ میاں ایم اسلم سے ایڈیٹر کے سلسلہ میں صلاح مشورہ کیا۔ میاں صاحب نے شاہد صاحب سے مشورہ کیا اور پھر میرا نام ادارت کے لئے پیش کر دیا۔ لیجئے ہم نظام کے ایڈیٹر بن گئے۔

نظام کا دفتر اول اول بینک سکوئر میں حبیب بینک بلڈنگ کی چوتھی یا شاید پانچویں منزل پر قائم ہوا تھا۔ مگر میں روز صبح کو اس بلڈنگ میں قدم رکھ کر سب سے پہلے بینک میں جھانکتا تھا۔ یہاں ایک کاؤنٹر پر یوسف بیٹھے نظر آتے تھے اور میں یہ دیکھا کرتا تھا کہ ایک شاعر بینک کے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا کیسا لگتا ہے۔

ایک صبح میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ حبیب بینک کا ایک چپڑاسی ڈھونڈتا ڈھونڈتا میرے کمرے میں آیا۔ پوچھا ''انتظار حسین آپ ہیں جی۔''

میں نے کہا ''ہاں جی' کہو کیا بات ہے۔''

''جی تاڈا ایک مہمان ہندوستان سے آیا ہے۔''

''ہندوستان سے میرا مہمان۔ کیا نام بتایا اس نے۔''

''نام اس نے نہیں بتایا جی۔ نیچے بینک کے گیٹ پر کھڑا ہے۔''

میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا اور بینک کے گیٹ پر نظر ڈالی۔ ریوتی۔ میں سخت چکرایا۔ ہندو تو اب اس شہر میں نسخہ کے لئے نہیں ملتا۔ یہ کیسے اور کہاں سے نمودار ہو گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ تیزی سے سیڑھیاں اتر نیچے پہنچا۔ سچ مچ سامنے ریوتی کھڑا تھا۔ کتنے اندیشوں اور وسوسوں نے مجھے ایک دم سے آ گھیرا۔ ''احمق' بے سوچے سمجھے منہ اٹھائے چلا آیا۔ مجھے پہلے بتایا تو ہوتا۔ پوچھا ہوتا۔''

''تو نے یہاں آتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا۔''

میں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ دفتر میں کسی کو بتاؤ مت کہ یہ مہمان ہے کون۔ مگر ریوتی شاید بمبئی میں نظام کے مالک یوسف چودھری سے مل چکا تھا۔ اس نے خود ہی ان سے علیک سلیک کر لی۔ اس سے میری بھی کچھ ہمت بندھی۔ بس پھر ایک ایک سے تعارف ہوتا چلا گیا۔ کسی کے ماتھے پر میں نے کوئی شکن نہیں دیکھی' چہرے پر نفرت کا کوئی شائبہ نہیں دیکھا۔ بس میں شیر ہو گیا۔ دفتر سے نکل کر ہوٹلوں میں جھانکا۔ ہاں اس وقت مجھے ایک مسئلہ کا احساس ہوا کہ اب یہ تو خالص مسلمانوں کا ملک ہے اور میرا دوست بھاجی ترکاری کھانے والی مخلوق۔

میں نے گھر جا کر عسکری صاحب سے ذکر کیا کہ ریوتی آ گیا ہے۔ یہ تو گوشت کیا پیاز کی بو سے بھی بدکتا ہے۔ میں اس کے کھانے کا کیا بندوبست کروں۔ وہ فوراً اندر گئے۔ اپنی والدہ سے یہ ذکر کیا۔ واپس آ کر کہا کہ والدہ کہتی ہیں کہ تمہارے دوست کے مہمان کے لیے دال سبزی کی ہنڈیا بے پیاز کی الگ پکے گی۔ مگر وہ مسلمان کے ہاتھ کا بنایا ہوا کھانا کھا بھی لے گا۔

ڈیڑھ دو ہفتے تک ریوتی کو شہر میں مختلف ادبی حلقوں میں لیے لیے پھرا۔ یہ سوچ کر کتنا اطمینان ہوا کہ لاہور فسادات کے اثرات سے بالکل باہر نکل آیا ہے۔ ہندو کو دیکھ کر خون بالکل نہیں کھولتا۔ بس تجسس ہوتا ہے۔

ویسے تو آنا جانا بند تھا۔ معمول کے ذرائع سفر معطل تھے۔ ہمت ہے تو سپیشل میں بیٹھ جاؤ کہ سپیشلیں آبادیوں کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ڈھو رہی تھیں۔ مگر سپیشل میں بیٹھنے کا مطلب یہ تھا کہ واپسی کا راستہ بند۔ پھر بھی گنے چنے لوگ خصوصی پرمٹ کے ذریعہ جانے آنے کی سبیل پیدا کر ہی لیتے تھے۔ آخر ریوتی آیا ہی تھا اور اطمینان سے واپس بھی گیا۔ بس ایسے ہی شاہد صاحب ایک روز دلی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خون کی چڑھی ندی اب وہاں اتر گئی تھی۔ سو شاہد صاحب وہاں گئے اور ضروری کاغذات رسالے کتابیں سمیٹ کر واپس آئے۔ جب واپس آئے تو بھرے ہوئے تھے۔ فوراً ہی رپورتاژ لکھنے بیٹھ گئے۔

شاہد صاحب بھی خوب تھے۔ جب گھر سے قدم نکالتے تھے تو اکیلے کبھی نہیں ہوتے تھے۔ ایک پوری برات ساتھ ہوتی تھی۔ اشرف صبوحی، حبیب اشعر، عسکری صاحب اور اب میں اس برات میں شامل ہو چکا تھا۔ ایک شام شاہد صاحب نے پوری برات کے ساتھ کینال بینک کے ایک گھر پر جا کر دستک دی۔ پتہ چلا کہ یہ وہ گھر ہے جہاں حکیم اجمل خاں کی آل اولاد نے آ کر ٹھکانا کیا ہے۔ حکیم محمد نبی خاں میزبان بنے ہوئے تھے۔ دلی کے اجڑے لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ اصل میں یہاں شاہد صاحب کو اپنا وہ رپورتاژ سنانا تھا جو انہوں نے دلی کے حوالے سے لکھا تھا رپورتاژ خاصا طویل تھا۔ کتنی دیر تک شاہد صاحب سناتے رہے اور محفل پہ سناٹا چھایا رہا۔ مگر شاہد صاحب اس رپورتاژ کو پورا نہیں پڑھ سکے۔ پڑھتے پڑھتے اچانک ان کی آواز بھرا گئی۔ پھر رقت طاری ہو گئی۔ اور رقت بھی ایسی کہ ہچکی بندھ گئی۔

پھر وہ پوری محفل ہی محفل گریہ بن گی۔ بس ہم دو غیر دہلوی میں اور عسکری صاحب اپنی خشک آنکھوں کے ساتھ دم سادھے بیٹھے تھے۔

اب میں اس منظر کو دھیان میں لاتا ہوں تو دھیان زقند لگا کر اس سے کہیں بہت پیچھے پہنچ جاتا ہے۔ 1857ء کی قیامت میں بھی دلی سے ایک خلقت کو نکلنا پڑا تھا۔ خیر جب فرنگی حاکموں کا مزاج قدرے ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے خلقت کو واپس آنے کی اجازت دیدی۔ پھر بھی کتنے لوگ تھے کہ جنہیں اپنے شہر میں واپس آنا نصیب نہیں ہوا۔ کتنوں کی زندگی کے باقی ایام اس طور گزرے کہ مستقل دلی کو یاد کرتے تھے اور روتے رہتے تھے۔ دلی نے ہمیشہ ہی وقفے وقفے سے اپنے گود کے پالوں کو بہت رلایا ہے۔ وہ اس کی گود سے چھٹ کر دربدر رلتے اور روتے پھرتے ہیں۔ ادھر یہ خاک و خون میں لوٹ کر پھر سے جی اٹھتی ہے۔ چولا بدل کر نئے نویلوں کو گود لے کر پھر خوش و خرم نظر آنے لگتی ہے۔ جب مولانا حالی دلی مرحوم کا فسانہ سنا رہے تھے عین اسی ہنگام اس خاکستر سے ایک نئی دلی جی اٹھنے کے لئے کنمنا رہی تھی۔ اور ادھر جب شاہد احمد دہلوی اپنے باپ دادا اور حکیم محمد نبی خاں کے باپ دادا والی دلی کی بربادی پر

اشک بہار ہے تھے تو ادھر دلی نے اپنی خالی ہو جانے والی گود کو تازہ وارد خانہ بربادوں کے لیے وا کر کر رکھا تھا۔ اور اب دلی میں پہلے سے بڑھ کر امی جمی ہے اور کسی کو یہ یاد بھی نہیں ہے کہ یہیں کسی کوچے میں بیٹھ کر شاہد صاحب کے دادا ڈپٹی نذیر احمد نے دلی کی نئی کہانی لکھی تھی اور جہاں بلی ماراں کے کوچے میں ایک نیا بازار لگا ہے وہاں آگے ایک دیوان خانہ تھا جہاں رنگ رنگ کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ رات کو شاعری اور داستان گوئی کی محفلیں۔ دن میں گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر سیاسی مسکوٹیں۔ دلی کے پرانے روڑے خاک ہوئے۔ اب دلی نئی نویلی ہے۔ نئے اس کے روڑے ہیں۔

مگر خیر یہاں ذکر ان دلی والوں کا تھا جنہوں نے دلی سے نکل کر لاہور میں چھاؤنی چھائی تھی۔ دلی کا پانی بہہ کر لاہور آیا۔ مگر نشیب کراچی میں تھا۔ آخر کے تئیں زیادہ پانی اسی نشیب میں جا کر مرا۔ مگر جنہیں کراچی جانا تھا وہ بھی ابھی لاہور میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

شاہد صاحب کی مار پانی کے تالاب سے بس بارود خانے تک تھی۔ یعنی گھر سے نکلے اور میاں ایم اسلم کی حویلی میں جا براجے۔ مگر اسی دوران انہوں نے ایک اور رستہ دیکھ لیا۔ آخر شاہی قلعہ بھی تو اسی نواح میں تھا۔ وہاں ولی اللہ صاحب جو دلی ہی کے ایک فرزند تھے ماہر آثار قدیمہ کی حیثیت سے خیمہ زن تھے۔ شاہد صاحب نے اور ان کے ساتھ اجڑے پجڑے دلی والوں نے اس طرف کا رخ کیا۔ ہفتے کے ہفتے اکٹھے ہوتے اور شاہی قلعہ میں بیٹھ کر لال قلعہ کو یاد کرتے۔ لگتا تھا کہ یہ شاہی قلعہ نہیں دلی والوں کی دیوار گریہ ہے۔

مشرقی پنجاب سے جو بچ کر آ سکتے تھے وہ پہلے ہی آ چکے تھے۔ اب ادھر بچا کون تھا جو آتا۔ دلی سے بھی جنہیں آنا تھا کم و بیش آ چکے تھے۔ مگر یوپی سے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ فساد آج اس نگر میں کل اس نگر میں۔ جو نگر فساد کی زد میں آتا وہاں سے مسلمان خلقت لٹ پٹ کر نکلتی اور پاکستان کی طرف چل پڑتی۔ لشٹم پشٹم واہگہ کی سرحد پر پہنچتے اور پھر سیدھے لاہور میں۔ ویسے تو یہ پانی بھی زیادہ تر کراچی ہی کی طرف بہہ رہا تھا۔ لیکن آنے والے پہلے لاہور کی خاک پھانکتے تھے۔ پھر آگے جاتے تھے۔

یوپی سے جو قافلہ آتا اس میں بقدر نمک شاعر بھی ہوتے۔ مگر قافلے آتے چلے جا رہے تھے اور لاہور میں نمک اکٹھا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ عالم ہوا کہ کرشن نگر شاعروں سے لبریز نظر آنے لگا۔ لاہور میں شاعر پہلے ہی کونسے کم تھے۔ اب خانہ برباد شاعروں کی لگاتار آمد سے شہر میں شاعروں کی ریل پیل ہو گئی۔ جو شاعر کرشن نگر میں آ کر پڑاؤ کرتا وہ پہلے میر عترت حسین کی چھتری پر گرتا۔ پھر وہاں سے سن گن لے کر سونگھتا سونگھتا مشاعرے میں جا پہنچتا۔ مشاعرے ان دنوں لاہور میں بہت ہو رہے تھے۔ کچھ لاہور کی اپنی مشاعروں کی روایت کچھ خانہ خراب شاعروں کے نام کی برکت۔ شہر میں مشاعرے زور پکڑ گئے۔ ادھر ہم شہر کی خاک

چھانتے پھرتے تھے۔ اجی ہم اس وقت کس گنتی میں تھے۔ اصل میں عسکری صاحب کے پاؤں میں سنیچر تھا۔ ٹھالی ٹھسکے' کرنے کو کچھ نہیں۔ قلم تو اس لیے رکا ہوا تھا کہ ''ساقی'' ابھی نکلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ شہر میں یوں ادبی رسالے کم نہیں تھے۔ مگر وہ تو ترقی پسند رسالے تھے۔ عسکری صاحب کو وہ وارا نہیں کھاتے تھے۔ اچھا پڑھنا بھی فی الحال موقوف تھا۔ میں نے تو ان دنوں عسکری صاحب کے ہاتھ میں صبح دوپہر شام رات کسی بھی وقت کتاب دیکھی نہیں۔ جیسے پڑھنے لکھنے سے جی اچاٹ ہو گیا ہو۔ بس واہی تباہی پھرتے رہتے تھے۔ جب تک ''نظام'' کے دفتر میں مصروفیت پیدا نہیں ہوئی میں بھی ان کے ساتھ لخ لخ پھرتا رہتا۔ صبح ہوئی اور نکل کھڑے ہوئے۔ پاؤں میں چکر تھا۔ جدھر بھی اٹھ گئے۔ گھوم پھر کر دو ڈھائی بجے گھر پہنچے۔ کھایا پیا' لیٹے بیٹھے۔ پھر عسکری صاحب کے پاؤں میں کھجلی ہونے لگی۔ پھر نکل کھڑے ہوئے۔ اب دن ڈھلے پاؤں ادبدا کر شاہد صاحب کی طرف اٹھ جاتے۔ وہاں دلی والوں کی پھڑ جمی ہوتی۔ اشرف صبوحی کی چٹاخ پٹاخ باتیں دلی کے محاورے کے چٹخارے کے ساتھ۔ وہ سانس لینے کے لیے رکے تو حبیب اشعر رواں ہو گئے۔ بیچ بیچ میں شاہد صاحب اپنے انداز میں فقرہ لگاتے۔ اور عسکری صاحب گم متھان۔ اور اچانک شاہد صاحب اٹھ کھڑے ہوتے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ وہی میاں ایم اسلم کی بیٹھک۔ پھر بیٹھے ان کے ناول کا باب سن رہے ہیں اور پھر شاہی محلہ کی خاص دکان سے آئی ہوئی برفی' جلیبیاں اور کباب کھا رہے ہیں۔

میاں ایم اسلم کے یہاں سے نکلتے نکلتے رات ہو جاتی۔ شاہی محلہ لخیائیوں کی گلی۔ پھر گھر کی طرف۔ لیکن ابھی سے گھر جا کر کیا کریں۔ اور عسکری صاحب کو یاد آتا کہ آج تو فلاں جگہ مشاعرہ ہے۔ لیجیے مشاعرے میں گھس گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلتا ہے کہ یوپی سے کتنے اور شاعر لٹ پٹ کر اس مہاجر نواز شہر میں آن پہنچے ہیں۔ لاہوریوں نے لٹے پٹوں کے لیے دیگیں بہت پکائیں۔ خیر ان دیگوں کو تو میں نے آنکھ سے دیکھا نہیں۔ بس سنتے تھے۔ لیکن درماندہ شاعروں کی تواضع اپنی آنکھ سے دیکھی۔ گورنمنٹ کالج میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔ پطرس بخاری صدارت کر رہے ہیں۔ اچانک کھڑے ہوتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ حضرات آج ہی یوپی سے ایک شاعر بے بدل ہمارے شہر میں وارد ہوا ہے اور اس مشاعرے میں موجود ہے۔ پھر بخاری صاحب نے اس شاعر بے بدل کی تعریف میں ایسا سماں باندھا کہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں جگر صاحب یا جوش صاحب تو ہجرت کر کے پاکستان نہیں آ پہنچے۔ آخر بخاری صاحب کا بھی تو اپنا ٹھسا تھا۔ چھوٹوں موٹوں کو وہ کب خاطر میں لاتے تھے۔ مگر جب وہ شاعر سٹیج پر نمودار ہوا تو عسکری صاحب بے ساختہ ہنسے۔ بولے' بخاری صاحب خواہ مخواہ ہم بہ رعب گانٹھ رہے تھے۔ ارے یہ تو نذر امروہوی ہے۔

ہجرت اور فسادات شاعروں کا ان دنوں مرغوب موضوع تھا۔ مشاعروں میں اس مضمون کو مقبولیت حاصل تھی۔ دل دکھے ہوئے

تھے۔شعر ذرا بھی اچھا ہوتا تو دل میں جا کر تیر کی طرح لگتا تھا۔شاعر کو اگر اس موضوع کے واسطے سے بھی داد میسر نہ آئی تو پھر یہ اس کی قسمت۔عبدالمجیب بھٹی نے اسی موضوع پر اپنے رنگ میں نئی نظم لکھی تھی۔عنوان تھا غنڈہ۔

میں تجھے قتل ہی کر دوں گا۔

مگر آج کی رات

اس کے بعد شاعر نے کیا کہا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔مجمع نے غل مچانا شروع کر دیا۔غنڈہ ہے' غنڈہ ہے۔

بھٹی صاحب اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ سوٹ بوٹ میں ملبوس کس رکھ رکھاؤ سے سٹیج پر آتے تھے مگر ادھر ان کی زبان سے مصرعہ نکلا۔

''ہم تمہیں قتل ہی کر دیں گے مگر آج کی رات''

اور ادھر مشاعرے میں شور پڑ گیا.....غنڈہ ہے۔

بھٹی صاحب مستقل مزاج غضب کے تھے۔انہوں نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ہمیشہ مشاعرے میں اسی نظم کو پڑھنے پر بضد رہتے تھے۔اور ہر مشاعرے میں ہم نے یہ نظم شروع ہوتے تو دیکھی ختم ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔

خواجہ دل محمد کیا بزرگ تھے۔ان مشاعروں میں شاعروں کی حد تک تو بس ایک ہی ترکی ٹوپی نظر آتی تھی اور وہ تھی خواجہ صاحب کی ٹوپی۔وہ بھی ہمیشہ ایک ہی غزل پڑھنے پر اصرار کرتے نظر آتے تھے۔اس غزل میں ذکر حسن یار کے ساتھ اللہ اکبر کا جملہ آتا تھا۔اسی کے ساتھ مجمع سے کوئی ایک آواز بلند ہوتی۔نعرۂ تکبیر اور مجمع پکار اٹھتا اللہ اکبر اور پھر نظم کا کوئی شعر سنائی نہ پڑتا۔

ہاں اس زمانے کا ایک شعر یاد آیا۔شعر بھی نرالا' شاعر بھی نرالا۔عسکری صاحب اور میں چلتے پھرتے لارنس باغ جا نکلے۔وہاں اوپن ایئر تھیٹر میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ہم نے جب وہاں قدم رکھا تو نقشہ یہ دیکھا کہ سٹیج پر ایک شاعر چہل قدمی کر رہا ہے۔گوری رنگت' چھریرا بدن' بر میں ململ کا کرتا' ٹانگوں میں پتلی موری کا پائجامہ' ہاتھ میں چھڑی' اوپن ایئر تھیٹر کے وسیع و عریض سٹیج پر ٹہلتا چھڑی گھماتا دائیں سے بائیں جاتا ہے' بائیں سے دائیں آتا ہے اور یہ شعر پڑھتا ہے۔

دیکھتا کیا ہے مرے منہ کی طرف

قائد اعظم کا پاکستان دیکھ

میں نے حیرت سے شاعر کو دیکھا اور عسکری صاحب سے پوچھا ''عسکری صاحب' یہ کون شاعر ہے۔''

''ارے ارے تم نہیں جانتے۔ یہ نفیس خلیلی ہیں۔''

یہ سارے مشاعرے ان دنوں کے ہیں جب ہم ٹھالی ٹھسکے واہی تباہی پھرتے تھے۔ پھر ہم کہاں مشاعرے کہاں۔ اس کے بعد نہ عسکری صاحب کو میں نے مشاعرے میں دلچسپی لیتے دیکھا نہ خود مجھے اس میں دلچسپی نظر آئی۔ اس کے بعد کا تو بس ایک ہی مشاعرہ مجھے یاد ہے۔ یہی کوئی ڈھائی تین سال کے بعد کا۔ اور کیا دھوم کا مشاعرہ تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے وسیع ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ کیسا کیسا شاعر آیا بیٹھا تھا۔ سب سے بڑھ کر جگر صاحب جن کا اس زمانے میں پورے برصغیر میں طوطی بولتا تھا۔ چھوٹے موٹے شاعروں کو سامعین سننے پر امادہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ جو شاعر سٹیج پر نمودار ہوتا ہوٹ ہو کر رخصت ہوتا۔ اسی ہنگام ایک نئی ہی صورت سٹیج پر نمودار ہوئی۔ برس تیرہواں یا کہ چودہ کا سن۔ چھریرا بدن' بوٹا سا قد' گوری رنگت' بر میں سفید ساڑھی' بال کھلے ہوئے۔ آپ نے فلم ''جوگن'' تو دیکھی ہوگی۔ بس سمجھ لیں کہ یہ بی بی اس جوگن کی چھوٹی بہن نظر آ رہی تھی۔ وہ بھجن گاتی تھی۔ یہ غزل سرا تھی۔ درد اور سپردگی کا عالم وہی۔ ترنم قیامت۔ مضمون' ہجرت کا درد والم۔ لٹنے پٹنے گھر سے بے گھر ہونے کا دکھڑا۔ لگتا تھا کہ وہ سارا درد والم آواز میں گھل گیا ہے۔ ابھی یہ تجربہ ہمارے دل و دماغ میں زندہ تھا۔ سو جو شعر اس نے پڑھا دلوں میں جا کر ترازو ہو گیا۔ بس داد کے ڈونگرے برسنے لگے۔ غزل ختم ہوئی تو دوسری غزل کی فرمائش۔ دوسری ختم ہوئی تو تیسری کی فرمائش۔ مجمع ہے کہ شاعرہ کو جس کا نام زہرہ نگاہ بتایا گیا تھا سنے جانے پر بضد تھا۔

منتظمین نے اپنی دانست میں بجا سوچا کہ جگر صاحب کو دعوت کلام دی جائے۔ مجمع مطمئن ہو جائے گا۔ سو جگر صاحب کا نام پکارا گیا۔ مجمع تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ جگر صاحب مائک کے سامنے تشریف لائے۔ ابھی وہ گنگنا رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی..... زہرہ نگاہ۔

بس پھر کیا تھا، چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ زہرہ نگاہ، زہرہ نگاہ۔

جگر صاحب چپ۔

جب شور نہ تھما تو خاموشی سے مائک کے سامنے سے سرکے اور اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ پھر کیا ہوا' مجھے یاد نہیں آ رہا۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ عابد علی صدارت کر رہے تھے۔ انہیں یہ گوارا نہیں ہوا کہ رئیس المتغزلین پر اس رنگ سے ایک نوخیز شاعرہ کو ترجیح دی جائے۔ نتیجہ ہنگامہ۔ میرا حافظہ آگے کچھ نہیں بتاتا۔

مگر اب جب میں پچاس برس بعد ان سارے مشاعروں کو تصور میں لا رہا ہوں تو مجھے نفیس خلیل اپنی سج دھج کے ساتھ سب

شاعروں پر چھائے نظر آ رہے ہیں۔ جیسے مشاعرہ اسی رنگ سے گرم ہے اور نفیس خلیلی چھڑی گھماتے ہوئے اوپن ایئر تھیٹر کے وسیع ٹیج پر ٹہل رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں

دیکھتا کیا ہے مرے منہ کی طرف
قائد اعظم کا پاکستان دیکھ

◆◆◆

منٹو عسکری شیریں تثلیث بمقابلہ ترقی پسند تحریک

قیامت خیز 1947ء ختم ہوا۔ اب 1948ء شروع ہو رہا تھا۔ خیر ویسے تو سال آتے جاتے رہتے ہیں۔ ماہ و سال کا بے انت سلسلہ کب سے چلا آ رہا ہے۔ بیچ بیچ میں ایسے سال بھی آتے ہیں جنہیں تاریخ ساز کہیں تو بجا ہے۔ مگر یک لخت دنیا ہی بدل جائے' ایسا قیامت کا سال تو کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ بھلا مجھے یہاں آئے ہوئے ایسا کونسا زمانہ بیتا تھا۔ یہی کوئی دو ڈھائی مہینے مگر لگ رہا تھا کہ ایک پورا زمانہ پیچھے چھوڑ آیا ہوں اور اب اور ہی زمانے میں سانس لے رہا ہوں۔ زمین و آسمان بھلا اس طرح بھی بدلتے ہیں۔ وہ زمین و آسمان اور تھے۔ ان کی بو باس اور تھی۔ یہاں زمین و آسمان اور تھے۔ بو باس ان کی اور تھی۔ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھے ایک نئے ذائقے کا احساس ہوتا۔ یہ اچھا لگتا۔ مگر چھوڑی ہوئی زمین بھی اپنی ساری بو باس کے ساتھ تصور میں منڈلاتی رہتی۔ بلکہ اس کی بو باس کو تو اب' اس دیار میں آ کر جان رہا تھا۔ وہاں تو یہ شعور ہی نہیں تھا کہ کس ہوا میں سانس لے رہے ہیں' کن موسموں میں بسر کر رہے ہیں۔ دنیا بدل گئی تو اوجھل ہو جانے والی دنیا کی قدر معلوم ہوئی۔

بہر حال اب اس شہر میں میری آنکھیں کھلنی شروع ہوئی تھیں۔ اب تک تو یہ تھا کہ عسکری صاحب مجھے سات گھر جھنکاتے پھرتے تھے۔ ان کی انگلی پکڑے مستقل شہر کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ ''نظام'' سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی راہ الگ' میری راہ الگ۔ ان کا وہی طور کہ جلے پاؤں کی بلی بنے پھرتے ہیں۔ مگر میں ہلہ سے لگ چکا تھا۔ ان کے ساتھ اب پہلے کی طرح گھوم پھر نہیں سکتا تھا۔ یوں انہوں نے اپنے لیے ایک مصروفیت پیدا کر لی تھی۔ مکتبہ جدید کے لئے فلابیر کا ''مادام بواری'' ترجمہ کرنے بیٹھ گئے۔ مگر پھر بھی بیٹھے کہاں۔ صبح ناشتہ کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے اس کام میں لگاتے۔ اس طرح کہ وہ بولتے جا رہے ہیں اور ان کے بھائی محمد حسن مثنیٰ لکھتے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد نکل کھڑے ہوئے۔ شام کو جب میں لوٹتا تو عسکری صاحب کو غائب پاتا۔ پھر میرا وقت عسکری صاحب کے بھائیوں کے ساتھ گزرتا۔ حسن مثنیٰ' حسن ثالث' حسن رابع۔ مگر میں کونسا روز پابندی سے شام کو واپس گھر آ جاتا تھا۔ عسکری صاحب نے شہر سے جتنا تعارف کرایا کرا دیا۔ میں اب اپنے طور پر شہر کو دریافت کر رہا تھا۔ ادبی حلقوں میں گھسنے اور میل ملاقات پیدا کرنے کے لئے میرے پاس ایک بہانہ بھی تھا۔ آخر ''نظام'' کو چلانے کے لئے مجھے لکھنے والوں سے رابطہ پیدا کرنا چاہیے تھا۔ تو اب مجھے پتہ چل رہا تھا کہ حلقہ ارباب ذوق کیا چیز ہے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا کیا رنگ ہے۔

سچی بات ہے شروع میں تو مجھے انجمن ترقی پسند مصنفین ہی میں کشش محسوس ہوئی تھی۔ حلقہ کی محفل تو سوئی سوئی لگتی تھی۔ انجمن کے جلسوں میں بہت گرما گرمی ہوتی تھی۔ رنگ رنگ کے لوگ اور سخت گرما گرمی بحث۔ میں نے اپنا افسانہ بھی پہلے پہل یہیں پڑھا تھا۔ کہہ لیجئے کہ پہلے مجھے انجمن ہی نے گھاس ڈالی تھی۔ حلقہ میں تو مہینوں بعد مجھے اپنا افسانہ سنانے کا موقعہ میسر آیا۔ کتنے لکھنے والوں کو خاص طور پر اپنے ہمعصروں کو یہیں سے جانا اور پہچانا۔

عسکری صاحب ایک روز کہنے لگے کہ "یار ایک عجب نوجوان ہے۔ میں مال روڈ سے کسی وقت بھی گذروں وہ کتابیں بغل میں دابے کسی طرف سے آن پہنچتا ہے اور پھر عالمانہ انداز میں ادب پر گفتگو شروع کر دیتا ہے۔"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ پوچھا "کیا حلیہ ہے اس کا۔"

"عینک لگاتا ہے۔ کچھ گول مٹول سا ہے۔ بغل میں کتابیں ہوتی ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے اعتماد سے کہا "وہ گورنمنٹ کالج کا ایک طالب علم ہے مظفر علی سید۔"

"یار بہت عالمانہ گفتگو کرتا ہے۔"

مظفر کو سب سے پہلے میں نے انجمن کے جلسہ میں دیکھا تھا۔ اس اعتبار سے کہ میں نے جو وہاں افسانہ "استاد" سنایا تھا اس پر سب سے بڑھ چڑھ کر اسی نے اعتراض کیے تھے۔ اس مجمع میں برابر برابر دو چہرے عینکوں والے مجھے نظر آ رہے تھے۔ اور دونوں اس افسانے پر رواں تھے۔ چونکہ دونوں ہی عینکوں والے چہرے تھے اس لیے مجھے ان میں فرق کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ایک عینک والا چہرہ ابن انشاء کا تھا۔ دوسرا مظفر علی سید کا۔

جب میں افسانہ پڑھ کر نکلا تو مشاعرے کے دو نامور شاعروں نے جو اس جلسہ سے نکل رہے تھے، مجھے روکا "میاں سنو۔"

میں ٹھٹھک گیا۔

"یہ تم نے زبان کہاں کی لکھی تھی۔ کہیں تم بلند شہر کی طرف کے تو نہیں ہو۔"

یہ مولانا ماہر القادری تھے۔ ان کے ساتھ صابر دہلوی تھے۔

"جی ادھر ہی کا ہوں۔"

"کس جگہ کے۔"

"ڈبائی۔"

''اچھا اچھا' مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا۔ تمہارا لہجہ چغلی کھا رہا تھا۔''

ہماری ڈبائی کی ایک نواحی بستی تھی قادری باغ۔ اسے ہم لوٹ ڈبائی کہا کرتے تھے۔ سٹیشن جاتے ہوئے رستے میں آتی تھی۔ ماہر القادری وہیں کے رہنے والے تھے۔ اگست کے آس پاس کے دنوں میں میرٹھ میں بیٹھے بیٹھے میں نے سنا کہ آس پاس کی بستیوں کے جاٹوں نے مل کر قادری باغ پر ہلہ بول دیا۔ مگر ماہر القادری نے ایک پر جوش نظم پڑھ کر مسلمانوں میں مقابلہ کا جوش پیدا کر دیا۔ ہمت سے لڑے۔ جاٹوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مگر لڑائی ختم تو نہیں ہوئی تھی۔ حملہ پھر ہوا۔ اور جاٹ ہاتھیوں پر چڑھ کر آئے۔ ادھر تیاری تو بہت تھی۔ مگر اب وہاں انہیں جوش دلانے کے لیے ماہر القادری نہیں تھے۔ وہ پاکستان جا چکے تھے۔ قادری باغ والوں نے مقابلہ کی تیاری کی تھی۔ اور ایک دیسی قسم کی توپ بنائی تھی۔ مگر وہ پورس کا ہاتھی ثابت ہوئی۔ کچھ عجب طریقہ سے انہوں نے اسے فٹ کیا اور چلایا کہ جاٹوں کو بھوننے کی بجائے اس نے قادری باغ والوں ہی کو بھون ڈالا۔

خیر میں ذکر مظفر علی سید کا کر رہا تھا۔ اس نے بھی پہلا سوال افسانے کی زبان کے حوالے سے اٹھایا تھا۔ مجھے اس وقت کیا پتہ تھا کہ ہمعصر ادب میں جو زبان چالو ہے میں اس سے انحراف کر رہا ہوں اور یہ کہ یہ انحراف آگے چل کر مجھے بہت رسوا کرے گا۔ مظفر نے جلسہ میں اس زبان اور اس انداز بیان پر جانے کیا کیا کہا۔ مگر شاید یہی چیز میرے اور اس کے درمیان ربط وضبط کا بہانہ بن گئی۔ مال روڈ پر چلتے چلتے ادبدا کر اس سے مڈھ بھیڑ ہوتی۔ مگر مال روڈ پر کتنی باتیں ہو سکتی تھیں۔ سو کسی ریستواں کا رخ کیا جاتا۔ اصل میں اس زمانے میں مال روڈ اچھی خاصی سیر گاہ تھی۔ چلتے چلتے کتنے ادیبوں دانشوروں سے مڈھ بھیڑ ہو جاتی۔ اور اس راہ پر ریستواں بھی تو بہت تھے۔ اور جس ریستوراں میں قدم رکھو وہاں ادیبوں کی یا ادیبوں سے ملتی جلتی مخلوق کی کوئی ٹولی براجمان نظر آتی۔ خیر ان ریستورانوں کا حال تو میں آگے چل کر سناؤں گا۔ آخر میں نے ساری عمر ٹی ہاؤس ہی میں تو صرف نہیں کی ہے۔ ناصر کاظمی کے طفیل میٹرو ہوٹل سے لے کر بھاٹی دروازے کے آس پاس سڑک کنارے بیٹھے چائے والوں کی دکانوں تک ہر مرتبہ اور ہر رنگ کے ہوٹل اور چائے خانے کا ذائقہ چکھا ہے۔ لیکن اس وقت اس زمانے کے حوالے سے ایک ریستوراں تصور میں گھوم رہا ہے۔ کیفے اورینٹ۔ پاکستانی ادب کے سوال پر عسکری صاحب اور ترقی پسندوں میں کیا معرکہ آرائی ہوئی' یہ تو پاکستانی ادب کے طالب علم کو معلوم ہونا ہی چاہیے۔ لیکن یہ شاید کسی کسی ہی کو پتہ ہو کہ کیفے اورینٹ نے اس آگ کو بھڑکانے میں کیا کام دکھایا۔

میں ابھی ذکر کر رہا تھا کہ عسکری صاحب ان دنوں زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ صبح گھنٹے دو گھنٹے ''مادام بواری'' کے کچھ صفحے ترجمہ کیے۔ اس کے بعد وہی پاؤں کا چکر کبس بر میں اچکن ڈال' گلے میں مفلر لپیٹ نکل کھڑے ہوئے۔ گورنمنٹ کالج ان کا پہلا پڑاؤ

تھا۔ یہاں آفتاب صاحب ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب ابھی آفتاب صاحب افسری سے اور ڈاکٹر اجمل کوٹ پتلون سے کوسوں دور تھے۔ اجمل صاحب چوڑے گھیر والی شلوار اور شیروانی میں ملبوس نظر آتے اور آفتاب صاحب سائیکل پر ٹخ ٹخ کرتے باغبانپورے سے گورنمنٹ کالج پہنچتے۔ یہاں سے نکل کر عسکری صاحب کا رخ ریڈیو سٹیشن کی طرف ہوتا جہاں ان دنوں غلام عباس موجود تھے۔ غلام عباس سے تو دلی ہی سے گاڑھی چھنتی چلی آ رہی تھی۔ یہاں آ کر حفیظ ہوشیار پوری سے بھی ربط وضبط ہو گیا۔ اور ہاں بیچ میں ایک پڑاؤ اور بھی تھا۔ کیفے اورینٹ۔

عسکری صاحب کو ان دنوں چائے خانوں میں بھی بیٹھنے کا اچھا خاصا چسکا تھا۔ چونکہ ابھی اس شہر کا کوئی ہوٹل کوئی ریستوراں ایئر کنڈیشنڈ نہیں ہوا تھا اس لئے انہیں کسی ریستوراں میں بیٹھنے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ کرشن نگر بازار کی گڑ کی چائے والی دکانوں سے لے کر لورینگ تک کسی وقت کہیں بھی پسر جاتے مگر رفتہ رفتہ کیفے اورینٹ سے زیادہ مانوس ہو گئے۔ بعد میں تو خیر صحافیوں نے چائے کا آرڈر دیئے بغیر گھنٹوں کے حساب سے بیٹھ بیٹھ کر اس ریستوراں کا حال پتلا کر دیا تھا۔ مگر شروع میں اس کا نقشہ بہت آباد تھا۔ اور کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی ہرے بھرے بدن اور گورے چہرے والی اینگلو انڈین لڑکی نے اس نقشہ کو ایک اور ہی جہت عطا کر دی تھی۔ شاید ایک یہ وجہ بھی تھی کہ ان دنوں ادیب یہاں بالعموم بیٹھے نظر آتے تھے۔ چونکہ ان دنوں میرا وہاں کم کم گزر ہوتا تھا اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ عسکری صاحب وہاں کاؤنٹر سے کتنی دور یا کتنے قریب بیٹھتے تھے۔ اور علی سردار جعفری جو ان دنوں لاہور ہی میں تھے کاؤنٹر کے کس رخ بیٹھتے تھے۔ ویسے بھی سوال تو عسکری صاحب کے مضمون کے بعد قابل توجہ بنا کہ اورینٹ میں کون ادیب اس کاؤنٹر سے جسے جلوہ گہہ ناز کہنا چاہیے کتنا قریب کتنے فاصلہ پر اور کس زاویے سے بیٹھتا ہے۔

اصل میں عسکری صاحب جب سے پاکستان آئے تھے خاموش چلے آ رہے تھے۔ خود بہت چلتے تھے مگر قلم بس ''مادام بواری'' کے ترجمے اور ریڈیائی تقریروں کی حد تک چلتا تھا۔ ''جھلکیاں'' موقوف تھیں کہ ساقی فسادات اور ہجرت کی لپیٹ میں آ کر معطل ہو گیا تھا۔ باقی ادبی رسالوں میں سے کسی سے ان کی ذہنی مفاہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ خیر تو 1948ء شروع ہو چکا تھا اور عسکری صاحب ہنوز خاموش تھے۔ مگر آخر کب تک خاموش رہ سکتے تھے۔ اور ایسے وقت میں جب ادبی رسالوں میں تقسیم پر اتنا کچھ لکھا جا رہا تھا۔ میں انہیں مستقل اکسا رہا تھا کہ کسی طرح وہ کچھ ''نظام'' کے لئے لکھیں۔ تو اس پرچہ میں تھوڑی گرمی پیدا ہو۔

میں گرمی کے سامان کی توقع کس سے کر رہا ہوں۔ اور وہ آئی کہاں سے۔ دور پار کے شہر رانچی سے۔ وہاں سہیل عظیم آبادی بیٹھے تھے۔ منجملہ اور ممتاز ادیبوں کے ایک خط میں نے انہیں بھی لکھا تھا اور ''نظام'' میں لکھنے کی گزارش کی تھی۔ ان کی طرف سے جواب آیا

کہ ''نظام'' کی پالیسی پہلے ترقی پسندانہ تھی۔ اب اس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے۔ میں اس میں کیسے لکھ سکتا ہوں۔ میں نے اس بزرگ کا یہ خط ''نظام'' میں نقل کیا اور بصد ادب کچھ گزارشات کیں۔ سہیل صاحب نے بھنا کر ایک طویل خط لکھا۔ خط تو کیا خط کی صورت میں ایک مقالہ تھا جس میں انہوں نے اپنے ترقی پسندانہ نقطہ نظر سے پاکستان کے قیام اور قائداعظم کے سیاسی کردار کے بارے میں اتنا گرما کر اظہار کیا تھا کہ وہ خط میرے لیے اچھا خاصا سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی مثال بن گیا۔ آخر میں لکھا تھا کہ ''اگر آپ پسند کریں تو اس خط کو بھی شائع کر دیں۔'' ساتھ میں ٹکڑا لگایا۔ ''گرچہ یہ یقین ہے کہ آپ اسے شائع نہ کر سکیں گے۔'' کیوں اس لیے کہ پاکستان میں اخباروں رسالوں کو آزادی اظہار میسر نہیں ہے۔

ویسے تو میرا دل بھی دھکڑ پکڑ کر رہا تھا کہ اس تحریر کی اشاعت پرچے ہی کو نہ لے بیٹھے مگر اس بزرگ کا طعنہ مجھے کھا گیا۔ میں نے ہمت کر کے خط بغیر کسی قطع و برید کے چھاپ ڈالا۔

پرچے میں گرمی تو پھر پیدا ہونی ہی تھی۔ مگر ہوا یہ کہ جو خط جو مضمون موصول ہوا وہ کسی نہ کسی رنگ سہیل عظیم آبادی کے موقف کی تائید کرتا نظر آیا۔ سب سے پہلا خط میرزا ادیب کا موصول ہوا تھا۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ ریاست سے وفاداری کیا چیز ہوتی ہے۔ ''ادیب انسانیت کا پرستار ہے اس کا وطن ساری دنیا ہے۔ وہ رنگ و نسل اور جغرافیائی امتیازات کی سطح سے بہت بلند ہے۔ معاف کیجئے جس قسم کی وفاداری کا آپ اظہار کر رہے ہیں وہ ادب کے لئے اور ادب کی نشوونما کے لیے زہر ہے۔''

اب عسکری صاحب نے کسمسانا شروع کیا۔ آخر کب تک منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہتے۔ ترقی پسندوں کے قلم تو رواں تھے۔ تو عسکری صاحب نے آخر کو جھرجھری لی۔ چل مرے خامے بسم اللہ۔ مضمون لکھ کر میرے حوالے کیا کہ تم مضمون مانگ رہے تھے۔ یہ لو۔ میری تو عید ہوگئی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ بحث گویا اب شروع ہوگی۔ پاکستان آنے کے بعد عسکری صاحب کا یہ پہلا مضمون تھا۔ اس کی اشاعت نے وہ ردعمل پیدا کیا جس کی میں آس لگائے بیٹھا تھا۔ ''نظام'' میں صحیح معنوں میں اب گرمی پیدا ہوئی۔ 1948ء بھی تو اپنے جاڑے گزار کر گرمی کے موسم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اپریل کے دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ مئی سر پر تھا۔ اس مضمون میں تقسیم کے بارے میں ترقی پسند ادیبوں کے اسوقت کے رویے پر بحث کی گئی تھی۔ لڑائی کے لیے تو یہ بات ہی کافی تھی۔ مگر جس چیز نے ستم ڈھایا وہ اس مضمون میں استعمال ہونے والے دو بریکٹ تھے۔ پہلا بریکٹ یوں تھا کہ ادیبوں کے عمومی رویے پر بات کرتے کرتے عسکری صاحب نے لکھا ''یہ اردو کے ادیب لوگ۔'' اس کے آگے بریکٹ میں یہ ٹکڑا (کپلنگ کے ''بندر لوگ'' کے وزن پر)۔ دوسرا بریکٹ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ علی سردار جعفری کے بارے میں لکھا۔ اور یہ علی سردار جعفری صاحب۔

آگے بریکٹ میں یہ ٹکڑا (جوان دنوں کیفے اورینٹ میں کاؤنٹر کی طرف منہ کیے بیٹھے رہتے تھے)

ایک پاک باطن پاک نگاہ انقلابی کے کردار پر ایسا ناروا حملہ۔ بس جواب میں تلواریں نکل آئیں۔ سب سے پہلے عبداللہ ملک کے نیام سے تلوار نکلی۔ اس ہفتے جب میں انجمن کے جلسہ میں پہنچا تو عبداللہ ملک لال پیلے ہو رہے تھے۔ مضمون پڑھ چکے تھے۔ اور باری علیگ جو جلسہ کے صدر تھے انہیں سمجھا رہے تھے کہ آپ نے جو ذاتی حملے کیے ہیں وہ آپ مضمون سے خارج کر دیں تو مناسب ہوگا۔ عبداللہ ملک مزید لال پیلے ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ نے وہ مضمون پڑھا نہیں ہے کہ وہاں جعفری کے بارے میں کیا لکھا ہوا ہے۔ مجھے عسکری کہیں مل جائے تو میں اس کا گریبان پکڑ لوں۔ باری صاحب نے پھر انہیں ٹوکا اور انہیں ٹھنڈا کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔

کسی نے بپھرے لہجہ میں سوال کیا "آخر یہ مضمون چھپا کہاں ہے۔"

جلسہ میں مجمع بہت تھا۔ سب نشستیں پر تھیں۔ کچھ لوگ پیچھے کھڑے تھے۔ انہیں کے بیچ میں بھی کھڑا تھا۔ اس پر مطمئن کہ مجھے کون جانتا ہے۔ عبداللہ ملک نے اچانک خشمگیں نظروں سے مجھے تاڑا۔ اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "چھاپنے والا وہ کھڑا ہے۔ ہفتہ وار "نظام" میں یہ مضمون چھپا ہے۔"

ایک دم سے بہت سی غصیلی نظریں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ باری صاحب نے پوچھا "کیوں جناب' یہ مضمون آپ نے شائع کیا ہے۔"

اس براہ راست باز پرس پہ میں سٹپٹا گیا۔ اسی سٹپٹاہٹ میں میں نے یوں جواب دیا کہ "آپ یہ مضمون مجھے دلوا دیں۔ یہ بھی نظام میں چھپ جائے گا۔"

باری صاحب عبداللہ ملک کی طرف متوجہ ہوئے "ملک صاحب' یہ تو مناسب بات ہے۔"

عبداللہ ملک نے گرما کر کہا "مگر یہ مضمون اسی طرح چھپے گا' اس میں سے کوئی فقرہ قلمزد نہیں کیا جائے گا۔"

میں نے برسر محفل وعدہ کیا کہ مضمون جوں کا توں چھپے گا۔ کوئی فقرہ کوئی نقطہ قلمزد نہیں ہوگا۔

لیجیے مجھے عبداللہ ملک کا مضمون مل گیا۔ میں نے خوشی خوشی اسے جیب میں سنگوایا۔ پھر وہی اندھے والی بات۔ وہ کیا چاہے دو آنکھیں۔ یہی تو میں چاہتا تھا کہ کسی طرح پرچے میں کوئی بحث شروع ہو۔ رسالہ نظروں میں آئے اور میری ادارت چمکے۔

اگلے دن دفتر پہنچتے ہی میں نے مضمون کاتب کے حوالے کیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد عبداللہ آن دھمکے "ذرا مجھے مضمون تو دکھاؤ۔ میں اس میں تھوڑی ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔"

''وہ تو کتابت ہو چکا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ دو ایک ہی فقرے ہیں۔ میں نے سوچا ہے میں انہیں قلمزد کر دوں۔''

عبداللہ ملک نے وہ فقرے جن پر باری صاحب نے انگشت نمائی کی تھی قلمزد کر دیے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ وہ کیا فقرے تھے۔ بہر حال قصہ یوں تھا کہ عسکری صاحب نے پاکستان سے ادیبوں کی وفاداری کا سوال اٹھایا تھا۔ عبداللہ ملک نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا کہ وفاداری کس سے، ریاست سے یا حکومت سے۔ لیجیے بحث چل پڑی۔ بس اگلے ہی ہفتے ممتاز شیریں کا ایک مراسلہ موصول ہوا۔ پھر محمود ہاشمی کا۔ اور ترقی پسندوں کے مراسلے تو آ ہی رہے تھے۔ میں خوش تھا۔

پھر جب ''ساقی'' نکل آیا تو عسکری صاحب اپنی یہ بحث وہاں لے گئے جو پاکستان سے وفاداری کے سوال سے پاکستانی ادب کے سوال پر گئی۔ پھر عسکری صاحب نے ایک اور زقند لگائی اور اسلامی ادب کا سوال کھڑا کر دیا۔ خیر عسکری صاحب کی زقندوں کا کیا پوچھو ہو۔ زقندیں تو انہوں نے ایسی ایسی بھریں کہ ایک وقت میں سوویت روس کی پالیسیوں کے سب سے بڑے وکیل وہی نظر آنے لگے۔ مگر اک ذرا ٹھہریے ابھی تو میں اس زمانے کو اپنے تصور میں لا رہا ہوں اور اس گرما گرمی، اس ہنگامہ آرائی، اس جوش و خروش کو جو اس زمانے کا لازمہ تھی۔

مشتے نمونہ از خروارے۔ ذرا انجمن کے ایک جلسہ کا اور بیان ہو جائے۔ جلسہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ لوگ رفتہ رفتہ آ رہے تھے۔ مگر منٹو صاحب پہلے سے آئے بیٹھے تھے۔ منٹو صاحب کو میں نے اس سے پہلے کبھی نہ انجمن کے جلسہ میں دیکھا تھا نہ حلقہ کے جلسہ میں۔ جانے کس رو میں یہاں آ گئے تھے۔ پروگرام میں ان کا افسانہ تو تھا نہیں۔ یا شاید ہو۔ اگر پروگرام میں ان کا افسانہ تھا تو وہ بہر حال پڑھا نہیں گیا۔ منٹو صاحب نے محفل ہی کو تہہ و بالا کر دیا۔ جلسہ کی کاروائی کا آغاز ہوا۔ صدارت کے لیے حمید اختر نے وجیہہ الدین احمد کے نام کا اعلان کیا۔ وجیہہ الدین احمد اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ کرسی صدارت پر بیٹھے ہی تھے کہ منٹو صاحب نے حمید اختر سے پوچھا ''جناب کی تعریف۔''

حمید اختر بیچارے سٹپٹا گئے۔ بولے ''وجیہہ الدین احمد ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد کے صاحبزادے۔''

''مولانا صلاح الدین احمد تو خیر ہوئے۔'' منٹو صاحب بولے ''مگر یہ کون صاحب ہیں۔''

وجیہہ الدین احمد کی سمجھ میں پہلے تو کچھ نہ آیا کہ کیا کہیں۔ آخر جوابی حملہ کیا۔ بولے ''اور آپ کون صاحب ہیں۔''

''میں کون صاحب ہوں۔ تم منٹو کو نہیں جانتے۔''

پیچھے کی صفوں میں اچانک کھلبلی ہوئی۔ ضیا جالندھری بیچ میں سے کھڑے ہوئے اور منٹو صاحب کے رویے پر احتجاج کرنے لگے۔ منٹو صاحب بھی اب کھڑے ہو گئے تھے۔

''پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی''

مجھے بس آگے اتنا یاد ہے کہ اسی ہنگامے میں منٹو صاحب جلسہ سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ جلسہ کے بعد مجھے بھی منٹو صاحب ہی کی طرف جانا تھا۔ قصہ یوں تھا کہ عسکری صاحب کا جی تاثیر صاحب سے اب بھر چکا تھا۔ اب وہ روز شام کو منٹو صاحب کی طرف جایا کرتے تھے۔ تو مجھے اپنے پروگرام کے مطابق وہاں پہنچ کر عسکری صاحب سے ملنا تھا اور پھر کہیں آگے جانا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ منٹو صاحب خوش بیٹھے ہیں اور عسکری صاحب کی بھی باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔

منٹو صاحب نے مجھ سے پوچھا ''میرے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا۔''

میں نے تھوڑا آنکھوں دیکھا حال سنایا۔ منٹو صاحب عسکری صاحب سے مخاطب ہوئے ''عسکری صاحب میں نے ٹھیک کیا نا۔)

عسکری صاحب نے تائید میں سر ہلایا۔ آج کل عسکری صاحب کی منٹو صاحب سے گاڑھی چھن رہی تھی۔ منٹو صاحب سے عسکری صاحب کی پہلی ملاقات دلی میں ہوئی تھی۔ مگر کیا عجب ملاقات تھی۔ دریا گنج کے تانگہ کے اڈے پر ایک سواری والا تانگہ تیار کھڑا تھا۔ تانگہ والا آواز لگا رہا تھا۔ ''بارہ کھمبے کے لیے ایک سواری۔''

بارہ کھمبے سے تھوڑا آگے ہی تو ریڈیو سٹیشن تھا اور ریڈیو جانے والے ادیبوں کا طریقہ یہی تھا کہ دریا گنج سے بیٹھے اور بارہ کھمبے اتر گئے۔ وہاں سے پیدل ریڈیو کی طرف۔ تو عسکری صاحب اس تانگہ میں بیٹھ گئے۔ دیکھا کہ سواریوں میں ایک سواری منٹو صاحب بھی ہیں۔ سواریوں کے بیچ ٹھسا ٹھس بیٹھے ہوئے انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور نام بتایا۔

منٹو صاحب نے غور سے عسکری صاحب کو دیکھا اور بولے ''اچھا تم عسکری ہو۔'' ویسے عسکری صاحب ان دنوں واقعی غور سے دیکھنے کی چیز تھے۔ جب میں نے پہلے پہل انہیں دیکھا تھا تو بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ یہ عسکری صاحب ہیں۔ تو منٹو صاحب نے غور سے عسکری صاحب کو دیکھا ''اچھا تو تم عسکری ہو۔'' پھر رک کر بولے ''یار' کرشن تمہاری بہت تعریف کرتا تھا۔'' رکے' پھر بولے ''مگر کرشن کی بات کا کوئی اعتبار نہیں' جھوٹ بہت بولتا ہے۔''

کرشن چندر کو تو اس زمانے میں عسکری صاحب کی تعریف کرنی ہی چاہیے تھی۔ عسکری صاحب نے بھی تو کرشن چندر پر ایسا مضمون باندھا تھا کہ ''زندگی کے دوراہے پر'' والی کہانی میں جو رہٹ کی روں روں سنائی دیتی ہے اس میں انہیں سیاروں کے نغمہ کی گونج سنائی

دی تھی۔ مگر اب زمانہ اور تھا۔ اب کرشن چندر عسکری صاحب سے بدکے ہوئے تھے اور عسکری صاحب کرشن چندر سے فرنٹ ہو چکے تھے۔ اب ان کی منٹو صاحب سے گاڑھی چھن رہی تھی۔ عسکری صاحب کا معاملہ بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ گھڑی میں رن میں گھڑی میں بن میں۔ دیکھنے میں اکل کھرے۔ لیکن جس سے دل مل جاتا تھا فوراً ہی اس سے گھل مل بھی جاتے تھے۔ لیکن جب بھڑکتے تھے تو پھر اچانک ہی ایسے بن جاتے تھے جیسے کبھی اس شخص سے ملے ہی نہیں تھے۔ اللہ ہی جانے کیا دیکھ کر آدمی پر ریجھتے اور کونسی ادا سے بھڑک کر متنفر ہو جاتے تھے۔ ایسے کہ پھر اس سے بات کرنے' اس کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں ہوتے تھے۔ میرے ساتھ بھی بس یہ ہوا کہ ایک ملاقات ہوئی اور بس فوراً ہی شیر و شکر ہو گئے۔

عسکری صاحب سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات ایک ٹال میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تو لکڑیاں چرنے کی آواز کانوں میں آ رہی ہے۔ باہر احاطہ میں لکڑیاں چیری جا رہی تھیں' میں اندر بیٹھا عسکری صاحب کو کرشن چندر کا قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

باقاعدہ ملاقات میں نے یہ سوچ کر کہا کہ اس سے پہلے جو ملاقات تھی وہ بہت بے قاعدہ بھی۔ بہت دیر تک تو میں اسی شک میں رہا کہ جس شخص سے میں مل رہا ہوں وہ محمد حسن عسکری ہے بھی یا نہیں۔ ہوا یوں کہ میرٹھ میں ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام ہوا۔ کتنے نامی گرامی شاعر اس میں آئے ہوئے تھے۔ مگر میری دلچسپی اس مشاعرے میں فراق صاحب کے واسطے سے تھی۔ سو دوڑا ہوا وہاں گیا۔ مگر مشاعرے کی پچھلی صفوں میں بس کھڑے ہونے کی جگہ مل سکی۔ اتنی دور سے انہیں دیکھ کر دل کو تسکین نہیں ہوئی۔ مشاعرے سے مایوس واپس آیا۔ مگر پھر ایک عجب خیال آیا۔ یہ کہ اگر فراق صاحب کو ہم اپنے کالج میں جتن کر کے لے آئیں تو قریب سے دیکھنے اور باتیں کرنے کی خواہش پوری ہو سکتی ہے لیکن کیسے لے کے آئیں۔ تقاریب کا اہتمام تو اردو سوسائٹی کیا کرتی تھی جس سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ ایسے میں مجھے اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کا دھیان آیا۔ فرسٹ سکینڈ ائیر کے وقت سے ایک ہی کلاس فیلو سے میری یاد اللہ چلی آتی تھی۔ شفیق احمد سے جو اس وقت انگریزی میں ایم اے کر رہے تھے۔ اور مجھے معلوم تھا کہ اردو سوسائٹی والوں سے ان کی خوب یاد اللہ ہے۔ میں صبح ہی صبح ان کے پاس گیا اور اپنی اس خواہش کا ذکر کیا۔ فراق کی شاعری سے انہیں بھی دلچسپی چلی آتی تھی۔ بس قارورہ مل گیا۔ چھوڑیئے کہ اس دن ہم دونوں نے کتنی بھاگ دوڑ کی۔ کس طرح اردو سوسائٹی کو اس فوری تقریب کے لئے آمادہ کیا۔

کس طرح فراق صاحب کی خدمت حاضری دے کر نئے ادب پر لیکچر کی درخواست کی۔ کس طرح انہوں نے ہمارا امتحان لیا کہ

ہم نئے ادب کے معاملہ میں کتنے پانی میں ہیں۔ بس یہ سن لیجئے کہ جب ہم نے فراق صاحب کو قائل کر لیا اور جب ہم انہیں لے کر آ رہے تھے تو ان کے ہمراہ تانگہ میں ایک صاحب اور بھی بیٹھ لیے۔ بر میں نیلی گرم اچکن۔ ٹانگوں میں اٹنگا پتلی موری والا پائجامہ۔ ہم نے ان صاحب پر کوئی توجہ نہیں دی۔ شخصیت میں کوئی کشش نظر آتی تو سوچتے کہ موصوف کیا بیچتے ہیں۔ مگر جب فراق صاحب نے تقریر کرتے کرتے نئے افسانے کا ذکر کیا اور ان موصوف کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ جو یہاں محمد حسن عسکری بیٹھے ہیں تو ایک دم سے ہم سب دوست چونکے۔ برابر میں بیٹھے ہوئے اس شخص کو ایک تعجب اور شک کے ساتھ سر سے پیر تک دیکھا۔ پھر آپس میں نظروں نظروں میں تبادلہ خیال کیا۔ آخر میں نے پوچھ ہی لیا ''آپ محمد حسن عسکری ہیں۔''

''جی''

پھر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ سعید بور نے یعنی سلیم احمد کے گروپ کا وہ نوجوان جسے ہم سعید بور کہتے تھے' میری طرف دیکھا۔ تامل کیا۔ پھر وضاحت کی خاطر سوال کیا ''حرامجادی والے عسکری۔''

وہی مختصر جواب ''جی۔'' اور پھر چپ۔

عسکری صاحب سے یہ تعارف تو ہبڑ دبڑ میں ہوا تھا۔ ہم فراق صاحب کی مدارات میں مصروف تھے۔ بیچ میں آ گئے عسکری صاحب۔ ان سے مفصل ملاقات آگے چل کر ہوئی۔ ویسے وہ ملاقات بھی بالکل غیر متوقع طور پر ہوئی۔ خیر نگر بازار کے موڑ پر ایک ٹال تھی۔ یہ سعید بور کے والد کی ٹال تھی۔ کالج کی چھٹیاں تھیں۔ سو سعید بور نے یہاں باقاعدہ بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے سائیکل پر گزرتے گزرتے سوچا کہ چلو سعید بور کو بھی جھانکتے چلیں۔ اندر قدم رکھا تو دیکھا کہ عسکری صاحب بیٹھے ہیں۔ مگر کس خوشی میں۔ یہ سعید بور نے بالا بالا عسکری صاحب سے کیسے رابطہ قائم کر لیا۔ اصل میں سعید بور عسکری صاحب کے بھائی محمد مثنیٰ کا کلاس فیلو تھا۔ بس اسی واسطے سے اس نے عسکری صاحب سے ملاقات کی اور اپنی ٹال کی شان دکھانے کے لیے یہاں لے آیا۔ بیچ میں ٹپک پڑا میں۔ تو صورت یہ تھی کہ باہر احاطہ میں لکڑیاں چیری جا رہی ہیں۔ اندر میں کرشن چندر کے افسانوں پر تقریر کر رہا تھا اور عسکری صاحب خاموش سن رہے تھے۔

آخر میں بولے ''ڈپٹی نذیر احمد کے ناول تو آپ نے پڑھے ہوں گے۔''

''جی پڑھے ہیں۔''

''جیسے ان کے یہاں زندہ کردار آتے ہیں مثلاً ظاہر دار بیگ۔ ایسا کوئی کردار کرشن چندر کے یہاں نظر آیا۔ اس طرح کا کوی چلتا

پھر تا کردار آپ کو یاد ہو تو بتائیے۔

میں سٹپٹا گیا۔

اٹھتے ہوئے میں نے کہا ''آپ اپنے گھر کا پتہ بتائیے۔ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔''

''نہیں میں خود آؤں گا۔ آپ اپنے گھر کا پتہ مجھے سمجھائیے۔''

میں نے گھر کا پتہ سمجھایا۔ دوسرے ہی دن دن ڈھلے آن موجود ہوئے۔ اور پھر آتے ہی چلے گئے۔ روز طے شدہ وقت پر سہ پہر کو آنا۔ تھوڑی دیر بیٹھنا۔ پھر تقاضا کرنا ''اٹھو ٹہلنے چلتے ہیں۔''

بس ایک سہ پہر ناغہ ہوا۔ مگر اس ناغے کی اطلاع دینے خود آئے۔ وقت مقررہ پر آئے۔ چار منٹ بیٹھے۔ پھر کہا کہ آج ملاقات نہیں ہو سکتی۔ میں بس بتانے آیا ہوں۔ چل رہا ہوں۔ اصل میں صبح سویرے والد کا انتقال ہو گیا۔ تدفین تو ہو گئی ہے۔ مگر تعزیت کرنے والے آ رہے ہیں۔ اس لیے مجھے گھر پر رہنا چاہیے۔''

سو بس کھڑے کھڑے آئے۔ اور واپس ہو لیے۔

والد گرامی کا بیٹے کے متعلق ایک ہی ردعمل عسکری صاحب کی زبانی مجھ تک پہنچ سکا۔ اصل میں عسکری صاحب میرٹھ میں ان دنوں بیروزگاری کے دن گزار رہے تھے۔ دن بھر پلنگ پہ لیٹے کتاب پڑھتے رہتے۔ شام کو ٹہلتے ٹہلتے میری طرف آ جاتے۔ خاندان کے ایک بزرگ نے یہ نقشہ دیکھا تو عسکری صاحب کے والد صاحب سے بولے ''بھائی' یہ تمہارا بیٹا دن بھر پڑا چارپائی کے بان توڑتا رہتا ہے۔ آخر زندگی ایسے کیسے گزرے گی۔ اسے کسی ہلہ سے لگنا چاہیے۔''

والد صاحب نے افسردہ لہجہ میں کہا ''اصل میں اس لڑکے کو لکھنے لکھانے کی لت پڑ گئی ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں پڑا رہتا ہے۔''

اس بزرگ کو فوراً یاد آیا کہ ان کے محلہ سے ایک پندرہ روزہ پرچہ ''چنچل'' نکلتا ہے جس میں لطیفے' چٹکلے' ایکٹرسوں کے سکینڈل' پہلوانوں کے دنگل کی خبریں اور ایسا بہت سا چٹپٹا مال پیش کیا جاتا تھا۔ کہنے لگے ''اچھا صاحبزادے کو یہ شوق ہے۔ کوئی بات نہیں۔ ''چنچل'' کا ایڈیٹر ہمارا برخوردار ہے۔ میں اس سے کہہ دوں گا۔ صاحبزادے اپنا مضمون وہاں بھیج دیا کریں۔''

والد صاحب نے بیٹے تک یہ پیغام پہنچایا۔ بیٹے نے بہت سعادتمندی سے جواب دیا ''جی' بہت اچھا۔''

عسکری صاحب نے پہلے مجھ کوڑھ مغز کو ایلیٹ کی شاعری پڑھا ڈالنے پر کمر باندھی۔ پھر کہا کہ ''تم فرنچ سیکھ لو۔''

میں نے کہا ''سکھا دو۔''

سو فرنچ سکھانی شروع کر دی۔ کرشن چندر کی مسلسل مدح سن کر مس مان کی ٹرائی لوجی پڑھنے کو دی۔ ''اسے پڑھو۔ پھر تمہیں پتہ چلے گا کہ افسانہ اور ناول کیا ہوتا ہے۔''

مگر یہ سلسلہ میرٹھ تک چلا۔ لاہور میں آ کر اس کی تجدید نہیں ہوئی۔ عسکری صاحب کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ ان تلوں میں اتنا ہی تیل ہے کہ بس افسانے میں کیلا کانٹی کر لیا کرے۔ ادھر یہ شوق وافر تھا کہ اپنے علم کے چراغ سے دوسرے چراغ روشن کیے جائیں۔ آگے چل کر انہوں نے سلیم احمد پر ریاض کیا۔ کس گرمجوشی سے اپنے علم سے اس کے سینے کو منور کرنے کی کوشش کی۔ ادھر اس عزیز نے بھی مرشد کا سارا علم اپنے اندر اتار لینے کی بہت سعی جمیل کی۔ پھر کیا ہوا۔ مگر یہ تو میں بہت آگے نکل گیا۔ میں ذکر یہ کر رہا تھا کہ عسکری صاحب کا طور یہ ٹھہرا تھا کہ روز دن ڈھلے آتے۔ پہلے فرنچ کا سبق پڑھاتے۔ پھر ہم ٹہلنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ شروع میں تو بس سڑکوں سڑکوں بھٹکتے پھرتے تھے۔ پھر پڑاؤ کرنے کے لیے ایک ٹھکانا میسر آ گیا۔ ہمارے استاد پروفیسر کرار حسین کی بیٹھک۔ کیا خوب جگہ تھی۔ خاکسار تحریک سے جو نوجوان بغاوت کرتا وہ اچھرہ لاہور سے بستر بوریا باندھتا اور یہاں آ کر ڈیرے ڈال دیتا۔ ادھر شہر کا ہر رنگ کا معزز چل کر یہاں آتا اور کرار صاحب کی گفتگو سے سیراب ہو کر جاتا۔ ہم جیسے طالب علموں کا بھی پھیرا لگتا رہتا۔ اب عسکری صاحب نے یہاں باقاعدگی سے روز شام کو آنا شروع کر دیا تھا۔

شروع میں میرا گمان یہ تھا کہ عسکری صاحب خالص ادب کے آدمی ہیں۔ مگر وہ تو ساتھ ساتھ میں مسلم لیگی بھی نکلے۔ اور ایسے ویسے مسلم لیگی۔ بس مت پوچھو۔ کرار صاحب کے یہاں ابھی تک صرف خاکساری نقطہ نظر سے یا رد خاکساری نقطہ نظر سے ملت اسلامیہ کے حالات کے تجزیے ہوتے تھے۔ اب یہاں مسلم لیگ کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

اعلان پاکستان کے بعد کے دنوں میں جب قریب و دور سے فسادات کی خبریں آ رہی تھیں اور ہر مسلمان سراسیمہ نظر آتا تھا عسکری صاحب کو دور کی سوجھی۔ تجویز پیش کی کہ میرٹھ میں ایک ہند اسلامی کلچرل کانفرنس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ پاکستان بننے کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے سیاسی جدوجہد کا باب بند ہو گیا۔ اب کلچرل سطح پر جدوجہد کر کے اپنے آپ کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

کرار صاحب نے اس تجویز پر صاد کیا اور وہ جو انہوں نے خاکسار تحریک سے ٹوٹ کر اپنی اسلامی انقلابی تحریک شروع کر رکھی تھی اس کی طرف سے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ لیجیے منصوبہ بندیاں شروع ہو گئیں۔ اور ایک روز عسکری صاحب نے جھرجھری لی اور دلی جا کر ان مسلمان رہنماؤں سے جو لوک سبھا کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے وہاں آئے ہوئے تھے ملنے کی ٹھانی۔ میں ان کے ہمرکاب تھا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس بہانے مولانا حسرت موہانی کو دیکھنے ان کی باتیں سننے کا موقع ملے گا۔ مگر وہ تو ابھی دلی پہنچے

ہی نہیں تھے۔ یوپی کے کئی رہنماؤں سے عسکری صاحب ملے۔ جس سے اس منصوبے کی بات کی اس نے عسکری صاحب کو حیرت سے دیکھا۔ تامل کیا' پھر سمجھایا کہ حالات بہت خراب ہیں۔ ایسے منصوبوں کے لیے وقت سازگار نہیں۔

عسکری صاحب ان رہنماؤں کو برا بھلا کہتے واپس آئے۔ لیکن شاید وہ رہنما ہی صحیح تھے۔ دیکھتے دیکھتے آسمان نے ایسا رنگ بدلا کہ سارا نقشہ ہی ابتر ہو گیا۔ دلی میں وہ تباہی آئی کہ مسلمانوں کے محلے اجڑنے لگے۔ پرانے قلعہ میں کیمپ لگنے لگے۔ میرٹھ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اسپیشل ٹرینیں چلنے لگیں۔

''کوئی آگے گیا باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں''

ہند اسلامی کلچرل کانفرنس کے منصوبے پہ اوس پڑ گئی۔ لوگوں کو جانوں کی پڑی ہوئی تھی۔ کہاں کی رباعی کہاں کی غزل اور کیسا ہند اسلامی کلچر چ مگر خیر

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے وہ یہاں آ کے دم ہوئے

پاکستان میں آ کر عسکری صاحب نے اس قبیل کے ارمان خوب پورے کیے۔ لاہور پہنچ کر وہ صرف چند مہینے چپ بیٹھے۔ پھر ایسے رواں ہوئے کہ اللہ دے اور بندے لے۔ خاموشی کے وہ چند مہینے بھی ایک طرح کی مجبوری تھے۔ کرتے کیا' کیسے قلم اٹھاتے۔ شہر میں ترقی پسند کوس لمن الملکی بجا رہے تھے۔ لاہور سے کراچی تک ان کا طوطی بول رہا تھا۔ ویسے بھی پورے برصغیر میں یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا۔ جو ترقی پسند نہیں بھی تھے وہ بھی کسی نہ کسی طور ان سے اثر قبول کر رہے تھے۔ اگر کوئی مخالف بھی تھا تو اس کی مجال تھی کہ ان کے مقابلہ میں چوں کر جائے۔

ہاں اس شہر میں ادب کا ایک کھونٹا اور بھی تھا۔ حلقہ ارباب ذوق۔ اتوار کی اتوار وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں اس کی نشست سجتی۔ مگر اس کا رنگ انجمن کی نشست سے کتنا مختلف ہوتا۔ انجمن کے جلسہ میں ہر پھر کر وہی بحث کہ ادب اور زندگی میں کیا رشتہ ہے۔ جلسہ کے ختم ہوتے ہوتے دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتا۔ دوٹوک فیصلہ کہ ادب زندگی ہے اور زندگی ادب ہے۔ اور خود زندگی کیا ہے۔ سماجی معاملات اور اپنے وقت کے سیاسی مسائل۔ جو ادیب ان سے آنکھ چراتا ہے وہ زندگی سے بھاگتا ہے۔ پس وہ فراری ادیب ہے۔ ادھر حلقہ میں جو سوال اٹھتے وہ طے ہونے ہی میں نہ آتے۔ نظم پڑھی جاتی تو سوال اٹھ کھڑا ہوتا کہ شاعری کیا ہوتی ہے۔ ڈرامہ پڑھا جاتا تو پوچھا جاتا کہ ڈرامہ ہوتا کیا ہے۔ اصغر بٹ یہاں ڈرامے کے ایکسپرٹ کے طور پر بیٹھے نظر آتے۔ فوراً بتانا شروع

کر دیتے کہ ڈرامہ کیا ہوتا ہے۔ کبھی یہ بحث شروع ہو جاتی کہ غزل کی تعریف کیا ہے۔ جتنی بحث ہوتی اتنا مسئلہ الجھتا جاتا۔ جلسہ ختم ہو جاتا اور مسئلہ جوں کا توں رہتا۔

اشخاص کا معاملہ یہ تھا کہ کوئی بحث میں رواں مگر قلم کا کوتاہ۔ کسی کا قلم چلتا ہے مگر بحث میں زبان لڑکھڑاتی ہے۔ انجم رومانی والا حال کہ شعر ٹھکا ہوا کہتے تھے' مگر فقرہ جب منہ سے نکالا نکلتے ہی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ یوسف ظفر اور شیر محمد اختر جب برابر برابر بیٹھتے تو شتر گربہ کی صورت پیدا ہو جاتی۔ یوسف ظفر آدمی مختصر' پستہ قد۔ شیر محمد اختر لمبے تڑنگے' چوڑے چکلے۔ پنجاب کے روایتی قدوقامت کی سچی مثال۔ اک ذرا ہکلاتے تھے۔ پھر بھی بحث میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ فرائڈ کے متوالے تھے۔ کسی بھی مسئلہ پر بحث ہوتی فرائڈ کو درمیان میں لے آتے اور تان اس پر توڑتے کہ ''س۔ س۔ سب' س۔ ب۔ سیکس ہے۔''

شیر محمد اختر نے ان دنوں بیڈن روڈ پر ایک دوست کے ساتھ مل کر کتابوں کی ایک ایسی دکان کھولی تھی جہاں صرف نفسیات کی کتابیں دستیاب تھیں۔ اس دوست کا نام بھی اتفاق سے اختر تھا۔ دکان کا نام رکھا گیا' اختر اور اختر ت حفیظ ہوشیار پوری کو ایسا موقع خدا دے۔ ہجو اور قطعہ تاریخ لکھنے کے لیے بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ دکان کو دیکھا اور فوراً رواں ہو گئے۔ ہجو کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے

ہے ان کا نام اختر اور اختر
یہ دو پاجی کتابیں بیچتے ہیں

تو یہ تھا ان دنوں حلقہ ارباب ذوق کا رنگ۔ یار لوگ سمجھتے ہیں حلقہ کی انجمن ترقی پسند مصنفین سے نظریاتی جنگ تھی۔ بعض ترقی پسند بھی یہی کہتے سنے گئے ہیں۔ بالکل غلط۔ حلقہ تو نظریاتی جنگ کا قائل ہی نہیں تھا۔ ترقی پسندوں کے خلاف ان دنوں جو ادیب صف آرا ہوئے دوسرا جوان کے خلاف میدان میں اترا وہ خود تحریک سے بچھڑ کر اب آمادہ بغاوت تھا۔ ''نظام'' میں جب عسکری صاحب کے مضمون پر بحث چلی تو مجھے بھی یہی گمان تھا کہ حلقہ کے ادیب ان کے موقف کی حمایت میں لکھیں گے۔ یہی سوچ کر میں نے ان سے رجوع کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ جو مکتوب جو مضمون موصول ہوتا وہ عبداللہ ملک کے موقف کی تائید کرتا نظر آتا۔ میں نے یہ سوچ کر حلقہ والوں سے رجوع کیا کہ یہ ترقی پسند تحریک سے الگ ایک مکتبہ فکر ہے۔ ان سے ترقی پسندوں کے موقف سے ہٹ کر بات کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

اس وقت حلقہ کی نمایاں شخصیتیں تو یہی تھیں۔ قیوم نظر' یوسف ظفر' مختار صدیقی میں نے سب سے پہلے قیوم نظر سے رجوع کیا۔ میں نے ان سے بڑے ادب سے گزارش کی جلسہ کے بعد انہیں گھیر لیا' عسکری صاحب کے مضمون پر جو بحث چل رہی ہے وہ آپ کی

نظر سے گزری۔"

"ہاں بالکل گزری۔"

"پھر آپ اس کے سلسلہ میں کوئی رائے ظاہر کرنا' کچھ لکھنا پسند کریں گے۔"

قیوم نظر نے ایک اونچا قہقہہ لگایا "چھوڑ وجی۔ کوئی کام کی بات کرو۔"

پھر میں نے یوسف ظفر سے رجوع کیا۔ جواب میں مسکرائے۔ "برادر یہ ادیب کا کام نہیں ہے۔"

جب میں نے مختار صدیقی سے یہ گذارش کی تو انہوں نے پہلے سر سے پیر تک مجھے غور سے دیکھا۔ پھر بولے' یہ تم کس دھندے میں پڑ گئے ہو۔"

اس مختصر جواب پر انہوں نے بس نہیں کی۔ انہوں نے مجھے ساتھ لیا۔ مال روڈ کے ایک ریستوراں میں جو بلیو ریستوراں کے نام سے نیا نیا کھلا تھا' جا کر چائے کا آرڈر دیا اور مجھے سمجھانا شروع کیا کہ ادیب کا منصب کیا ہے اور ادب کس قسم کا خلوص اور یکسوئی مانگتا ہے۔

مختار صدیقی کی اس شفقت کی ایک وجہ تھی۔ ابھی پچھلے مہینے میں نے حلقہ میں اپنا افسانہ سنایا تھا۔ یہ گویا حلقہ میں میری مہورت تھی۔ مختار صدیقی اس جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ اور اس افسانے پر سب سے بڑھ کر انہوں نے ہی مجھے داد دی تھی۔ تو اب مجھے وہ ایک ہونہار افسانہ نگار سمجھتے تھے۔ اور ایک مشفق کی حیثیت سے انہوں نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ اس نوخیز افسانہ نگار کو جو گمراہی کے رستے پہ چل پڑا ہے ادب کی سیدھی راہ دکھائی جائے۔

تو ذکر یہ تھا کہ عسکری صاحب پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگانے کے لیے تلے بیٹھے تھے۔ مگر انہیں کوئی ہمنوا نہیں مل رہا تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر تاثیر نمودار ہوئے۔ قاعدے سے تو اس ادبی محفل کے بعد جو ابھی پچھلے دنوں گورنمنٹ کالج میں ہوئی تھی عسکری صاحب کی تاثیر صاحب سے ٹھن جانی چاہیے تھی۔ بخاری صاحب جو ان دونوں کالج کے پرنسپل تھے صدارت کر رہے تھے۔ عسکری صاحب نے مقالہ پڑھا "مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی" اس محفل میں تاثیر صاحب بھی تھے۔ بخاری صاحب نے مقالہ کے بعد تاثیر صاحب کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ان نظروں نے تاثیر صاحب کے لیے تیلی کا کام کیا۔ پھڑکے اور دم کے دم میں زقندیں بھرنے لگے۔ مارکسیت کے جو خصوصی مطالعے کیے گئے تھے اس کا انہوں نے پورا دفتر کھول دیا۔ ایک ایک کتاب کا نام لیتے اور پوچھتے عسکری صاحب' یہ کتاب تو آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔ اور عسکری صاحب سادگی سے جواب دیتے کہ نہیں۔

عسکری صاحب کے یہاں ''جی'' کا استعمال تو پہلے بھی دیکھا تھا' آگے چل کر بھی بہت دیکھا۔ مگر اس سادگی سے ''نہیں'' کا استعمال میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ ''جی'' کے استعمال کی صورت یہ تھی کہ کوئی بحث کا دھنی انٹلکچوئل آ کر عسکری صاحب سے بھڑ جاتا تو عسکری صاحب بحث سے بچنے کا راستہ یہ نکالتے کہ کسی بات پر اختلاف ہی نہیں کر رہے۔ اختلاف کریں تو بحث چلے۔ مگر یہاں ہر بات ہر بیان پہ کہنا کہ جی۔ جی ہاں۔ مگر انہوں نے تاثیر صاحب کے ہر سوال کا جواب نہیں سے دیا۔ فلاں کتاب پڑھی ہے۔ نہیں۔ اور فلاں کتاب تو پڑھی ہوگی۔ نہیں۔

تاثیر صاحب دیر تک یہی سمجھتے رہے کہ انہوں نے عسکری صاحب کو پچھاڑ لیا ہے۔ مگر جب آخر تک ہر سوال کا جواب ایک مختصر نہیں میں آیا تو پھر شاید دل میں سوچا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

تو قاعدے سے تو اس محفل کے بعد ہی بیلوں کی لڑائی شروع ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر قدرت کو شاید ہی منظور تھا کہ پہلے گاڑھی چھنے' پھر لڑائی ٹھنے۔ تاثیر صاحب ترقی پسند تحریک سے بدکے ہوئے تھے۔ ان کے یہاں پاکستانیت زور مار رہی تھی۔ اسی زور میں وہ ابھی پچھلے دنوں ہونے والی ترقی پسند کانفرنس میں اپنے اختلاف کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ عسکری صاحب کا اس تحریک سے پہلے ہی بیر چلا آ رہا تھا۔ پاکستان کے قیام نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ عسکری صاحب کے لیے سب سے پہلے ادب مقدم تھا۔ باقی ہر چیز ثانوی تھی۔ اب ان کے لیے پاکستان مقدم ٹھہرا۔ باقی ہر چیز ثانوی۔ سو وہ ادب کو پاکستان کے تابع دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ترقی پسند تو پہلے ہی ادب کو مارکسیت کی کنیزی میں دے چکے تھے۔ ان کا تقسیم کے بارے میں اپنا ردعمل تھا۔ بس ان حالات میں عسکری تاثیر اتحاد وجود میں آیا۔

''یہ اتحاد مبارک ہو مومنوں کے لیے''

مگر ترقی پسندوں کے لیے یہ اتحاد کوئی نیک شگن نہیں تھا۔ دو تو چون کے بھی برے ہوتے ہیں۔ اور یہ دو تو اپنی اپنی جگہ ادب میں بڑی حیثیت رکھتے تھے۔ سو یہ اتحاد ترقی پسندوں پر بھاری پڑا۔ یہ اتحاد لمبا نہیں کھنچا۔ اصل میں تھوڑے ہی دنوں میں ایک اور اتحاد نے اس اتحاد کا رستہ کاٹ دیا۔ منٹو صاحب تاثیر صاحب کی بلیک لسٹ میں تھے۔ ان کا کوئی دوست منٹو سے پینگیں بڑھائے یہ بات انہیں کیسے بھا سکتی تھی۔ عسکری صاحب نے بھانپ لیا اور بس بدک گئے۔ اور ایسے بدکے کہ اپنی زندگی کا سب سے تیز مضمون انہوں نے شاید تاثیر صاحب ہی کے خلاف لکھا۔

تو اب عسکری صاحب نے ایک نئے گھر کا رستہ دیکھ لیا تھا۔ تاثیر صاحب سے یاری کٹ۔ اب روز شام کو وہ لکشمی منشن کی طرف

جاتے نظر آتے جہاں منٹو صاحب رہتے تھے۔

عسکری منٹو دوستی بہت بار آور ثابت ہوئی۔ عسکری صاحب کو جس شے کی اس وقت تلاش تھی وہ اولاً منٹو صاحب ہی کے یہاں سے انہیں دستیاب ہوئی۔ اصل میں وہ پاکستانی ادب کی ضروریات کا اعلان تو کر بیٹھے تھے۔ مگر انہیں کوئی ایسا نمونہ دستیاب نہیں ہو رہا تھا جسے وہ اعتماد کے ساتھ پاکستانی ادب کے طور پر پیش کر سکیں۔ ''کھول دو'' نے ان کی اس ضرورت کو پورا کیا۔ ادھر کراچی میں ممتاز شیریں نے پاکستانی ادب کے دو نمونے دریافت کیے۔ قدرت اللہ شہاب کی طویل مختصر کہانی ''یا خدا'' اور محمود ہاشمی کے رپورتاژوں کا مجموعہ ''کشمیر اداس ہے۔'' عسکری صاحب اور ممتاز شیریں کو اول اول انہیں تین نمونوں پر گزارہ کرنا پڑا۔

ترقی پسندوں کو ''کھول دو'' کی حد تک منٹو صاحب سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہ فسانہ اس کے لیے قابل قبول تھا۔ جب حکومت کو اس پر اعتراض ہوا تو اور زیادہ قابل قبول ہو گیا۔ تین ترقی پسند رسالوں ''سویرا'' ''ادب لطیف'' اور ''نقوش'' پر بیک وقت سرکاری عتاب آیا تھا۔ ان میں نقوش کی بڑی خطا یہ تھی کہ اس میں ''کھول دو'' شائع ہوا تھا۔ سرکاری کاروائی کے خلاف ترقی پسند ادیبوں کو تو احتجاج کرنا ہی تھا۔ عسکری صاحب بھی اس احتجاج میں پیش پیش تھے۔ عسکری صاحب ترقی پسند ادب پر اعتراض کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ سرکار کو یہ حق دینے کے روادار نہیں تھے۔

''کھول دو'' سے ''سیاہ حاشیے'' تک آتے آتے ادبی سیاست بدل چکی تھی۔ اب ترقی پسند منٹو صاحب سے فرنٹ تھے۔ منٹو صاحب نے ایک ستم تو یہ کیا کہ ''سیاہ حاشیے'' میں ترقی پسند تحریک کی منظور کردہ انسان دوستی سے تجاوز کر کے وہ انداز نظر اپنایا جیسے ترقی پسند غیر انسانی اور سفاکی کا رویہ بتاتے تھے۔ اوپر سے یہ قہر ڈھایا کہ اس مجموعہ کا دیباچہ عسکری صاحب سے لکھوایا۔ سو اس کتاب پر بہت لے دے ہوئی۔ سب سے کڑی تنقید احمد ندیم قاسمی نے کی۔ پھر جوش میں آ کر انہوں نے منٹو کے نام ایک کھلی چھٹی لکھی۔

کھلی چھٹی کے جواب میں کوئی کھلی چھٹی تو نہیں آئی۔ مگر جب منٹو صاحب ''یزید'' کا اختتامیہ لکھنے بیٹھے تو انہوں نے لگتے ہاتھوں اس چٹھی کا بھی مختصر جواب لکھ ڈالا۔ ''سیاہ حاشیے'' کا ذکر کرتے ہوئے ترقی پسندوں کے ردعمل کا ذکر کیا اور کہا ''میرے ایک عزیز دوست نے تو یہاں تک کہا کہ میں نے لاشوں کی جیبوں میں سے سگریٹ کے ٹکڑے، انگوٹھیاں اور اس قسم کی دوسری چیزیں نکال نکال کر جمع کی ہیں۔ اس عزیز نے میرے نام ایک کھلی چھٹی بھی شائع کی جو وہ بڑی آسانی سے مجھے خود دے سکتے تھے..... مجھے غصہ تھا اس کا نہیں کہ مجھے الف نے کیوں غلط سمجھا۔ مجھے غصہ تھا اس بات کا کہ الف نے محض فیشن کے طور پر ایک سقیم و عقیم تحریک کی انگلی پکڑ کر بیرونی سیاست کے مصنوعی ابرو کے اشارے پر میری نیت پر شک کیا اور مجھے اس کسوٹی پر پرکھا جس پر صرف ''سرخی'' ہی سونا تھی۔''

یہ بحث گرم تھی کہ ایک نئے رسالے کی دھوم پڑی۔ اس وقت دنیائے ادب میں لاہور کے تین رسالوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ''سویرا'' اور ''ادب لطیف'' تو پہلے سے جاری تھے۔ ''نقوش'' نیا نیا نکلا تھا۔ تینوں ترقی پسند ادب کے ترجمان تھے اور انقلاب کی ڈونڈی پیٹ رہے تھے۔ رہے ''ہمایوں'' اور ''ادبی دنیا'' سو ان کا وہی رنگ تھا جو حلقہ کا کہ نا کاہو سے دوستی نا کاہو سے بیری نہ کسی نظریئے کی حمایت نہ مخالفت۔ عہد میں برپا ہنگاموں سے بے تعلق خاموشی سے خالص ادب کی راہ پر رواں دواں۔ مگر اب کتب جدید نے ایک نئے ادبی رسالہ کا ڈول ڈالا۔ نام تھا ''اردو ادب۔'' ایڈیٹر تھے منٹو اور عسکری۔ مطلب یہ تھا کہ ترقی پسند یہ نہ سمجھیں کہ ان کا نام پوچھنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ ویسے تو بس دو ہی پرچے نکلے۔ مگر کس دھوم سے نکلے اور اگلے پچھلے کتنے حساب چکائے گئے۔ پھر عسکری صاحب کے ''اسلامی ادب'' کا شگوفہ بھی تو یہیں سے پھوٹا تھا۔

تو خیر اب منٹو صاحب ترقی پسند تحریک کے معتوب تھے۔ مگر اسی ہنگام انہیں دو کام کے نقاد میسر آ گئے۔ عسکری اور ممتاز شیریں۔ نقادوں کی ایسی جوڑی بھلا اور کس افسانہ نگار کس شاعر کو میسر آئی تھی اور ممتاز شیریں تو پھر رفتہ رفتہ منٹو کے افسانے ہی کی حور ہیں۔ اصل میں ان دونوں نقادوں کی فکر میں ہم آہنگی تھی، مگر مزاج مختلف تھا۔ ممتاز شیریں کے مزاج میں استقلال تھا۔ سو ان کی پسند لمبی چلتی تھی۔ اور منٹو صاحب کو پسند کرنے کے بعد تو انہوں نے جیسے طے کر لیا ہو کہ یک گیر و محکم گیری سو پھر ان کی تنقید منٹو کے افسانے ہی کے لیے وقف ہو گئی۔

عسکری صاحب کی طبیعت سیمابی تھی۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ذہن ابھی یہاں اور ابھی زقند بھر کے وہاں۔ سو نقاد بے اعتبارے تھے۔ جانے کب کس لکھنے والے پہ ریجھ جائیں اور کب اس سے آنکھ پھیر لیں۔ کرشن چندر کے لیے کس طرح آسمان سے ستارے توڑ کر لائے اور پھر کس طرح اس سے فرنٹ ہوئے۔ ناصر کاظمی پر کس طرح فدا ہوئے اور پھر کیسا نئی نسل کی بات کرنے پر اس سے بدکے۔ خیر ناصر کاظمی پر اس وقت تو انہیں ریجھنا ہی تھا۔ اصل میں اس وقت انہیں ایک سچے پاکستانی شاعر کی اشد ضرورت تھی۔ ویسے تو انہیں اپنے زمانے کے شاعری کے سارے تقاضے فراق کی غزل سے پورے ہوتے نظر آتے تھے۔ سو اول میر، دوم فراق۔ آگے تمت بالخیری مگر اب درمیان میں پاکستان کی آ پڑی تھی۔ افسانے میں تو منٹو صاحب مل گئے۔ شاعری میں کیا کیا جائے

''موذن مرحبا بروقت بولا''

ناصر کی غزل کیسے صحیح وقت پر نمودار ہوئی۔ کیا خوب شاعر دستیاب ہوا۔ میر کا ماننے والا۔ فراق کا چاہنے والا۔ غزل کھری۔ ترقی پسندی کی آلائش سے پاک، فسادات اور ہجرت کا بیان۔ مگر داغ داغ اجالے کے رنگ سے نہیں بلکہ ایک تخلیقی تجربے کی کیفیت کے

ساتھ۔ یہ غزل اس وقت عسکری صاحب کی ساری خواہشات کو قومی و نیز ادبی پوری کرتی نظر آ رہی تھی۔ سو انہوں نے اسے فوراً ہی لپک لیا۔ باقی آگے چل کر ناصر نئی نسل کا قصہ نہ چھیڑتا تو بھی عسکری صاحب کو اس سے منہ موڑنا ہی تھا۔ ذہنی رویہ اور اس کے ساتھ پسند بدلتی جو چلی جا رہی تھی۔ تھوڑے دن سلیم سے بھی اپنی پسند کی نئی شاعری کرا کے دیکھ لی۔ مگر آخر میں روایت کے ایسے قائل ہوئے کہ انہوں نے اس واسطے سے صبر سہارنپوری کو ٹٹول نکالا اور تنقید کی دنیا میں مولانا اشرف علی تھانوی کو ایک بڑے نقاد کے طور پر دریافت کیا۔ کون فلابیر' کون جوائس اور کون پاؤنڈ۔ یہ جس کھیت کی مولیاں تھیں اب عسکری صاحب اس کھیت ہی سے بدک چکے تھے۔

عسکری صاحب رجھتے بھی جلدی تھے اور بدکتے بھی جلدی تھے۔ ان کے رجھنے اور بدکنے کی منطق کبھی تو سمجھ میں آتی تھی اور کبھی بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ویسے بدکتے زیادہ تھے۔ عجب عجب ان کے طور تھے۔ پیدل چلنے کے بہت قائل تھے۔ اور جب لاہور کی مال روڈ پر آپ پیدل چل رہے ہوں اور زمانہ وہ ہو جب مال روڈ پر یار اہلے گہلے پھرا کرتے تھے تو پھر کسی نہ کسی شناسا سے تو آپ کی مڈھ بھیڑ ہوگی۔ عسکری صاحب کس پھرتی سے اس سے پیچھا چھڑاتے تھے۔ وہ بڑے ذوق و شوق سے عسکری صاحب سے استفسارات کر رہا ہے اور عسکری صاحب جی جی کہتے چلے جا رہے ہیں۔ آ گیا چوراہا۔ عسکری صاحب ٹھٹھکے "آپ کو کدھر جانا ہے۔" اس شریف آدمی نے یہ سوچ کر کہ عسکری صاحب مال روڈ پر سیدھے ہی جائیں گے کہا کہ "مال ہی پر جا رہا ہوں۔"

"اچھا پھر مجھے تو ادھر بیڈن روڈ پر جانا ہے۔" جلدی سے ہاتھ ملایا اور مال سے بیڈن کی طرف مڑ گئے۔ ادھر وہ غریب حیران کہ یہ کیا ہوا۔

چائے خانے میں یا کسی دوست کے ڈرائنگ روم میں ڈھائی تین دوستوں کے بیچ بیٹھے چہک رہے ہیں۔ بس ڈھائی تین دوست ایسے جن سے پوری اپنائیت ہو ان میں بیٹھ کر تو خوب چہکتے تھے۔ آن نازل ہوا کوئی اجنبی۔ یعنی ان دوستوں میں سے کسی کا دوست مگر عسکری صاحب کے لیے اجنبی۔ بس چپ لگ گئی۔ اب ہم انہیں ٹہوک رہے ہیں اور وہ وہاں ہوں سے آگے ہی نہیں بڑھ رہے۔ ویسے دوستوں میں بھی کسی وقت کسی سے فرنٹ ہو سکتے تھے۔ ایسوں سے بھی فرنٹ ہوتے دیکھا جنہیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ مزاج کے خلاف طور اطوار دیکھے اور بس بدک گئے۔ یاد دیکھا کہ شاگرد عزیز کے لچھن اب اور ہیں۔ بس منہ پھیر لیا۔ ایک وقت میں کچھ حرکتیں تو میری بھی ناپسندیدہ ٹھہری تھیں۔ اور ٹھہرنی ہی تھیں۔ میں نے تو نئی نسل کے بھرے میں ان کے خلاف ایک دو مضمون بھی کھینچ ڈالے تھے۔ مگر ردعمل ظاہر ہوا بھی تو طنز' تعریض اور تضحیک کی شکل میں۔ ہاں غصے کا خط ایک دفعہ موصول ہوا تھا۔ میں کراچی گیا۔

ٹی وی پر افتخار عارف سے ملاقات ہوئی۔ ان دنوں کراچی سٹیشن نے مشہور کہانیوں کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ فرمائش پر میں نے افتخار عارف سے وعدہ کیا کہ عسکری صاحب کی کسی کہانی کو ڈرامائی شکل میں منتقل کر کے پیش کروں گا۔

یہ وعدہ کر کے میں لاہور آ گیا۔ عسکری صاحب تک یہ خبر پہنچی۔ اور اب زمانہ وہ تھا کہ عسکری صاحب نے ریڈیو سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ اور ٹی وی سے قطع تعلق کا کیا سوال' اس سے تو شروع دن سے تعلق رکھا ہی نہیں تھا۔ تو اچانک مجھے ان کا ایک خط موصول ہوا۔ نہایت روکھا خط۔ نہ دعا سلام' نہ خیر عافیت' نہ کوئی گپ شپ۔ صرف چند سطریں کہ میں نے سنا ہے تم میری کسی کہانی کو ٹی وی کے لیے ڈرامہ میں ڈھال رہے ہو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ لو کہ میں تمہارے خلاف عدالتی کاروائی کروں گا۔

میں خط کو پی گیا۔ پھر مہینوں بعد ملاقات ہوئی تو نہ میں نے اس خط کا حوالہ دیا نہ انہوں نے ایسا کوئی ذکر کیا۔ اور انہیں ذکر کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ مقصد تو پورا ہو گیا۔ میں نے پھر کان پکڑے اور ان کی کہانی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

لو میں اپنے آپ کو خواہ مخواہ بیچ میں لے آیا۔ ذکر تو یہ تھا کہ عسکری صاحب کو آشنا سے اجنبی بنتے دیر نہیں لگتی تھی۔ ہمعصروں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا۔ کرشن چندر کی مثال سامنے ہے جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ اپنے اردو کے لکھنے والوں کو چھوڑیئے' مغرب کے کیسے کیسے جید لکھنے والے کے ساتھ انہوں نے یہی سلوک کیا۔ کہاں اٹھتے بیٹھتے اس کا کلمہ پڑھا جا رہا ہے' کہاں ایسے فرنٹ ہوئے کہ نام سننے کے روادار نہیں۔ آخر کے تئیں مغرب کی پوری ادبی اور فکری روایت اسی سلوک کی مستحق ٹھہری۔ ارے دوسروں کی جانے دو' خود اپنی تحریروں کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنی کیسی کیسی تحریر اس رنگ سے متروک ہوئی کہ جیسے وہ ان کے قلم سے نکلی ہی نہیں تھی۔ زاہد ڈار ایک مرتبہ ملا تو کہا کہ ''عسکری صاحب' آپ نے تو ایک وقت میں پاکستان کے ادیبوں کو یہ نصیحت بھی کی تھی کہ پاکستان کے عوام نے جو نہر کھودی ہے وہ ایسا واقعہ ہے کہ ادیبوں کو اس پر افسانے اور نظمیں لکھنی چاہئیں۔''

عسکری صاحب نے انجان بن کر پوچھا کہ ''میں نے یہ کہاں لکھا تھا۔''

زاہد ڈار بولا ''مجھے ایک کباڑیئے کے یہاں سے ''ساقی'' کا پرچہ ملا تھا۔ اس میں آپ کا ایک مضمون تھا جس میں یہ بات لکھی گئی تھی۔''

بولے ''پھر اس کباڑیئے ہی نے وہ مضمون لکھا ہوگا۔''

ویسے سرقہ کے الزام کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس زمانے کی اپنی اٹرم سٹرم تحریروں کے بارے میں پوچھنے پر میں بھی یہی جواب دیتا۔

اور ہاں ابتدائی برسوں میں کوئی یہ قیاس کر سکتا تھا کہ عسکری صاحب باقی سب ادیبوں کو کنڈم کر کے انہیں معتوب و مقہور ادیبوں کو

رعایتی نمبر دے کر پاس کرتے چلے جائیں گے اور بات اس طرح شروع کیا کریں گے کہ ترقی پسندوں نے ادب میں کم از کم اتنا تو کیا تھا کہ ..... اور صرف اتنا ہی نہیں ہوگا کہ سید سبط حسن سے شیر و شکر ہو جائیں گے بلکہ سوویت روس بھی اب اتنا معتبر ٹھہرے گا کہ ہنگری میں اس کی فوجی کاروائی بھی انہیں جائز نظر آئے گی۔ تو عسکری صاحب کو بدلتے دیر نہیں لگتی تھی۔ گھڑی میں رن میں گھڑی میں بن میں۔ مگر یہ کہ دنیاوی مصلحت کے تحت وہ کبھی نہیں بدلے۔ بس دل و دماغ میں بگولے اٹھتے رہتے تھے۔

رہ گئے ترقی پسند تو انہوں نے عسکری ایسے نظریاتی قسم کے دشمنوں پر قناعت نہیں کی۔ بہت جلدی اپنے دشمن اور طرح کے بھی پیدا کر لیے جنہوں نے لام بندی خالص سیاسی اور صحافتی رنگ سے کی۔ اس کا بڑا مورچہ شورش کاشمیری کا ہفت روزہ ''چٹان'' تھا۔ کبھی کبھی ایسا رن پڑتا کہ لپاڈگی تک نوبت آ جاتی۔ ایسے ہی ایک ہنگامہ کے موقعہ پر صفدر میر نے اعلان کیا تھا کہ میں خالی ترقی پسند نہیں ہوں' باکسر کا مکا کتنا کام دکھا سکتا ہے۔ اب جو ترقی پسند کانفرنس ہوئی اس پر کچھ اسی قسم کا حملہ ہوا تھا۔ میں اس کا چشم دید گواہ نہیں ہوں کہ میں تو اس وقت ''امروز'' کے دفتر میں آ گیا تھا۔ سو میرا بس اس حد تک مشاہدہ ہے کہ اس کانفرنس پہ ہلہ بول کر جب ہجوم واپس ہوا تو اس کا رخ ''امروز'' کے دفتر کی طرف ہو گیا۔ شاید انہوں نے طے کیا تھا کہ ہاتھ کے ہاتھ سرخوں کے اس اخبار کا بھی ادھار چکا دیا جائے۔ پہلے نعروں کی آوازیں آئیں۔ پھر ایک مشتعل ہجوم اندر گھس آیا۔ قیادت اس ہجوم کی سیف الدین سیف کر رہے تھے۔ رات کی شفٹ ڈیسک پر اپنے کام میں مصروف تھی۔ سیف صاحب نے ایک نظر میں سب کا جائزہ لیا۔ پھر ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ سیف صاحب سے بس کسی وقت سرسری سا تعارف ہوا تھا۔ اور شاید میرا جو رجعت پسند کے طور پر نام نکلا ہوا تھا وہ اس سے نا آشنا نہیں تھے۔ اور حسن اتفاق سے ہمارا وہ رفیق جس کا نام کمیونسٹ کے طور پر جانا جاتا تھا وہ اس وقت تھا ہی نہیں۔ حمید ہاشمی اس وقت کانفرنس میں گیا ہوا تھا۔ سیف صاحب ٹھٹھکے۔ پھر مشتعل ہجوم سے مخاطب ہوئے ''ارے ان غریبوں کی کیا خطا ہے۔ چلو واپس چلو۔''

اور ہجوم واپس ہو لیا۔

◆◆◆

اغیار کا بائیکاٹ

25 جولائی 1948ء کی تاریخ پڑی ہے۔ یہ خط لکھنؤ سے آیا تھا۔ حیران ہوں کہ یہ خط کون سے کونے کھدڑے میں پڑا رہ گیا تھا کہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔ اب جب میں پرانے کاغذات ٹٹول رہا ہوں کہ پچاس برس پہلے کی کوئی تحریر برآمد ہو جائے تو کاغذ کی کوئی چندی تک نہیں مل رہی۔ نہ ''نظام'' کا کوئی شمارہ میرے پاس محفوظ ہے' نہ کوئی رقعہ پرچہ۔ حالانکہ کتنے خط میں نے لکھے تھے اور کس کس بزرگ نے مجھے جواب سے نوازا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیچ ایک خونیں سرحد کے باوجود خط و کتابت اس طرح ہوتی تھی جیسے کوئی سرحد نہیں ہے۔ اور پاک ہند معاملات کی نزاکت کے باوجود ڈاک کی سنسر کا بھی ایسا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ایسا ہوتا تو سہیل عظیم آبادی کے ظالم خط سنسر کی زد میں آنے سے کیسے بچ جاتے۔ چلو ''نظام'' کے وہ ورق تو مجھے دستیاب ہو گئے جن میں یہ خط چھپے ہیں۔ باقی پرچے جن میں ان کے موقف کے حق میں اور خلاف لکھی جانے والی تحریریں چھپیں فراہم ہو جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ ان کی مدد سے مجھے کتنا کچھ یاد آ جاتا۔ اب مجھے دھیرے دھیرے کر کے کتنے ہی خط یاد آ رہے ہیں جو مجھے قاعدے سے ''نظام'' کی ڈاک کے فائل سے نکال کر محفوظ کر لینے چاہیے تھے۔ وہ مجھے اس زمانے کے معاملات کو اپنے حافظہ میں زندہ کرنے میں کتنی مدد دیتے۔ پرانے خطوط کا معاملہ بھی کچھ پرانے گانوں کا سا ہوتا ہے۔ کوئی پرانا گانا سنیں تو اس کے ساتھ وابستہ کتنی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ پورا ایک عہد زندہ ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔ پرانے خطوں کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ پرانا خط اپنے ساتھ کتنی پرانی یادیں لے کر آتا ہے۔ احتشام صاحب کا خط جو 25 جولائی 1948ء کو لکھا گیا میرے سامنے ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے رفتہ رفتہ اس زمانے کے کتنے معاملات یاد آ رہے ہیں۔ یاد آ رہا ہے کہ جو مسئلہ گرم تھا اس حوالے سے میں نے احتشام صاحب کے خلاف بھی کچھ لکھا تھا۔ ادھر سے جواب کتنے شفقت آمیز اور کتنے رسانیت کے لہجہ میں آیا۔ اسی کے ساتھ یاد آ رہا ہے کہ کچھ اور خط بھی تو کچھ اسی مضمون کے آئے تھے۔ کم از کم مہندر ناتھ کا خط تو میرے پاس محفوظ رہنا چاہیے تھا۔ دوستی اپنی جگہ' معاملات و مسائل پر اختلاف اور برہمی اپنی جگہ۔ الزام سارا عسکری صاحب کے سر لکھا کہ عسکری کی صحبت نے تمہیں خراب کیا ہے۔ بوجھو کہ مہندر ناتھ سے میرا کیا تعلق تھا۔ میں نے تو افسانہ نگار کی حیثیت سے آنکھ ہی پاکستان میں آ کر کھولی تھی۔ پھر مہندر ناتھ سے میرا دوستانہ تعلق کب اور کیسے قائم ہوا۔ اور اب جب میں یہ بتانے لگا ہوں تو کرشن چندر کے دلی والے گھر میں مجھے وہ اپنی صبح یاد آ رہی ہے جب مہندر ناتھ نئے

ادب اور خاص طور پر ترقی پسند ادب کے بارے میں رواں تھے اور میں نیاز مندی کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ادھر سرلا رسوئی میں بیٹھی پکوڑے تل کر بھیج رہی تھی۔ مہندر ناتھ کی گفتگو کی اپنی لذت' سرلا کے ہاتھ کے تلے پکوڑوں کی اپنی لذت۔ مگر یہ دوسری لذت ریوتی کے لئے تھی۔

قصہ یوں شروع ہوا کہ ایک مرتبہ ریوتی دلی سے محض ایک خبر سنانے کے لیے ہاپوڑ آیا اور بڑی گرمجوشی سے مجھے ایک خبر سنائی ''یار' ایک لڑکی ہے۔ میں نے اسے اردو پڑھانی شروع کی ہے۔''

''اچھا۔۔۔۔۔۔۔لڑکی خوبصورت ہے؟''

اس سوال کو اس نے گول کر دیا' کہا کہ اس کے بھائی کا تقاضا تھا کہ تم اردو سیکھو۔ پتہ ہے بھائی کون ہے؟''

''کون ہے؟''

''کرشن چندر''

''کرشن چندر کی بہن؟'' اچانک ساری صورتحال ہی بدل گئی۔ میں نے شوق سے اس لڑکی کے بارے میں ایک ایک تفصیل پوچھی۔

بات اردو پڑھانے سے شروع ہوئی تھی۔ مگر بات اس سے آگے نکل گئی۔ اور وہ مرحلہ آ گیا کہ میرا بھی اس سے ملنا ضروری ہو گیا۔ آخر دیکھنا تو تھا کہ دوست کہیں غلط جگہ تو نہیں پھنس گیا۔ خیر وہ عام معنوں میں تو خوبصورت لڑکی نہیں تھی۔ نہ کوئی چاند کا ٹکڑا' نہ کوئی زہرہ جبیں۔ اس کی اپنی ہی ایک پھبن تھی۔ سیدھی سادی شکل وصورت' سانولی رنگت' چھریرا بدن' بر میں سادہ سی سفید سوتی ساڑھی' کوئی ناز وادا والی بات نہیں' طور اطوار' نشست وبرخاست' بول چال' سب میں ایک سادگی اور متانت۔

پھر پورے خاندان کو دیکھا سوائے کرشن چندر کے۔ ماتا پتا دونوں بہت سیدھے اور شریف۔ مہندر ناتھ کی شخصیت میں اپنا ایک جادو تھا۔ میں فوراً ہی اس شخصیت سے متاثر ہو گیا۔ اسی اثر میں آ کر ان کے افسانوں کے مجموعہ ''چاندی کے تار'' پر ایک مضمون باندھ ڈالا جو ''نظام'' بمبئی میں چھپا۔ لیجئے دوستی پکی ہو گئی۔

ہاں جب ریوتی کے ماتا پتا کے کان میں یہ بھنک پڑی تو قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ کرشن چندر کا خاندان کائستھ۔ ادھر ہمارا دوست برہمن بچہ۔ اس کے پتا جی نے مجھے بلا بھیجا ''سنا تم نے' تمہارے متر نے دلی جا کر کیا گل کھلایا ہے۔ ذات گوت تو دیکھ لی ہوتی۔ اسے سمجھاؤ۔''

میں نے سمجھانے کا وعدہ کیا۔ اور پھر ریوتی سے آ کر کہا کہ ''تیرے پتا جی تو بہت تاؤ میں آئے ہوئے ہیں۔ اب تو سوچ لے' پچک تو

نہیں جائے گا۔"

"نہیں۔"

"ہاں پہلے سے سوچ لے۔ ایک تو وہ لڑکی بہت شریف ہے اور پھر کرشن چندر کی بہن ہے۔ اس سے دغا کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔"

میں تو اسے منجدھار کے بیچ چھوڑ کر چلا آیا تھا۔ چند ہی دنوں بعد وہ خود آیا اور رپورٹ دے کر چلا گیا۔ پھر کچھ دنوں تک کوئی خبر نہیں ملی کہ ذات گوت کا قضیہ کس مرحلہ میں ہے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد حلقہ ارباب ذوق میں ایک نئی شکل نمودار ہوئی۔ یہ ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے جو دلی سے ہجرت کر کے لاہور آن پہنچے تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے فوراً خبر سنائی "ارے ارے آپ انتظار حسین ہیں۔ آپ کے دوست ریوتی سرن شرما آپ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ارے بھئی ان کی شادی ہوگئی۔ بس ہم چند مسلمان دوست ہی ان کے براتی بن کر کرشن چندر کے گھر پہنچے تھے۔"

مگر پھر ہوا یوں کہ میں نے جب فساداتی ادب پر قلم اٹھایا تو یہ قلم سب سے بڑھ کر کرشن چندر کے خلاف رواں ہوا۔ غصہ یہ تھا کہ وہ افسانہ نگار جس کا میں کلمہ پڑھتا تھا "زندگی کے موڑ پر" اور "ان داتا" جیسے افسانے لکھنے کے بعد "پشاور ایکسپریس" ایسے افسانے کیوں لکھ رہا ہے۔ اور غیر جانبداری ظاہر کرنے کا یہ کونسا انداز ہے کہ ترازو لے کر بیٹھ گئے اور مظلومی اور شقاوت کو برابر برابر بانٹ کر دونوں اشیاء آدھی مسلمانوں کے پلڑے میں ڈال دیں اور آدھی ہندوؤں کے پلڑے میں۔ یہی بات اس مضمون میں لکھی گئی تھی جس کے لکھنے کی تقریب یہ تھی کہ "نقوش" کی آمد آمد تھی اور قاسمی صاحب کی طرف سے مجھے لکھنے کی دعوت ملی تھی۔ میری سادگی دیکھو کہ میں نے یہ سوچا ہی نہیں کہ میں کس رسالہ کے لیے کیا لکھ رہا ہوں۔ اور قاسمی صاحب کا ظرف دیکھو کہ انہوں نے ایک نو وارد لکھنے والے کا ایسا مضمون جو کسی طور ترقی پسند "نقوش" کی پالیسی سے ہم آہنگ نہیں تھا جوں کا توں چھاپ دیا۔ ادارے کی طرف سے صرف اتنا کہا گیا کہ ہاجرہ مسرور نے اس پر ایک صفحہ کا اختلافی نوٹ چڑھا دیا۔

احتشام صاحب کے خط کو بھی میں اسی فراخ دلانہ روئے کے تسلسل میں دیکھتا ہوں۔ تقسیم کے حوالے سے بحث کے سلسلہ میں احتشام صاحب نے کسی رسالے میں کچھ لکھا تھا۔ میرا قلم ان کے خلاف رواں ہوگیا۔ چند ہی دنوں بعد میں نے انہیں "نظام" کی طرف سے ایک خط لکھا۔ ادھر سے جواب آیا۔

بارود خانہ، لکھنو

20 جولائی 1948ء

محترمی تسلیم!

کئی دن ہوئے آپ کا خط ملا تھا کہ عید نمبر کے لیے کچھ لکھوں۔ میری خود خواہش تھی لیکن کچھ نہ لکھ سکا۔ ایک نظم ارسال خدمت ہے۔ اگر پسند آئے تو شائع کر دیجئے گا۔ موقعہ ملا تو پھر کچھ لکھوں گا۔

''نظام'' تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مجھے صحیح طور پر اب تک اندازہ نہ ہو سکا کہ آپ اور عسکری صاحب اور آپ کے دوسرے ہم خیال کیا چاہتے ہیں۔ وہ کھل کر کچھ نہیں کہتے۔ عسکری صاحب تو اب کچھ صاف صاف کہنے لگے ہیں مگر ابھی تھوڑی سی جھنجھلاہٹ اور بڑھے گی تو وہ اور صاف باتیں کریں گے۔ جس راہ پر آپ لوگ چاہتے ہیں اس پر میں آپ کے ساتھ نہ چل سکوں گا۔ ادھر آپ حضرات نے میرے متعلق بہت کچھ لکھا۔ لیکن میں جواب الجواب کے طور پر کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ خیر اختلافات رکھنا برا نہیں بشرطیکہ ہم لوگ پر خلوص ہوں۔

''نظام'' کبھی ملتا ہے کبھی نہیں۔ آپ کے بعض آڈیٹوریل تو بہت تکلیف دہ تھے' لیکن بعض پسند آئے۔ آپ ترقی پسندی کو بھی تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو پھر میں نہ جانے کس کے حصے میں پڑوں گا' اور پڑوں گا بھی یا نہیں۔ آپ ملت کی حکومت چاہتے ہیں اور میری عقل حیران ہے۔ آپ حضرات کا جوش و خروش نو دولتوں اور مذہب بدلنے والوں کا سا ہے۔ یہ کارواں کہاں جائے گا۔

میں نے دو مختصر مضامین حال ہی میں لکھے ہیں۔ ایک ''نیا دور'' کراچی میں شائع ہو رہا ہے۔ دوسرا ''نقوش'' میں۔ میری خواہش ہے کہ آپ اور عسکری صاحب اس کے متعلق اپنے تاثرات سے مجھے آگاہ کریں۔ لیکن طعن و طنز کا نہیں' صحیح تنقید کا متمنی ہوں۔

یقین رکھئے کہ ہندوستان یا ہندوستان کے ادیب پاکستان کے دشمن نہیں ہیں۔ وہ کسی کے دشمن نہیں ہیں۔ لیکن پاکستان جس طرح بنا ہے اس کی وجہ سے آپ خود مشکوک ہیں اور پریشان۔ آپ کے یہاں خود یہ کانٹا کھٹکتا ہے کہ جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا۔ لیکن آپ محب وطن اور وفادار بن کر نہ جانے کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ آپ اور عسکری صاحب دونوں خامکار اور پر جوش ہیں لیکن یاد رکھئے ابھی آپ ردعمل کے ایک شدید دور سے گزریں گے۔

حسن عسکری صاحب سے تسلیم کہئے گا۔ ناشر نے ''آخری سلام'' بھیج دیا ہے۔ پڑھ لوں تو اپنی رائے بھیج دوں گا۔ ابھی پڑھا نہیں۔ ترجمہ یقیناً اچھا ہی ہوگا۔ امید ہے کہ آپ لوگ اچھے ہوں گے۔

نیازمند۔۔۔۔۔۔۔احتشام حسین

''اختلافات رکھنا برا نہیں بشرطیکہ ہم لوگ پر خلوص ہوں۔'' احتشام صاحب نے کتنی اچھی اور سچی بات کہی۔ مگر ترقی پسند تحریک

اس رویے کو زیادہ دیر تک نباہ نہیں سکی۔ بہر حال جب تک تحریک نے اس رویے کو روا رکھا اس وقت تک ''ادب لطیف'' اور ''نقوش'' ایسے سچے پکے ترقی پسند رسالوں کو ہم ایسے رجعت پسندوں کی تحریروں کو چھاپنے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا تھا۔ ادھر انجمن کے در بھی ہم پر کھلے تھے۔ عارف عبدالمتین کیا ہیرا آدمی تھے۔ امرتسر کی مٹی مگر رکھ رکھاؤ میں لکھنو سے بڑھ کر لکھنوی۔ انتہا پسند قسم کے انقلابی مگر نعرہ لگانے کی طاقت سے عاری۔ لہجہ اتنا دھیما مانو کانا پھوسی کر رہے ہیں۔ پھر یہ ہوا کہ انقلاب اپنی جگہ' دوستوں سے وضعداری اپنی جگہ۔ میرا ان سے نظریاتی اختلاف بھی چل رہا تھا اور دوستانہ تعلقات بھی چل رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً مجھے محبت سے نوٹس دیتے ''انتظار صاحب! اگلے مہینے انجمن میں آپ کو افسانہ پڑھنا ہے۔'' اور میں خوشی خوشی انجمن میں جا کر اپنا نخالص رجعت پسندانہ افسانہ پڑھتا۔ بعد میں جو بھی حال ہوتا۔ مگر ایک شام انہوں نے کہا کہ آؤ چل کر کہیں بیٹھتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔ ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی' پیار محبت کی باتیں کیں۔ دیر بعد جھجکتے جھجکتے بولے ''انتظار صاحب وہ جو میں نے انجمن کے لیے آپ کا افسانہ بک کیا تھا وہ پروگرام بدل گیا۔ میں آپ سے شرمندہ ہوں۔''

''کوئی بات نہیں عارف صاحب۔''

پھر رکتے رکتے بولے ''اور وہ جو ''جاوید'' کے لیے میں نے آپ سے افسانہ لیا تھا وہ بھی اب وہاں نہیں چھپ سکے گا۔ برا نہ مانئے گا۔ پارٹی کا فیصلہ ہے۔''

''کوئی مضائقہ نہیں۔''

پارٹی نے رجعت پسند ادیبوں کا حقہ پانی بند کر دیا تھا۔ باقاعدہ ناموں کا اعلان کیا گیا کہ فلاں فلاں ادیب ترقی پسند رسالوں میں نہیں چھپیں گے۔ مزید اعلان کیا گیا کہ سرکاری اور غیر سرکاری رجعت پسند رسالوں کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ کوئی ترقی پسند ان سے قلمی تعاون نہیں کرے گا۔

لیجیے ہم پر ترقی پسند رسالوں کے دروازے بند ہو گئے۔ ہر پھر کے وہی ''ساقی'' کہ شاہد صاحب اب لاہور سے کراچی جا چکے تھے اور وہاں سے ''ساقی'' نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ یا پھر ممتاز شیریں کا ''نیا دور'' اور ہاں ''ماہ نو'' جس کی ادارت شروع میں پروفیسر سید وقار عظیم نے سنبھالی۔ پھر چند مہینے عسکری صاحب اس کے ایڈیٹر رہے۔ مگر پھر وہاں سے رسہ تڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ آخر رفیق خاور اس کے ایڈیٹر بنے جن کی ادارت لمبی چلی۔

خیر تو ذکر رجعت پسند ادیبوں اور ادبی رسالوں کے بائیکاٹ کا تھا۔ گرما گرمی میں یہ کام یاروں نے کر تو ڈالا۔ لیکن جب طبیعتیں

اعتدال پر آئیں تو پھر شاید سوچا کہ آخر اس فیصلہ میں کونسی دانشمندی تھی۔ یاد آیا کہ نظریاتی جنگ کے اس دور کے گزر جانے کے برسوں بعد روزنامہ ''مشرق'' میں اپنے کالم کی تقریب سے میں نے تحریک کے بعض بزرگ ادیبوں سے مختصر بات چیت کی تو منجملہ اور باتوں کے تحریک کے اس اقدام کے بارے میں بھی سوال کیا۔ سب نے یہی جواب دیا کہ یہ قرارداد بعض انتہا پسندوں کا کارنامہ تھی۔ ہم اس کے خلاف تھے' میں نے ایسی ہی ایک گفتگو میں سبط صاحب سے اس قرارداد کا ذکر کرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کے باقی رفقا تو اس قرارداد سے بے تعلقی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرارداد بعض انتہا پسندوں کی کارستانی تھی۔ آپ بتائیے کہ یہ انتہا پسند کون تھے۔

سبط صاحب نے بے تکلف کہا ''اس قرارداد کی پوری ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں میں نے اسے مرتب کیا تھا مگر کسی نے اسی کی مخالفت نہیں کی تھی اور قاسمی صاحب تو اس زمانے میں انجمن کے جنرل سکیرٹری تھے۔ وہ کیسے بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے اس زمانے میں تو ہم شمشیر برہنہ تھے۔ انتہا پسند بنے ہوئے تھے اور انتہا پسندی نقصان تو پہنچاتی ہے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ وہ کام ہم نے غلط کیا تھا۔ آخر ہم انسان تھے۔ فرشتے تو نہیں تھے۔''

کالم میں جس طرح جواب چھپا ہے میں نے یہاں اسے بعینہ نقل کر دیا ہے۔ سبط صاحب نے بات ذرا زیادہ وضاحت سے کی تھی جسے یہاں اختصار کر کے پیش کیا گیا تھا۔ مثلاً انتہا پسندی کی انہوں نے وجہ بھی بتائی تھی کہ اصل میں چین میں انقلاب آ جانے کے بعد ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ بس اب پاکستان میں بھی انقلاب آیا کہ آیا اور اس سے ہمارا دماغ پھر گیا۔

مگر کالم پڑھنے کے بعد سبط صاحب نے ایک وضاحتی خط لکھا۔ کیا مضائقہ ہے کہ اسے نقل کر دیا جائے۔

46 بلاک ای' بلاک 4

گلشن اقبال' کراچی

7 ستمبر 1982ء

برادرم انتظار حسین صاحب' سلام نیاز

آپ نے ''باتیں اور ملاقاتیں'' کے کالم میں یکم دسمبر 1981ء کو اس ناچیز کے بارے میں جو کلمات خیر لکھے تھے وہ میں نے پورے آٹھ ماہ بعد اب کے لاہور میں پڑھے۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کے سے منفرد اور صاحب طرز ادیب کے قلم سے میرا ذکر زہے نصیب..... البتہ ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں 1949ء میں لاہور میں جو قرارداد منظور ہوئی تھی اس کی بابت شاید میں اپنا مافی الضمیر دوران گفتگو واضح نہیں کر سکا تھا۔ میں نے کانفرنس کا منشور لکھا تھا جو بعد میں غالباً ''سویرا'' میں شائع بھی ہوا تھا۔ یہ منشور

''انتہا پسندی'' کا شاہکار تھا اور ساری خرابی اور بدمزگی اسی منشور سے پیدا ہوئی۔ قرارداد بھی اسی کا شاخسانہ تھی۔ یہ قرارداد ڈیلی گیٹوں کے پرائیوٹ اجلاس میں اتفاق رائے سے منظور ہوئی تھی۔ ڈیلی گیٹوں کا یہ اجلاس کانفرنس سے ایک دن پہلے جناب مظہر علی خاں کے فلیٹ واقع نکولسن روڈ پر رات کے وقت منعقد ہوا تھا۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ قرارداد لکھی کس نے تھی۔ مگر جس نے بھی لکھی تھی اجلاس کے دوران سب کے مشورے اور منشا سے لکھی تھی۔ لہٰذا اس سے میرے یا کسی دوسرے شریک محفل کے قرارداد سے بری الذمہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آپ مجھ سے ہلٹن میں ٹھہرنے کا طعنہ دیتے ہیں۔ یقین مانئے مجھ کو جدید طرز کے سب ہوٹلوں سے دلی نفرت ہے۔ ان میں یوں محسوس ہوتا ہے گویا کابک یا ڈربے میں بند ہو گئے ہیں۔ زندہ درگور کی اصطلاح شاید انہیں کمروں کے لیے وضع ہوئی تھی' مگر مجبوراً ٹھہرنا پڑتا ہے۔ جب سے شاکر علی ہم سے بچھڑے ہیں لاہور میرے لیے پرایا دیس بن گیا ہے۔ شاکر کی زندگی میں تو میں کبھی ہوٹلوں میں نہ ٹھہرا۔ ائیر پورٹ یا ریلوے سٹیشن سے سیدھا ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ اور بے تکلفی سے جب تک جی چاہتا رہتا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہیں پوچھتے تھے کہ کیوں آئے اور کب جاؤ گے۔ اب آپ ہی بتائیے لاہور میں کوئی ایسا یار' کوئی ایسا گھر ہے جہاں جا کر ٹھہروں۔ لاہور میرے لیے شاکر کے دم سے اپنا شہر تھا۔ وہ نہیں رہا تو ہوٹل میں نہ ٹھہروں تو کہاں جاؤں۔ میکدے ویران ہیں اور مسجدیں اور خانقاہیں مجھ کو قبول نہیں کریں گی۔

نیاز مند۔۔۔۔۔۔۔سبط حسن

اور اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ اس واقعہ کے بعد بھی تو میں نے ایک دفعہ انجمن کی نشست میں اپنا افسانہ سنایا تھا۔ مگر اب تو زمانہ ہی بدل چکا تھا۔ پنڈی سازش کیس کے سانحہ نے ترقی پسند تحریک کو ایسا دھچکا لگایا کہ ساری محفل ہی درہم و برہم ہو گئی۔ فیض صاحب تو خیر سید سجاد ظہیر کے ساتھ بڑے ملزموں کی صف میں شامل تھے۔ جب وہ واپس آئے تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جیسے تیسے کر کے انجمن کو پھر سے آراستہ کیا گیا۔ بائیکاٹ کی قرارداد تو تحریک کے عروج کے زمانے کی یادگار تھی۔ اب ان تلوں میں اتنا تیل کہاں تھا کہ اس قرارداد کو برقرار رکھا جاتا۔ سو وہ فراموش ہوئی۔ حمید اختر نے مجھے افسانہ پڑھنے کی دعوت دی۔ میں نے انجمن کے اچھے زمانوں میں اس کے جلسوں میں اپنی شرکت کو یاد کیا اور فوراً تیار ہو گیا۔ اپنا افسانہ ''ٹھنڈی آگ'' بغل میں داب جلسہ میں پہنچا۔ مگر اب وہ سماں کہاں۔ نہ وہ یاروں کی ریل پیل' نہ وہ گرما گرمی' نہ وہ جوش و خروش' نقی بلڈنگ میں اجڑا اجڑا ایک کمرہ۔ داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی اکا دکا شمع۔ یکمشت حاضرین۔ پھر بھی میرے لیے وہ نشست یادگار ہے کہ میں نے اپنا ایک بہتر افسانہ وہاں پڑھا اور باجرہ مسرور سے میرا

وہاں تعارف ہوا۔ پہلے وہ کہاں نظر آتی تھیں۔ پردے میں رہتی تھیں۔

اب جلسہ میں ہونے والی تنقید میں بھی وہ جوش وخروش نہیں تھا۔ میں نے ان یکمشت حاضرین سے اپنے افسانے کی داد پائی۔ دل نے کہا اس اجڑی صحبت کو غنیمت جانو۔ کل کیا خبر ہے کہ یہ بھی رہے رہے نہ رہے۔ تحریکیں کس شور سے اٹھتی ہیں اور کس طرح اچانک ڈھے جاتی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

◆◆◆

چند روز ''امروز'' میں

تھوڑا سا اپنی ذات کے متعلق بھی سہی۔ کم از کم یہ تو بتا ہی دینا چاہیے کہ یہ رجعت پسند ''نظام'' سے نکل کر ''امروز'' میں کیسے آ گیا جو ترقی پسندی کی اقدار کا ترجمان تھا اور جس کا پاکستان کمیونسٹ پارٹی سے رشتہ استوار تھا۔ اور ہاں یہ بھی کہ رہائش بھی اب تبدیل ہو چکی تھی۔ ''نظام'' سے تو میں 1949ء کے بیچ نکلا۔ عسکری صاحب سے مفارقت 1948ء کے بیچ ہی ہو گئی تھی۔ وجہ یہ کہ ہمارے خاندان کی ایک اور قسط یہاں آن پہنچی تھی۔ میرے دو بھانجے انصار حسین اور حسن ظہیری یوپی سے آنے والوں کا طریقہ واردات کچھ اس طرح کا تھا کہ جیسے کسی پرانی عمارت کی ایک اینٹ نکل جائے بس پھر اینٹیں نکلتی چلی جاتی ہیں اور یوں عمارت دھیرے دھیرے کر کے ٹوٹتی بکھرتی ہے۔ خاندان سے کسی ایک فرد کے نکلنے کی دیر ہوتی تھی۔ پھر جیسے خاندان کی تاب مقاومت ختم ہو گئی ہو۔ پھر ایک ایک کر کے نکلنا شروع ہو جاتے۔ خیر تو میں نے اپنی اولین پناہ گیروں کی بستی کرشن نگر کو سلام کیا اور انصار منوں کے ساتھ فیروز پور روڈ پر ایک کوٹھی کے حصہ میں جو کہ کرائے پر لیا گیا تھا پڑاؤ کیا۔ پھر جب یہ خاندان پھیلنا شروع ہوا تو اس مختصر حصے کو چھوڑ کر برابر ہی میں ایک کوٹھی معمولی کرائے پر لی گئی۔ کرائے ان دنوں ایسے کونسے زیادہ تھے۔ سامنے سڑک کے اس پار کی کوٹھی سے کبھی کبھی ایک مانوس چہرہ نمودار ہوتا۔ سورن لتا کا چہرہ۔ یہ نذیر اور سورن لتا کی کوٹھی تھی۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہاں تو ارد گرد دائیں بائیں ایسی ہی صورتیں آباد ہیں۔ چند قدم کے فاصلہ پر مسلم ٹاؤن میں پنچولی سٹوڈیو جو تھا۔ عقب میں دیوار سے جھانک کر دیکھا تو دور تک کھیت پھیلے نظر آئے مگر ان کھیتوں کے اب دن گنے گئے تھے۔ یہاں تو نئی نئی بستیاں آباد ہوتی تھیں' رحمن پورہ' وحدت کالونی' مسلم ٹاؤن' نیو مسلم ٹاؤن' اقبال ٹاؤن' یونیورسٹی نیو کیمپس وغیرہ وغیرہ۔

''امروز'' کی صورت یہ تھی کہ یہ اخبار نیا نیا پروگریسو پیپرز کے اہتمام میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ فیض اور مولانا چراغ حسن حسرت اس کے ایڈیٹر تھے۔ مگر فیض صاحب کا تو نام ہی نام تھا۔ انہیں ''پاکستان ٹائمز'' کی ادارت ہی بہت تھی۔ ''امروز'' پر تو بس ان کے نام کا سایہ تھا۔ عملاً حسرت صاحب اکیلے اس کے ایڈیٹر تھے۔ اور کیا خوب ایڈیٹر تھے۔ اس کی شکل مروجہ اردو اخباروں سے بالکل مختلف تھی کہ اردو اخبار تو گیٹ اپ نام کی چیز سے آشنا ہی نہیں تھا۔ صفحات پر خبریں کھچ پچ۔ کوئی ترتیب' نہ سرخیوں میں کوئی قرینہ۔ اس اخبار نے گیٹ اپ پر خاص زور دیا۔ خبروں اور فیچروں کی پیشکش میں ایک ترتیب ایک قرینہ پیدا کیا۔ پھر سٹاف کی تنخواہوں میں بھی ایک

باقاعدگی پیدا کی۔ گریڈ مقرر ہوئے۔ سالانہ ترقی اور پنشن کا ڈول ڈالا گیا۔ اردو اخباروں میں یہ کہاں ہوتا تھا۔ ادبی ضمیمہ قسمت علمی و ادبی کے عنوان سے اس شان سے نکلا کہ اس کا اپنا ایک معیار ہوتا تھا۔ نامور لکھنے والوں کا تعاون حاصل کیا گیا اور معاوضے ادا کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ غزل کا معاوضہ دس روپے مقرر ہوا۔ مضمون سات روپے کالم کے حساب سے۔ بالعموم تین کالموں کے مضمون کی فرمائش کی جاتی تھی۔ معاوضہ اکیس روپے۔ اس زمانے میں لاہور میں فلیکس کے ربڑ سول جوتے کا فیشن چل رہا تھا۔ یہ جوتا اکیس روپے کا آتا تھا۔ ادیبوں کے لیے اس جوتے کی قیمت تھی ''امروز'' کے تین کالم۔ گویا ''امروز'' میں مضمون لکھنے کا مطلب تھا فلیکس کا ایک جوڑی جوتا۔ اس اخبار کے طفیل شہر کے کتنے ادیب فلیکس کا جوتا پہن کر جنٹلمین بن گئے۔

اردو اخباروں میں آگے تو ملازمت ملنے کی بس اتنی شرط ہوتی تھی کہ آپ اردو میں اتنی شد بد رکھتے ہیں کہ لکھ لکھا سکیں۔ خبروں کا جیسا کیسا ترجمہ کر سکیں۔ یہاں باقاعدہ تعلیم یافتہ مطلب یہ کہ ڈگری یافتہ ہونے کی شرط رکھی گئی اور ملازم رکھتے وقت سختی سے اس شرط کو ملحوظ رکھا گیا۔ چونکہ لیفٹ کا اخبار تھا اس لیے توقع ہی کی جاتی تھی کہ اس نظریے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔ سو ایسے بزرگ اور نوجوان ''امروز'' میں ملازمت کی طلب میں سیدھے میاں افتخار الدین کے پاس پہنچتے۔ وہ انہیں حسرت صاحب کی طرف منتقل کر دیتے۔ حسرت صاحب اپنے رنگ سے ان کی لیاقت کو جانچتے پرکھتے۔ پھر سگریٹ کا لمبا کش لے کر کہتے ''مولانا ہم نے اخبار نکالا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کا دفتر نہیں کھولا۔'' اور ملازمت کے امیدوار کو چٹخا دیتے۔ سو اس اخبار میں کامریڈ خال خال اور تعلیم یافتہ نوجوان زیادہ نظر آتے تھے۔

مگر حسرت صاحب پروفیسر ممتاز حسین کو تو اس طرح نہیں چٹخا سکتے تھے۔ خالی ڈگری والے تعلیم یافتہ نہیں۔ وہ تو فاضل نقاد تھے اور علم کا سرخ سمندر مگر انہوں نے ''امروز'' میں آتے ہی ایک بحران پیدا کر دیا۔ اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ ڈلس کا کوئی بیان آیا جو اپنی سیاسی اہمیت کی وجہ سے اگلے دن اخباروں کی لیڈ بنا۔ مگر جب حسرت صاحب نے ''امروز'' پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ یہ بیان غائب ہے۔ سر پیٹ لیا اور دفتر سر پہ اٹھا لیا۔

سوئے اتفاق سے اس رات نیوز ایڈیٹر ابرار صدیقی چھٹی پر تھے۔ کوئی دوسرا ہی ان کی جگہ شفٹ انچارج تھا۔ کاپی جوڑتے وقت اسے دھیان ہی نہیں آیا کہ ڈلس کا بھی ایک بیان آیا تھا وہ کہاں ہے۔ اب جو اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اسے یاد آیا کہ ایسا بیان آیا تو تھا۔ اور وہ اس نے ممتاز صاحب کو ترجمہ کے لیے دیا تھا۔

ممتاز صاحب سے پوچھا گیا ''ممتاز صاحب ڈلس کا بیان آپ کے پاس ترجمہ کے لیے آیا تھا۔''

''جی میرے ہی پاس ترجمہ کے لیے آیا تھا۔''

''پھر آپ نے اس کا کیا کیا۔''

''کیا کرتا۔ بے معنی بیان تھا۔ وہی سامراجیوں کے استحصالی ہتھکنڈے۔ میں نے پھاڑ کے پھینک دیا۔''

ممتاز صاحب تو ''امروز'' کو اپنے نظریئے کا ترجمان سمجھ کر آئے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں بھی رجعت پسندی کا کھٹراک پھیلا ہوا ہے تو اکھڑ لیے۔ پھر یہ خاک بھی اڑ کر اسی شہر میں پہنچی جہاں گنگا جمنا کا پانی بہہ کر پہنچ رہا تھا اور اکٹھا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ویسے بھی ممتاز صاحب کی حسرت صاحب سے کہاں نبھ سکتی تھی۔ ایک جنگل میں دو شیر تو نہیں رہ سکتے۔ حسرت صاحب کی بلا سے کہ کسی کامریڈ نے مارکس اور اینگلز کا کتنا مطالعہ کیا ہے۔ وہ تو زید بکر سب کو ایک ہی سوال سے آزماتے تھے ''مولانا آپ نے طلسم ہوش ربا پڑھی ہے۔'' اسی سوال کے جواب پر آدمی پاس فیل ہوتا تھا۔ خیر پاس کی بات تو جانے ہی دیں۔ مولانا ''امروز'' کے دفتر میں ابوالہول بنے بیٹھے رہتے تھے۔ سوال کا جواب جس نے ناں میں دیا وہ بھی مارا گیا جس نے ہاں میں دیا وہ بھی سرخرو ہوتے نہیں دیکھا گیا۔

مولانا کیا خوب بزرگ تھے۔ لمبے ٹونگے' بھاری بھرکم۔ اسی تناسب سے آواز بھاری کش لیتے اور ہر ادنیٰ اعلیٰ سے ایک ہی انداز سے مخاطب ہوتے ''مولانا.....'' فقرہ باز غضب کے۔ آدمی رعب داب والے تھے۔ دفتر میں دفتر سے باہر سب ان سے رعب کھاتے تھے۔ سوائے ان کے چپراسی کے۔ اس کا نام تھا رمضان۔ بدن چرخ' بال کھچڑی۔ چہرہ پچکا ہوا۔ مگر آنکھوں کی چمک قائم تھی۔ حسرت صاحب کے کمرے کے باہر تپائی پہ بیٹھا رہتا۔ کوئی سیدھا سادہ اجنبی ان سے ملنے آ جاتا تو بڑی بڑی آنکھیں نکال کر اسے دیکھتا اور کہتا ''صاحب کام کر رہے ہیں۔ نام لکھ دو اپنا۔''

مگر اس طرح رعب گانٹھنے کے موقعے کم آتے۔ یار لوگ بالعموم اسے خاطر میں لائے بغیر چق اٹھاتے اور اندر داخل ہو جاتے۔ آنے والوں کی یہ بے تکلفی دیکھ کر رمضان کو حسرت صاحب پہ غصہ آتا۔ پھر وہ تقسیم سے پہلے کے اس زمانے کو یاد کرتا جب وہ ایک سکھ وزیر کا اردلی تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ اسے نظر انداز کر کے اس کی اجازت کے بغیر اندر داخل ہو جاتا۔ سکھ وزیر کے اردلی کی حیثیت سے وہ کتنا معزز تھا۔ حسرت صاحب کی اردل میں اس کی کتنی بے توقیری ہو رہی تھی۔

حسرت صاحب کے کمرے میں آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ صحافی' ادیب' ناشر' کتب فروش' کاغذوں کے تاجر' عرب ہوٹل کا

کوئی بچھا کچھا ہمنشین' شرابی کبابی' تماشبین' شاعر' شطرنج باز' گانے بجانے کے رسیا' شعروشاعری کے شوقین' کوئی خوش شکل نوخیز صحافی' غرض عجب کھچڑی محفل ہوتی۔ ادھر باہر رمضان تپائی پہ بیٹھا حسرت صاحب کی بے رعبی اور اپنی بے توقیری پر کڑھتے کڑھتے اپنے پرانے سکھ آقا کے وقار اور طنطنہ کی یادوں میں کھو جاتا' ادھر اندر بیٹھے حسرت صاحب کو ''الہلال'' کے دن یاد آ جاتے۔ پھر زقند لگاتے اور حالی وسرسید کے زمانے میں پہنچ جاتے۔ وہاں سے زقند بھری اور غالب کی دلی میں۔ غالب کی دلی سے نکلے اور ایران پہنچ جاتے۔ ناصرالدین قاچار' قاآنی' حافظ سعدی' ایران سے ملایا میں۔ ملایا سے کلکتہ میں۔

''مولانا، آپ نے کلکتہ دیکھا ہے۔''

''نہیں مولانا۔''

''پھر مولانا آپ نے کیا دیکھا ہے۔'' سگریٹ کا ایک لمبا کش اور کلکتہ کا قصیدہ شروع ''مولانا'' کلکتہ بہت بڑا شہر ہے۔''

''مولانا' آپ نے طلسم ہوش ربا پڑھی ہے۔''

''نہیں مولانا۔''

''پھر مولانا آپ نے کیا پڑھا ہے۔'' سگریٹ کا لمبا کش لیا' آنکھیں بند کیں۔ شروع ہو گئے' سرسید' شبلی' حالی' ذکاءاللہ' محسن الملک' مولوی چراغ علی' محمد حسین آزاد' نصیر حسین خیال' کیسی کیسی شخصیت گزر گئی۔ اب کون باقی رہ گیا ہے۔ لے دے کے ہمارے عبدالمجید بھٹی جو کتاب اس ڈر سے نہیں پڑھتے کہ کہیں ان کی اور یجنلٹی نہ ماری جائے۔'' پھر سگریٹ کا کش اور لمبا ٹھنڈا سانس ''صاحب یہ آج کل کے ادیب ہیں۔ ان میں سے کسی نے طلسم ہوش ربا نہیں پڑھی ہے۔''

جس نے ''طلسم ہوش ربا'' نہیں پڑھی تھی وہ تو گردن زدنی تھا ہی مگر جس نے ''طلسم ہوش ربا'' پڑھنے کا اقرار کیا وہ بھی خطاوار ٹھہرا۔ حسرت صاحب یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا ''طلسم ہوش ربا'' پڑھ کر ان کے برابر آ جائے۔ پھر کوئی اس وجہ سے نظروں سے گرا کہ اس نے ''فسانہ آزدا'' نہیں پڑھا تھا اور کوئی اس باعث معتوب ٹھہرا کہ اس نے ''فسانہ آزاد'' پڑھ لیا تھا۔

میاں افتخارالدین کا وزارت سے علیحدہ ہونا اور ''امروز'' کا جاری ہونا۔ یہ دو واقعات آگے پیچھے ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد چین میں انقلاب آ گیا۔ چیانگ کائی شک اقتدار سے باہر ہو گئے۔ میاں صاحب حسرت سے مخاطب ہوئے ''حسرت صاحب' اب چیانگ کائی شک کیا کرے گا۔''

مولانا نے سگریٹ کا لمبا کش لیا اور بولے ''مولانا' وہ بھی کوئی اخبار نکال لے گا۔''

وہ اپنے زمانے کے ادیبوں سے جتنے بیزار تھے اتنا ہی اپنے زمانے کے سیاست دانوں سے متنفر تھے۔ ادیبوں کو جاہل سمجھتے تھے کہ انہوں نے ''طلسم ہوش ربا'' نہیں پڑھی تھی۔ سیاست دانوں کو کور ذوق جانتے تھے کہ وہ ان کے فقرے کی صحیح داد دینے سے قاصر تھے۔ زمانے کی بے ذوقی کا ماتم کرتے۔ پھر انہیں سر سکندر حیات خاں یاد آ جاتے کہ ان پر پھبتی کہی جاتی تو وہ دوسرے دن داد بھیجتے اور دوستوں میں تقسیم کرنے کے لیے اخبار کا ایک پورا بنڈل منگواتے ''اور آج کل کے یہ لیڈر'' مولانا ٹھنڈا سانس بھرتے ''فقرے پر داد کیا دیں گے۔ فقرہ سمجھتے ہی نہیں۔ اور ہمارے میاں افتخار الدین۔ مولانا' میری تو اس اخبار میں نوکری اس وجہ سے لگی ہوئی ہے کہ میاں صاحب کے ڈرائیور کو میرا کالم پسند ہے۔''

زبان و بیان پر بہت زور دیتے تھے۔ ''امروز'' میں ہونے والی غلطیوں سے صرف نظر کیا جا سکتا تھا۔ مگر زبان کی غلطی معاف نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک صبح میں دفتر میں داخل ہوا دیکھا کہ دفتر میں کھلبلی پڑی ہوئی ہے۔ پتہ چلا کہ آج کے اخبار میں زبان کی ایک غلطی ہو گئی ہے۔ حسرت صاحب سخت غصے میں ہیں۔ نذیر خواجہ کو انہوں نے معطل کر دیا ہے۔ ویسے تو نیوز ایڈیٹر اب حمید ہاشمی تھا۔ مگر رات وہ نہیں آیا تھا۔ اس کی قائم مقامی نذیر خواجہ کر رہے تھے۔ حمید ہاشمی نے مجھے دیکھا تو فوراً مجھے پکڑا اور الگ کونے میں لے گیا ''تمہیں پتہ ہے حسرت صاحب نے خواجہ کو معطل کر دیا ہے۔''

''ہاں ابھی پتہ چلا ہے۔''

''اس کے ذمہ دار تم ہو۔''

''میں؟''

''ہاں خواجہ کہتا ہے کہ اس خبر کی سرخی جس پر حسرت صاحب کو اعتراض ہے وہ تم نے بنائی تھی۔''

پھر اس نے وہ خبر اور اس کی سرخی مجھے دکھائی۔ میں نے سرخی پڑھی اور اقرار کیا کہ ''ہاں یار یہ سرخی میں نے ہی بنائی تھی اور حسرت صاحب کا اعتراض بھی درست ہے۔ مجھ سے گھپلا ہو گیا۔''

''پھر تم جاؤ اور حسرت صاحب کو بتاؤ کہ یہ غلطی تم سے ہوئی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ تم سے زیادہ کچھ نہیں کہیں گے۔ مگر خواجہ کو وہ نہیں چھوڑیں گے۔''

میں سیدھا حسرت صاحب کے کمرے میں پہنچا۔

''کہیے مولانا' کیسے آنا ہوا۔''

عملہ کی آئے دن اس کمرے میں پیشیاں ہوتی تھیں۔ ان کی بھی جو معتوب تھے اور جنہیں مولانا نالائق جانتے تھے۔ اور ان کی بھی جو ان کے محبوب تھے اور جن کی غلطیاں نکالنا اور انہیں کچوکے دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ میں نہ معتوبوں میں تھا نہ محبوبوں میں۔ اس لیے میری پیشی کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی۔ آج میں خود ہی زبان کا مجرم بن کر پیش ہو گیا تھا۔

''مولانا بات یہ ہے کہ زبان کی جس غلطی کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اس میں نذیر خواجہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ خبر اصل میں میں نے بنائی تھی۔ تو اس کی سزا مجھے ملنی چاہیے۔''

حسرت صاحب نے غصے سے مجھے دیکھا ''مولانا' آپ خواجہ کو بچانے کے لیے یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔''

''نہیں' میں صحیح عرض کر رہا ہوں۔''

حسرت صاحب نے کچھ سوچا۔ پھر اخبار میری طرف بڑھایا ''کیا خیال ہے یہ زبان درست ہے۔''

''نہیں' غلطی بس ہو ہی گئی۔''

حسرت صاحب نے لمبا کش لیا ''مولانا' آپ سے تو زبان کی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔''

پھر بولے ''اچھا ہاشمی صاحب کو میرے پاس بھیجیے۔''

میں نے حمید ہاشمی کو جا کر نوید دی۔ لیجیے نذیر خواجہ کی جاں بخشی ہو گئی۔ ورنہ زبان کی ایک چھوٹی سے غلطی اسے لے بیٹھی تھی۔

ویسے نذیر خواجہ اپنی جگہ خوب شے تھے۔ موصوف کے تین شوق تھے۔ کرکٹ' شاعری' خاکساریت۔ دفتر میں کبھی بلے کے ساتھ نمودار ہوتے' کبھی بیلچے کے ساتھ۔ ''امروز'' کے خاص نمبروں کے لیے بڑے ذوق وشوق سے نظم لکھتے۔ مگر ہر نظم حسرت صاحب کے کاغذات کے بیچ دفن ہو جاتی۔ ''امروز'' کے صفحات تک پہنچتے پہنچتے رہ جاتی۔ حسرت صاحب نے ایک مرتبہ ان کا ذوق وشوق دیکھ کر کہا کہ ''امروز'' کے صفحات تو پر ہو گئے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے نیوز روم کے دروازے پر آویزاں کر دیا جائے تاکہ آنے والے صاحب ذوق لوگ اسے پڑھیں اور سر دھنیں۔ سو ایسا ہی کیا گیا۔ کئی دن تک وہ نظم نیوز روم کے دروازے پر آویزاں رہی اور آنے جانے والوں کو پڑھنے کی دعوت دیتی رہی۔

خبروں کا ترجمہ کرتے ہوئے اکثر وبیشتر کوئی ایسا گل کھلاتے تھے کہ فوراً پکڑے جاتے تھے۔ نظام حیدر آباد کے متعلق کوئی خبر

آئی۔ انہوں نے خبر کا ترجمہ کرتے ہوئے نظام حیدر آباد کو حیدر آباد کا راج پرمکھ لکھا۔ حسرت صاحب نے باز پرس کی ''مولانا آپ نے نظام حیدر آباد کو حیدر آباد کا راج پرمکھ کس خوشی میں لکھا ہے۔''

جواب دیا ''مولانا' میں نے یہ طنزیہ لکھا ہے۔''

''تو پھر مولانا' حسرت صاحب نے کش لیتے ہوئے کہا ''بریکٹ میں لکھ دیا ہوتا کہ یہ طنز ہے۔''

اس دفتر میں حسرت صاحب کا جو سب سے چہیتا تھا وہ احمد بشیر تھا۔ اسی لیے سب سے زیادہ عتاب اسی پہ نازل ہوتا تھا۔ جب اس کا فیچر چھپتا تو اس کی کمبختی آ جاتی۔ لمبی پیشی ہوتی۔ حسرت صاحب فیچر میں اتنی غلطیاں نکالتے اور اتنے عیب گناتے کہ احمد بشیر کی طبیعت صاف ہو جاتی۔ کمرے سے روہانسا ہو کر نکلتا۔ پر نیوز روم میں بیٹھ کر حسرت صاحب کو گالیاں دینی شروع کرتا۔ ''بڈھے کو دیکھو ویسے نشان لگا لگا کر فیچر کو کالا کر دیتا ہے۔ مگر جب لوگ فیچر کی تعریف کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ مولانا یہ میں نے ڈکٹیٹ کرایا تھا۔'' مگر ادھر چار ساڑھے چار بجے اور رمضان نے آ کر کہا کہ صاحب یاد کر رہے ہیں۔ بس احمد بشیر کے تن بدن میں نئی زندگی دوڑ جاتی۔ اپنے کاغذ سمیٹ' بغل میں داب' تیر کی طرح نیوز روم سے نکلتا۔ پھر حسرت صاحب اسے لے کر دفتر سے نکل جاتے۔ باہر ان کا تانگہ تیار کھڑا ہوتا۔

دوسرے دن آ کر احمد بشیر بتاتا کہ رات کس بالا خانے پر جا کر کس کا گانا سنا تھا اور کیا نوش جاں کیا تھا۔ مگر اسی ہنگام طلبی ہو جاتی اور محفل شب کا سارا لطف غارت ہو جاتا۔

مگر میرا جس رفیق کار سے زیادہ پختہ یارانہ قائم ہوا۔ وہ اور ہی رنگ کا نگینہ تھا۔ حمید ہاشمی۔ سچا اور پکا کامریڈ' پارٹی ممبر ''امروز'' میں پارٹی کے مفادات کا نگہبان۔ میاں افتخار الدین کا خاص الخاص۔ عجب اور اجنبی لوگ اس سے ملنے آتے اور بالعموم رات بارہ بجے کے بعد۔ نہ مجھے کبھی تجسس ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں اور نہ اس نے کسی کے متعلق بتایا سوائے ایک کے۔ رات کی شفٹ۔ کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ ایک صاحب سوٹ بوٹ میں ملبوس۔ سر پہ ہیٹ۔ آنکھوں پر کالی عینک۔ خاموشی سے آ کر حمید ہاشمی کے قریب کرسی سرکا کر بیٹھ گئے۔ مگر ہونٹ جیسے سلے ہوں۔ آدھ پون گھنٹہ بیٹھے رہے۔ سامنے چائے کی پیالی رکھی ہے۔ ساتھ ہی پائپ سے شغل ہو رہا ہے۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حمید ہاشمی بھی ساتھ ہی نکل گیا۔ گھنٹہ بھر بعد واپس آیا۔ کاپی کو دیر ہو رہی تھی۔ فوراً اس پر جت گیا۔ جب کاتب ادھر ادھر ہوئے تو بولا ''پہچانا یہ کون صاحب تھے۔''

''نہیں۔ کون صاحب تھے۔''

''سبط بھائی۔''

''سبط حسن۔ اچھا۔ مجھ سے تعارف کیوں نہیں کرایا۔''

''پاگل ہوئے ہو۔ وہ تو ان دنوں انڈر گراؤنڈ ہیں۔''

یہ تھی سبط حسن سے میری پہلی شناسائی' اگر اسے شناسائی کہا جا سکتا ہے تو۔

حمید ہاشمی' انیس ہاشمی دونوں ہی بھائی خوب تھے۔ مفتی ہند مولانا سعید احمد دہلوی کے بھتیجے۔ تائے نے کیا قسمت پائی۔ خود مفتی ہند عالم دین۔ بھتیجے دونوں نخالص کمیونسٹ۔ دونوں پروگریسو پیپرز سے وابستہ جس کے زیر اہتمام ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' نکلتے تھے۔

''امروز'' نے اپنا ابتدائی زمانہ نسبت روڈ کے اس گوشے میں گزارا جو میکلوڈ روڈ سے متصل تھا۔ اور میکلوڈ روڈ اس زمانے میں ریڈ سکوئر کا مقام رکھتا تھا۔ ریڈ لائٹ ایریا کی اصطلاح بدنام نہ ہوگئی ہوتی تو میں اسے ریڈ لائٹ ایریا کہتا۔ یاروں نے ترقی پسند ادیبوں اور اشتراکی دانشوروں یا بائیں بازو والوں کے لیے ایک مشترکہ نام رکھ چھوڑا تھا۔ سرخا۔ تو اس کوچے میں صبح و شام وقت بے وقت رنگ رنگ کے سرخے اہلے گہلے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہاں کے چائے خانے کچھ فلمی مخلوق کے دم سے کچھ اس مخلوق کے دم سے آباد تھے۔ چار قدم کے فاصلے پر دیال سنگھ لائبریری تھی جہاں ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار مجلسیں ہوتی تھیں۔ اور ''امروز'' تو سمجھو کہ اس کوچے کے بیچ تھا۔ چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو ''امروز'' کے دفتر میں آن براجے۔ لیجیے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔

''امروز'' کی اشاعت محدود تھی۔ مگر اس کی ساکھ بہت تھی۔ اس کے دم سے اردو صحافت کا اعتبار قائم ہو چلا تھا۔ اس کے ادبی اڈیشن نے بھی خوب شہرت پکڑی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ نظم و نثر کے ذیل میں آج کے دستور کے مطابق جو اچھا برا میسر آیا چھپ گیا۔ حسرت صاحب براہ راست اس میں دلچسپی لیتے اور ٹھوک بجا کر تحریر کو دیکھتے تھے۔ اخبار ترقی پسند تھا۔ ان کا طور رجعت پسندانہ تھا۔ زبان کی صحت پہ بہت زور تھا۔ ہمعصر ادب کہ خواہ ترقی پسند ہو خواہ رجعت پسند خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کلاسیکی ادب کے متوالے تھے۔ بہر حال ایک ترقی پسند اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ سو جب تاثیر صاحب نے روزنامہ مغربی پاکستان میں ترقی پسندوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور اس تقریب سے ''امروز'' کو بھی رگیدنا شروع کیا تو حسرت صاحب نے بقدر ضرورت اپنے قلم کی نوک پر سرخی لگا کر ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بس یوں سمجھو کہ جواب میں.....

''امروز'' میں بھی ایک مورچہ قائم ہوگیا۔ لیجیے دونوں طرف سے توپیں دغنے لگیں۔ یہ منظوم معرکہ آرائی تھی۔ ایک نظم یا ہجو ''مغربی پاکستان'' میں تو دوسرے دن جوابی نظم ''امروز'' میں۔ امروز کے عملہ میں بھی ایک شاعر تھا جس نے اخبار کی اس جنگی ضرورت

کو پورا کیا۔ یہ شعیب حزیں تھے۔ مگر حسرت صاحب نے باہر سے بھی ترقی پسند شاعروں کی کمک منگوالی تھی۔ انہوں نے جان توڑ کے اس جہاد میں حصہ لیا اور جوش جہاد سے سرشار ہو کر نظمیں لکھیں۔ مگر تاثیر صاحب جو ایک شعر روانی میں لکھ گئے تھے اس کا جواب نہیں آیا۔ وہ شعر یہ تھا۔

عجیب بات وہ جنتا کا یار کہتا ہے
کہ شعر وہ ہے جو فتو لوہار کہتا ہے

لڑائی میں بڑھتے بڑھتے یہ نوبت آئی کہ حسب نسب بھی یاروں نے بکھان ڈالے۔ حسرت صاحب کے کالم نے جب یہ رنگ پکڑا تو مولانا عبدالمجید سالک فکر مند ہو کر گھر سے نکلے اور چھڑی ٹیکتے ''امروز'' کے دفتر میں آن دھمکے۔ دن بھر بیٹھے رہے اور فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیجئے شام تک سیز فائر ہو گیا۔ اگلے دن ''مغربی پاکستان'' اور ''امروز'' کے صفحات نظموں اور کالموں سے خالی تھے۔

اس وقت تک ترقی پسند بہت زوروں میں تھے۔ اور یہ ایسا زمانہ تھا جب ترقی پسند ہی نہیں پاکستان میں خالص کمیونسٹ بھی دیکھنے کو مل جاتے تھے۔ ایک ایسی شخصیت ''امروز'' کے دفتر کے آس پاس ہی دکھائی دیتی تھی۔ یہ تھے دادا منصور و دوسرے تو مارکسیت پر بحثیں کرتے تھے۔ یہ شخص اپنی قلندرانہ روش کے ساتھ خاموش اپنی دھن میں گم میکلوڈ روڈ پر گھومتا پھرتا دکھائی دیتا تھا۔ حمید ہاشمی کا گھر اس کا ٹھکانا تھا۔

مگر یہ بہار چند روزہ تھی۔ جلد ہی ایسا از غیبی گولہ پھٹا کہ پھر نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔ ایک دن صبح ہی صبح اخبار کھولا تو لیڈی کی خبر وہ تھی جو پنڈی سازش کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ خبر پڑھی کہ جرنیلوں کے ساتھ فیض صاحب بھی اس قصے میں پکڑے گئے ہیں۔

جب دفتر پہنچا تو پورے دفتر پہ ایک خوف و ہراس طاری تھا۔ اس ریلے میں جو گرفتاریاں ہوئی تھیں ان میں ''امروز'' کے ہمارے کچھ ساتھی بھی شامل تھے۔ حمید ہاشمی کو تو جانا ہی تھا۔ ظہیر بابر بھی دھر لیے گئے۔ دفتر میں کھلبلی مچ گئی۔ ایک رفیق کار نے مجھے الگ کونے میں لے جا کر رازدارانہ پوچھا ''گھر میں روسی کتابیں تو نہیں ہیں۔''

''ہاں ہیں۔ کیوں' کیا بات ہے۔''

''استاد فوراً گھر جاؤ۔ ان کتابوں کو دفع کرو۔''

''آخر وجہ؟''

''خبر یہ ملی ہے کہ ''امروز اور پاکستان ٹائمز'' میں کام کرنے والوں کے گھروں پر چھاپے مارے جائیں گے جس کے گھر سے روسی لٹریچر برآمد ہو گیا بس سمجھو اس کی شامت آ گئی۔ تو پیارے گھر میں کوئی روسی کتاب ہے تو اسے دفع کرو۔''

میں چکنم میں پڑ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ چیخوف اور تورگنیف کو کیسے دفع کروں اور کہاں دفع کروں۔

مگر اس واقعہ کے بعد ''امروز'' میں ہماری عمر بھی تھوڑی ہی رہ گئی۔ آگے انتظامیہ اور حسرت صاحب کے بیچ کوئی جھگڑا ہوتا تھا تو فیض صاحب بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرایا کرتے تھے۔ اب وہ تو تھے نہیں۔ ادھر سٹاف کو انتظامیہ سے کچھ شکایات پیدا ہوئیں۔ حسرت صاحب انتظامیہ سے بھڑ گئے۔ اور ایسے بھڑے کہ ان کے ساتھ ہم سب کے استعفوں کی نوبت آ گئی۔

ہم جب اجتماعی استعفا دے کر دفتر سے نکلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ گیٹ کے سامنے خاکساروں کا ایک دستہ قطار بنائے کھڑا ہے۔ ادھر ہم نے گیٹ سے باہر قدم رکھا ادھر وہ مستعد ہو کر چپ وراست کرنے لگے۔ ہم نے آنکھیں مل کر حیرت سے دیکھا یہ کیا یعنی چہ۔ خواجہ نذیر کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے فخر سے ہمیں بتایا کہ خاکسار تم لوگوں کو سلامی دینے آئے ہیں۔ اچھا تو یہ اپنے خواجہ کی کارستانی ہے۔ سبحان اللہ ہم نے ''امروز'' سے استعفا دے کر فلک پر کونسا تیر مارا ہے کہ خاکساروں کی سلامی کے مستحق بن گئے۔ سلامی لی تو پھر اظہار تشکر کے طور پر چھوٹی سی تقریر بھی لازم آئی۔ جب دوسرا کوئی ساتھی اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے تیار نہ ہوا تو خواجہ نے مجھے دھکیل کر آگے کر دیا۔ تو لیجیے ہم نے خاکساروں سے خطاب کیا اور پھر گھروں کو رخصت ہوئے۔

حسرت صاحب ہم سب ''امروز'' سے نکلے ہوؤں کو اس طرح ساتھ لیے شہر میں پھرتے رہے جیسے مرغی اپنے بچوں کو لے کر دانے دنکے کی تلاش میں گھورے کریدتی پھرتی ہے۔ مٹی ذرا نم دیکھی اور پنجوں سے چونچ سے کریدنا شروع کر دیا۔ بچے ارد گرد کس آس کے ساتھ اکٹھے ہو جاتے ہیں جیسے اس کوڑے کی تہہ سے اتنا کچھ نکلے گا کہ وہ نہال ہو جائیں گے۔ جب کچھ برآمد نہیں ہوتا تو مرغی پر جھاڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ بچے آئندہ کے لیے امید باندھ کر چوں چوں کرتے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ یہ گھورا نہ سہی اگلا گھورا سہی۔ ملک خدا تنگ نیست۔ کتنے سرمایہ داروں' صنعت کاروں' ناشروں کے در پہ دستک دی۔ ایک نیا اخبار نکالنے کا جو منصوبہ بنایا تھا سب کے سامنے پیش کیا۔ سب نے ہمت کی داد دی' مالی تعاون کا یقین دلایا۔

حسرت صاحب ''امروز'' سے نکلتے وقت بہت زوروں میں تھے۔ کتنے ہی دن زوروں میں رہے۔ انہیں دنوں وزارت اطلاعات کے تحت کراچی ریڈیو میں ایک رائٹرز یونٹ قائم ہوا تھا۔ حسرت صاحب کو وہاں سے بلاوے پہ بلاوہ آ رہا تھا۔ ادھر حسرت

صاحب پہ نئے اخبار کا سودا سوار تھا۔ مگر رفتہ رفتہ انہیں احساس ہوا کہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ وعدے صرف وعدے ہیں۔ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔

بس اسی ہنگام حمید ہاشمی اور ظہیر بابر رہا ہو کر نکل آئے۔ حمید ہاشمی جیل سے نکلتے ہی اپنے مشن پر نکل کھڑا ہوا۔ ہماری اس سے ایک خفیہ ملاقات ہوئی۔ یعنی میری اور امجد حسین کی۔ حمید ہاشمی نے سمجھایا پگلو یہ تو ''امروز'' کے خلاف سرکاری سازش تھی۔ تم لوگ بھولے بادشاہ۔ بھرے میں آ کر نکل کھڑے ہوئے۔ خیر تم دونوں کے متعلق میں نے میاں صاحب سے بات کر لی ہے۔ تو بس تم واپس آ جاؤ۔

میں نے امجد کی طرف اور امجد نے میری طرف دیکھا۔ میں نے رکتے رکتے پوچھا ''اور حسرت صاحب.....''

''حسرت صاحب کو بھول جاؤ۔''

مگر حسرت صاحب کو ہم دونوں بھولنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس پہ بات ختم ہو گئی۔ نہیں ختم نہیں ملتوی ہوئی۔ پھر ہمارے دوسرے ساتھیوں کو ٹوہا گیا۔ مگر کھیل ایک دفعہ بگڑ جائے پھر کہاں سنورتا ہے۔

ہاں تو حسرت صاحب کو آخر پتہ چل گیا کہ لاہور شہر اس اس بھلے زمانے کو فراموش کر چکا تھا۔ جب نامور اخبار نویس اپنی ساکھ پہ تکیہ کر کے صاحب دلوں سے اپیل کرتے تھے۔ اور چندے کی بارش ہونے لگتی تھی۔ سو اب حسرت صاحب نے کراچی سے آنے والے پیغام پر کان دھرا۔ لاہور کو سلام کیا اور کراچی کی طرف نکل گئے۔ ساتھ میں احمد بشیر کو بھی لے گئے۔ رہ گئے ہم باقی یار' تو لشٹم پشٹم سب ہی بلہ سے لگ گئے۔ میں اکیلا بھٹکتا رہ گیا۔ ایک دوپہر مال روڈ پہ بھٹکتے بھٹکتے مجھے خیال آیا کہ کتنے دنوں سے میں نے ٹی ہاؤس میں نہیں جھانکا۔ ''امروز'' کے یاروں سے ساتھ چھوٹ گیا تو ادھر چل کر دیکھیں شاید کوئی ادیب برادری کا یار مل جائے۔ چائے کی پیالی پر چار گھڑی اسی سے سنگت سہی۔ ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تو ایک میز پر نظر گئی جہاں ناصر کاظمی تھا اور ایک منحنی سی شے جسے میں نے اب سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ یہ تھا شہرت بخاری۔ اچھی صحبت رہی۔ ناصر سے اب سے پہلے جب بھی ملاقات ہوئی کافی ہاؤس میں ہوئی جہاں وہ ریاض قادر کے ساتھ بیٹھا نظر آتا تھا۔ ٹی ہاؤس میں یہ پہلی ملاقات تھی۔ جب میں وہاں سے اٹھا تو مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میں آج پکڑا گیا ہوں۔ اب اس صحبت سے چھٹکارا نہیں ہے۔

مگر حسرت صاحب کا ذکر تو پورا ہو لینے دیجئے۔ حسرت صاحب لاہور سے نکل کر کس کس دیار گئے تھے۔ کلکتہ ملایا' سنگاپور و ہر پھر لاہور و کراچی خیر کونسا ایسا دور تھا کہ وہاں سے واپس آنا مشکل ہوتا۔ رائٹر زیونٹ نے بھی کوئی ایسی زیادہ عمر نہیں پائی۔ ادھر اس کے دن پورے ہوئے' ادھر لاہور نے حسرت صاحب کو پکارا۔

اب ان کا پرانا ٹھکانا عرب ہوٹل بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ نیا زمانہ تھا۔ نیا ٹھکانا۔ روز دن ڈھلے ایک تانگہ میکلوڈ روڈ کی طرف سے آتا دکھائی دیتا۔ کافی ہاؤس کے سامنے آ کر رکتا۔ حسرت صاحب اب ہاتھ میں چھڑی رکھنے لگے تھے۔ چھڑی ٹیکتے تانگہ سے اترتے اور کافی ہاؤس میں داخل ہو جاتے۔ ایک شام کافی کا آرڈر دیا۔ مگر بیرا آرڈر لے کر ایسا غائب ہوا کہ دیر تک صورت نہ دکھائی۔ پرانا بیرا منشی قریب سے گزرا تو اس سے شکایت کی کہ آرڈر دیئے کتنی دیر ہو گئی۔ کافی نہیں آئی۔

منشی نے پوچھا' کس بیرے کو آرڈر دیا تھا۔ پھر سوچ کر بولا' وہ تو نہیں جس کے سر کے سارے بال سفید ہیں۔''

حسرت صاحب نے سگریٹ کا کش لیا اور بولے ''مولانا' جب وہ آرڈر لے کر گیا تھا اس وقت تو اس کے سر کے سارے بال کالے تھے۔''

حسرت صاحب اب ''نوائے وقت'' میں کالم لکھ رہے تھے۔ اور کس پابندی سے کالم لکھا کہ آخری دن کالم پہلے لکھا' دنیا سے کوچ بعد میں کیا۔ اگلی صبح اخبار میں انتقال کی خبر اور کالم ساتھ ساتھ چھپے۔ دوستوں اور نیاز مندوں نے پہلے ان کا کالم پڑھا' پھر جا کر انہیں کاندھا دیا۔

◆◆◆

کافی ہاؤس سے ٹی ہاؤس تک

انجمن ترقی پسند مصنفین برباد، میکلوڈ روڈ ویران، فیض صاحب ہنوز جیل میں ہیں۔ وہ پنڈی سازش کیس کے بڑے ملزموں میں شامل کئے گئے ہیں۔ جو ادیب اس ریلے میں پکڑے گئے تھے وہ چھوٹ تو گئے ہیں مگر خاموش ہیں۔ جن ادیبوں نے ترقی پسند نظریے کے خلاف علم بلند کیا تھا ان کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ ڈاکٹر تاثیر دنیا سے کوچ کر گئے۔ عسکری صاحب نے کراچی کی راہ لی۔ پہلے والا جوش وخروش غائب ہے۔ اب انہیں ادب میں جمود نظر آتا ہے۔ ترقی پسند جو میدان میں نہیں ہیں کس سے لڑیں۔ پھر ادب میں جمود تو نظر آتا ہی تھا۔

"لذت عشق گئی غیر کے مرجانے سے"

اب پاک ٹی ہاؤس کا زمانہ شروع ہونے لگا ہے۔ اس زمانے کے رستے میں آنکھیں بچھاؤ۔ اس کے جلو میں نئے لکھنے والے رنگ رنگ کے قطار اندر قطار آئیں گے۔ سو یہ ٹھکانا ادب کے باقی سب ٹھکانوں سے خواہ اس شہر میں ہوں یا اس شہر سے باہر کراچی میں ہوں یا پنڈی میں ہوں زیادہ عمر پائے گا۔ عرب ہوٹل' نگینہ بیکری' کافی ہاؤس' چائنیز لنچ ہوم' یہ تو سب بس تھوڑی تھوڑی بہار دکھائیں گے۔

کسی چائے خانے کا ادیبوں کا اڈا بننے کے لیے شاید یہ ایک شرط ہے کہ اسے کسی تعلیمی مرکز کے قریب واقع ہونا چاہیے۔ لاہور میں عرب ہوٹل کے وقتوں سے یہی ریت چلی آتی ہے۔ عرب ہوٹل ریلوے روڈ پر عین اسلامیہ کالج کے سامنے واقع ہے۔ تقسیم سے پہلے تو یہی کوچہ سب سے بڑھ کر شہر کے مسلمانوں کی تعلیمی' تہذیبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ جائے وقوع عرب ہوٹل کو لے اڑی۔ مولانا چراغ حسن حسرت' ڈاکٹر تاثیر' اختر شیرانی' کیسی کیسی ادبی شخصیت یہاں بیٹھ کر ہنگامہ آراء ہوئی۔ قریب ہی وہ تنبولن بہت ٹھسے سے بیٹھی تھی جیسے ناصر کاظمی کی روایت کے مطابق اختر شیرانی نے قلوپطرہ کا خطاب دیا تھا۔ قلوپطرہ خیر سے ذوق شعر بھی رکھتی تھی۔ اختر شیرانی سے پہلے شعر سنتی۔ پھر گلوری بنا کر چاؤ سے پیش کرتی۔

پاکستان بننے کے بعد یہ پورا کوچہ ہی پس منظر میں چلا گیا۔ اب علماء فضلاء ادباء کا مرجع پنجاب یونیورسٹی تھی۔ چار قدم پر پرانی انارکلی میں نگینہ بیکری تھی۔ بخت نے اس کے یاوری کی۔ علما فضلا نے اسے اپنا اڈا بنالیا۔ مگر اس سے آگے تھوڑے فاصلہ پر انڈیا کافی

ہاؤس تھا۔ کشش اس طرف زیادہ تھی۔ سونگینہ بیکری تو بس چند بزرگ پروفیسروں ہی کا دل جیت سکی۔ ساری نئی دانش کو کافی ہاؤس نے لپک لیا۔ نئے مصوروں نے خاص طور پر اسے اپنا اڈا بنایا۔ سیاست کا چسکا رکھنے والے لوگ' نوجوان پروفیسر' صحافی' نئے دانشور' باری باری سب نے آ کر یہاں ڈیرا کیا۔ شاکر علی جب اس شہر میں وارد ہوئے تو پہلے پہل یہیں آ کر براجے۔ یہیں پاکستان کی تجریدی مصوری نے آنکھ کھولی۔

ریاض قادر دان کے ساتھ ناصر کاظمی۔ جب وہاں جھانکو یہ دونوں موجود۔ ریاض قادر کی چڑ دو چیزیں تھیں۔ ایک ان کا گنجا سر' دوسرے ان کے والد گرامی سر شیخ عبدالقادر جس نے ان دو میں سے ایک کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ کر دیا اس کی کمبختی آ گئی۔ یعنی کسی کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ ان کا تعارف سر شیخ عبدالقادر کا نور نظر بنا کر کرائے۔ باقی گنج کا معاملہ یہ تھا کہ گورے چٹے آدمی تھے۔ مگر گورے چہرے سے زیادہ ان کی صفاچٹ چاند چمکتی تھی۔ بس انہیں شک ہو جائے کہ کسی نے ان کے سر کی طرف دیکھا ہے' پھر اس کی خیر نہیں تھی۔ ہمہ داں قسم کے دانشور تھے۔ جو موضوع زد میں آ گیا اس پر رواں ہو گئے۔ بس پھر وہی بولتے تھے۔ دوسرے صرف سنتے تھے۔ دوسرا کوئی نہ بیچ میں بول سکتا تھا نہ بیچ میں سے اٹھ کر جا سکتا تھا۔ بے شک پورا پہر گزر جائے۔ کوئی کسمسا کر اٹھنے کی کوشش کرتا تو برہمی سے کہتے کہ صاحب فقرہ تو پورا ہو لینے دیجئے۔ مگر دقت تو یہی تھی کہ ان کا فقرہ کبھی پورا ہوتے نہیں دیکھا گیا۔

کافی ہاؤس آنے جانے والوں میں ایک نگ لکھنو کا بھی تھا۔ وہ پہلے ناصر کاظمی کے مداح بنے۔ اس کے واسطے سے ریاض قادر سے شناسائی ہوئی۔ دفتر قریب ہی تھا۔ لنچ کے اوقات میں کافی ہاؤس آتے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ناصر اور ریاض قادر کی صحبت کا لطف اٹھایا اور واپس اپنے دفتر۔ ایک بار یوں ہوا کہ وہ آئے تو اکیلے ریاض قادر بیٹھے تھے۔ ایک سامع میسر آیا تو وہ رواں ہو گئے اور ایسے رواں ہوئے کہ لنچ کا دفتری وقفہ گزر گیا اور وہ نہ تھمے۔ یہ صاحب ایک تو لکھنو کی وضعداری کے مارے ہوئے۔ پھر ریاض قادر کا رعب۔ اور فقرہ تھا کہ پورا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک بجے وہ یہاں آئے تھے۔ اب ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اتنے میں ناصر کا ورود ہوا۔ لکھنوی دوست نے ناصر کو دیکھ کر ضبط کا دامن چھوڑا۔ کھڑے ہوتے ہوئے روہانسی آواز میں بولے "ناصر صاحب' ہمارا دفتر کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ اور ادھر قبلہ کا فقرہ مکمل نہیں ہو پا رہا۔"

کافی ہاؤس ہی کے ایک گوشے میں ناطق صاحب بیٹھے نظر آتے تھے

ناطق کہ سخن تیرا ہے تریاق تریہا
زمباق تریہا لک بمباق تریہا

نواب ناطق نے اپنا شجرہ نسب یوں بتایا تھا کہ وہ غالب کے بھائی کی پڑپوتی کی بیٹی کے نور نظر ہیں۔ کافی ہاؤس میں ڈیرا چلا آ رہا

تھا۔ وقتاً فوقتاً ریاض قادر کے ساتھ بھی بیٹھے نظر آتے۔ جب کافی ہاؤس کا نگراجڑا تو وہاں سے ہجرت کی اور ٹی ہاؤس میں آ کر ڈیرے ڈالے۔ اس وقت ٹی ہاؤس میں نئی لسانی تشکیلات کی تحریک چل رہی تھی۔ مگر شاعری میں نئی لسانی تشکیلات کو سمونے کی ساری ذمہ داری دو شاعروں نے سنبھال رکھی تھی۔ ظفر اقبال نے اور افتخار جالب نے۔ نواب ناطق کے ٹی ہاؤس میں آ جانے سے یار و اغیار نے حوصلہ کیا اور ان کی شاعری کو نئی لسانی تشکیلات کی نمائندہ شاعری کے طور پر سننا اور سنانا شروع کر دیا۔

نواب ناطق نے ایک اعلان کیا۔ میز پر مکا مار کر کہا کہ آئن سٹائن کو نہیں مانتا۔ کیوں نہیں مانتے۔ کوئی دلیل؟ بولے کہ نظریہ اضافیت پر میں نے بھی کہا ہے۔ عرض کرتا ہوں۔

آشنا ہم بھی بسیط کار انبائے فضا
مخل اندام خلل ہیں تخلیہ سے خام کے

کتنی واضح بات ہے۔ آئن سٹائن بلاوجہ بات کو الجھا دیتا ہے۔

میں نے پوچھا ''آپ اپنے بزرگ غالب کو تو مانتے ہیں نا۔''

بولے کہ ''مانتا ہوں۔ کیا خوب شعر کہا ہے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اولیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ بعض نسخوں میں؟ اولئیم' لکھا ہے۔''

بولے کہ ''غلط لکھا ہے۔ یہ اولیم ہے۔ یعنی اولین۔ یعنی پہلا سوال۔ یعنی بنیادی سوال یہ ہے کہ.....''

پھر غالب کے رنگ میں غالب سے بڑھ کر جو انہوں نے شعر کہا تھا وہ سنایا

گل گل لالہ گلزار چمن گلفام سے جاڑا گلابی تھا
گل گلدستہ گل گلزار تھا رنگ گلابی رنگ گلشن کا

بس پھر چل پڑے۔

فضولیات زمانہ تری طرح ہم بھی
جو آ سکے نہ خیالوں میں خام لاتے ہیں

وہ کہ شاعر ہوا ہے اور فن کار
اب وہ ناطق نواب کیا ہوگا

زاہد خشک میکشاں سے ہے
تجھ کو مے نوش تر پکارتے ہیں

جو مل جائے شیطان مجھ کو کہیں بھی
کروں خوب اس کی میں ایسی کی تیسی

نواب ناطق سے جب نئے سماجی شعور اور ترقی پسند شاعری کا ذکر کیا جاتا تو بھڑک اٹھتے۔ کہتے کہ ''ہم سے سنو۔ کیسا کس کر ہم نے آج کے معاملات کو باندھا ہے۔

نہ نمبر ایک آتی ہے نہ نمبر دو ہی آتی ہے
بسوں نے ایسی بس کی ہے کہ بس توبہ بھلی بس سے

سنڈے کے رز منڈے یا رب منائیں گے ہم
کام ہر بہانے حیلے اپنا بنائیں گے ہم
چھٹی تو روز ہی ہے چھٹا فقط ہے اک دن
کام چھٹی کے روز کر کے چھٹا بڑھائیں گے

پروا نہیں ہے گر جیب ہو جائے ساری خالی
معشوق ناز نخرے سر پر اٹھائیں گے ہم

مگر مقطع تک پہنچتے پہنچتے نواب صاحب غم روزگار سے زقند لگا کر پھر غم عشق پر آ گئے

تکیہ پہ سر رکھ کر ناطق سو گیا یہ کہہ کر
یہ داستان عاشق کبھی پھر سنائیں گے ہم

کسی نے پوچھا ''فیض صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' کہا کہ ''شریف آدمی ہے۔ میرا بہت مداح ہے۔''

افتخار جالب کے متعلق پوچھا تو کہا ''ہونہار نوجوان ہے۔ کئی مرتبہ کہا کہ میاں کچھ سناؤ۔ مگر وہ میرے سامنے سناتے ہوئے شرماتا ہے۔''

ٹی ہاؤس کے سارے بیرے نواب صاحب کے مداحین میں شامل تھے۔ الٰہی بخش بیرے نے فرمائش کی کہ نواب صاحب میرے لیے بھی کچھ کہہ دیں۔ نواب صاحب نے برجستہ کہا۔

بخش الٰہی بخش دے میرے الٰہی بخش کو
بھول جائے تا زمانہ سب پرانے نقش کو

کافی ہاؤس کے بیروں میں دو اپنی جگہ منفرد تھے۔ شرافت اور منشی۔ شرافت صاحب استاد۔ منشی صاحب ان کے شاگرد تھے۔ دونوں کو ریاض قادر اور ناصر سے ربط خاص تھا۔

شرافت سے میرا تعارف ناصر نے کرایا ''یہ انتظار حسین ہیں۔ ''امروز'' میں کام کرتے ہیں۔''

''اچھا تو عقیلہ خالہ آپ کا افسانہ ہے۔''

یہ افسانہ اسی مہینے ''ماہ نو'' میں چھپا تھا۔

میں نے رائے پوچھی تو مسکرائے اور پانی سامنے رکھ کر خاموش واپس چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد کافی لے کر آئے۔ پیالیاں چنتے ہوئے بولے ''انتظار صاحب' یہ جو آپ نے زبان لکھی ہے یہ ہمارے رامپور میں قصائنیاں بولتی تھیں۔ کبھی شریف زادیوں کی زبان بھی لکھ کر دکھایئے۔''

دوسرا پھیرا کیا تو بولے ''یہ جو آپ کے ''امروز'' کے پہلے صفحہ پر فیض صاحب کی نظم شائع ہوئی ہے ویسے تو اچھی ہے۔ مگر ان سے ایک گزارش کیجئے۔''

''کیا''

''یہی کہ نظم لکھنے کے بعد نظر ثانی کر لیا کریں تو بہت اچھا ہو۔''

''بہت اچھا''

''کبھی کبھی سقم رہ جاتا ہے۔''

جب انڈیا کافی ہاؤس ڈیلن کافی ہاؤس بن گیا تو شرافت صاحب یہاں سے اکھڑ لیے۔ کافی ہاؤس کے باہر مال روڈ کے فٹ پاتھ پر میری ان سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ بولے ''انتظار صاحب ہم جا رہے ہیں۔''

''کہاں''

''دلی کے کافی ہاؤس میں ہم نے اپنا تبادلہ کرا لیا۔''

''شرافت صاحب کیوں جا رہے ہیں آپ۔''

''انتظار صاحب' بات یہ ہے کہ لوگ تو اچھے ہیں۔ مگر یہاں ہمارا کلچر نہیں ہے۔''

شرافت کے جانے کے بعد ریاض قادر اور ناصر کو منشی پر قناعت کرنی پڑی۔ موصوف بھی خوب تھے۔ مگر استاد کی بات اور تھی۔

کافی ہاؤس کے متصل چائنیز لنچ ہوم تھا۔ دیوار سے دیوار ملی ہوئی۔ دروازے سے دروازہ بھڑا ہوا۔ چائنیز کو کافی ہاؤس کا ضمیمہ جانو۔ کافی ہاؤس کا چائنیز کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ کافی ہاؤس میں فون نہیں تھا۔ سو ہر کافی ہاؤس والا فون کے سلسلہ میں چائنیز کا محتاج تھا۔ پھر کافی ہاؤس میں تو بس ڈرائی لنچ ہو سکتا تھا۔ اور رات کو وہ نو بجے کے لگ بھگ بند ہو جاتا تھا۔ سو کافی ہاؤس کے نشئی اپنا نشہ پورا کرنے کے لیے اس چائے خانے کے محتاج تھے۔ سو اگر چائنیز والوں سے پوچھا جاتا کہ آپ کے یہاں خاص بیٹھنے والے کون تھے تو وہ وہی نام گناتے جو کافی ہاؤس سے منسوب تھے۔ یہ 1981ء کا ذکر ہے۔ چائنیز کے ویران ہوتے نقشہ کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں اس ہمارے پرانے ٹھکانے کا بھی چل چلاؤ تو نہیں ہے۔ سو میں نے سوچا کہ کیا مضائقہ ہے کہ عبدالمجید صاحب سے جو یہاں کے مالک اور منیجر تھے ذرا تبادلہ خیال کر لیا جائے۔ کیا خبر ہے کہ کب یہ بساط الٹ جائے۔

جب یہاں بیٹھنے والوں کا ذکر آیا تو انہوں نے سب سے پہلے عبداللہ بٹ اور شورش کاشمیری کو یاد کیا۔ اور یہ دونوں نام کافی ہاؤس کے ساتھ بھی لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔

''اور کون کون لوگ یہاں بیٹھتے تھے۔''

''حمید نظامی مرحوم' میر خلیل الرحمن' آقا بیدار بخت' شاکر علی' انور جلال شمزا' استاد امانت علی' سیف الدین سیف' ناصر کاظمی۔''

پرانے وقتوں کا بیرا حنیف ہماری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھرا ''بس جی ناصر صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ جب

وہ اور آپ لوگ یہاں پہ آیا کرتے تھے۔" اس فقرے کے ساتھ ہی میرے ذہن نے بھولے بسرے دنوں میں زقند لگائی۔ گرمی کی دوپہر تو بالعموم یہیں گزرتی تھیں۔ سب ہی یاروں کو اس میں سہولت تھی۔ چائنیز کی بالائی منزل میں کتنے ہی خاموش گوشے تھے۔ کسی بھی گوشے میں بیٹھ کر ہمارے شیخ صلاح الدین بے تکان فلسفہ پر گفتگو کر سکتے تھے۔ ناصر فلسفہ پر اس گفتگو کے بیچ اطمینان سے سو سکتا تھا۔ حنیف رامے آنکھیں موند کر انگشت شہادت کو گھما کر ہوا میں عورت کا پیکر تراش سکتا تھا۔

مگر اب تو چائنیز کا ہر گوشہ ہی خاموش تھا۔ چائنیز کی گہما گہمی کافی ہاؤس اپنے ساتھ لے گیا۔ کافی ہاؤس بند ہوا تو اس کے باسی پھر اس کوچے ہی سے نکل گئے۔ کافی ہاؤس میں تالا پڑ گیا۔ چائنیز ویران ہو گیا۔

مگر پھر یوں ہوا کہ مبارک احمد نے جب اپنا ڈیڑھ اینٹ کا حلقہ ارباب ذوق الگ بنایا تو اس کے جلسے یہاں کرنے شروع کیے۔ میں نے کہا "حمید صاحب ادیب تو ماشاء اللہ یہاں پھر جمع ہونے لگے ہیں۔ جمعہ کے جمعہ محفل سجاتے ہیں۔"

بولے "وہ جو پہلے بیٹھتے تھے وہ قد والے لوگ تھے۔" پھر سوچ کر بولے "کیا خبر ہے آگے چل کر یہ بھی قد نکال لیں۔"

"پرانے بیٹھنے والوں نے یہاں بیٹھنا کیوں چھوڑ دیا۔"

"بہت سے لوگ اونچے چلے گئے۔ پھر وہ یہاں کیسے بیٹھتے۔ آپ بھی تو ٹی ہاؤس اور چائنیز دونوں جگہیں چھوڑ کر لارڈز میں جا بیٹھے تھے۔"

"مگر ہم تو پھر واپس آ گئے تھے۔"

"ہاں مگر بعض لوگ واپس نہیں آئے۔"

"اب یہاں باقاعدگی سے بیٹھنے والے لوگ کون ہیں۔"

"ستم رسیدہ لوگ۔ ہارے ہوئے لوگ۔"

"مثلاً۔"

"مثلاً یہ کہ پی آئی اے کی یونین جو گروپ الیکشن ہار جاتا ہے وہ ہار کر یاں آ بیٹھتا ہے۔ جب اگلی بار الیکشن جیت لیتا ہے تو وہ چلا جاتا ہے۔ ان کی جگہ ہارے ہوئے لوگ آن بیٹھتے ہیں۔ آج کل یہاں پاپولیشن پلاننگ کے لوگ بیٹھتے ہیں۔"

مگر تھوڑے ہی دنوں بعد چائنیز لنچ ہوم خود ہار گیا۔ ویسے تو پہلے ہی ہارا ہوا نظر آتا تھا۔ مگر اب آخری گھڑی آن پہنچی تھی

"آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا"

کافی ہاؤس پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ اب اس کا ہمزاد بھی بند ہو گیا۔ اور وہ جو سامنے سڑک کے پار ڈین ریستواں ہوا کرتا تھا اور تھوڑے عرصے ادیبوں کا اڈا بنا رہا تھا وہ بھی زمانہ ہوا بند ہو چکا تھا۔ کیا زمانہ تھا کہ ادیبوں کی طبعیت میں ان دنوں قرار نہیں تھا۔ ایک چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے اکتائے۔ اٹھ کر دوسرے میں جا بیٹھے۔ دوسرے سے اکتائے' تیسرے میں جا کر چائے کا آرڈر دیا اور محفل جمالی۔ مگر زمانہ ظالم ہے۔ یہ کوچہ جو چائے خانوں کا کوچہ تھا اب ویران ہے۔ سب چائے خانے بند ہو گئے سوائے ایک کے۔

سو صاحبو یہ پاک ٹی ہاؤس ہے۔ وائی ایم سی اے کی عمارت کا عقبی گوشہ۔ مال روڈ کے متصل نیلا گنبد کے دہانے پر ایک مختصر سا اجڑا اجڑا چائے خانہ۔ شہر کے ادیبوں کا آخری اڈا۔

پاک ٹی ہاؤس آگے انڈیا ٹی ہاؤس تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی اچھے خاصے دنوں تک انڈیا ٹی ہاؤس رہا۔ پھر ایک دن انڈیا ٹی ہاؤس کا بورڈ اتر گیا۔ پاک ٹی ہاؤس نیا نام رکھا گیا۔ نیا نام اسے راس آیا۔ پھر یہاں بیٹھنے والے ادیبوں کی نفری بڑھتی ہی چلی گئی۔ گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونورسٹی سے قرب اپنی جگہ مگر زیادہ فیض اس نے حلقہ ارباب ذوق سے حاصل کیا۔ اتوار کی اتوار حلقہ کا جلسہ وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں۔ اس کے بعد چندے کی چائے ٹی ہاؤس میں۔ قیوم نظر' شیر محمد اختر' انجم رومانی' شہرت بخاری' ریاض احمد' اعجاز حسین بٹالوی' ضیاء جالندھری' امجد الطاف۔ کیا کیا دانہ حلقہ کی محفل سے اٹھ کر آتا اور یہاں چائے کی میز پر آ کر پھر سے رواں ہو جاتا۔ ہاں یہاں یوسف ظفر اور مختار صدیقی بھی تو دیکھے جاتے تھے۔ مگر انہیں تو پنڈی چلے جانا تھا۔

تو یہ ہوئے پاک ٹی ہاؤس کے پہلے آباد کار اس کے بعد تو قافلے آتے ہی چلے گئے۔ خیر پہلے تو زیادہ تر اتوار کی شام ہی کو یہاں ادیب حلقہ کے بہانے نظر آتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ اس دن کی قید ختم ہوتی چلی گئی۔ اتوار کے سوا بھی یہاں ادیب وقت بے وقت دیکھے جانے لگے۔ اور جب ناصر کاظمی نے کافی ہاؤس میں ریاض قادر کی صحبت کو سلام کر کے یہاں بیٹھنا شروع کیا تو وقت اور دن کی سرے سے کوئی قید ہی نہ رہی۔ صبح کے وقت جھانکو تو ناصر کاظمی۔ دوپہر کو جاؤ تو ناصر کاظمی۔ شام کو رات کو جب بھی ٹی ہاؤس میں جس نے بھی جھانکا ناصر کاظمی کو موجود پایا۔ گرد یار اکٹھے ہیں۔ کوئی مداح' کوئی ہمعصر شاعر مداح بس ناصر کو سننا چاہتے ہیں۔ جو شاعر ہیں وہ ناصر کو سننے کے بہانے اپنی غزل بھی سنانے کے درپے ہیں۔

زمانہ بدلتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ قیوم صاحب نے اب اپنے نیکر کو تیاگ دیا ہے اور بجلی کے محکمہ کو بھی۔ اب وہ پتلون پہنتے ہیں اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کرتے ہیں۔ اردو پڑھاتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں ان کے پہنچنے سے گورنمنٹ کالج اور ٹی ہاؤس کے درمیان ٹریفک بہت بڑھ گیا ہے۔ کیسا کیسا دانہ ان کے واسطے سے گورنمنٹ کالج سے نکل کر حلقہ میں اور پھر ٹی

ہاؤس میں پہنچا۔ گورنمنٹ کالج میں طالب علم ٹی ہاؤس میں آ کر ادیب۔ مگر جنہیں یہاں پہنچنا تھا وہ قیوم صاحب کے واسطے کے بغیر بھی یہاں پہنچ گئے۔ اس وقت گورنمنٹ کالج میں ادب کا چرچا بہت تھا۔ ویسے تو ان کی اپنی مجلس اقبال تھی۔ اور اس کی کیا پر رونق محفلیں ہوتی تھیں۔ مگر اولوالعزم طلباء کو یہ میدان اپنی تگاپو کے لیے چھوٹا نظر آتا تھا۔ وہ وہاں سے نکلتے اور ٹی ہاؤس کا رخ کرتے۔ مظفر علی سید ان دنوں گورنمنٹ کالج کے دانشور نمبر ایک کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وہ کتابوں سے لدا پھندا ٹی ہاؤس میں داخل ہوا اور اپنے لشکریوں سمیت ناصر کاظمی کی میز پر آن براجا۔ اس کے لشکریوں میں اس وقت سب نے بڑھ کر غالب احمد اور شاہد حمید تھے۔ باقی حنیف رامے کو وہ ابھی گود میں کھلا رہا تھا۔ بعد میں اس نوجوان کو بھی ناصر کاظمی ہی کے حلقہ میں شامل ہونا تھا۔ مگر مظفر کو اس وقت یہ کب خبر تھی کہ ناصر کے حلقہ میں پہنچ کر حنیف کو ایک اور ہی مرشد میسر آ جائے گا اور پھر وہ مظفر کے رشد و ہدایت سے بے نیاز ہو جائے گا۔ ہاں ایک اور دانہ کسی اور سمت سے شاید مظفر ہی کے واسطے سے یا شہزاد احمد کے واسطے سے ٹی ہاؤس میں داخل ہوا۔ یہ احمد مشتاق تھا۔ اس نے بھی ناصر کاظمی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی عمارت بیٹھ جانے کے بعد جو ادیب گھر سے بے گھر ہوئے اور ان کے اپنے کوچے میکلوڈ روڈ کی زمین ان پر تنگ ہو گئی تو ان میں سے کتنوں نے اس کوچے سے نکل کر ٹی ہاؤس میں پناہ لی۔ ان کی بھی یہاں جلدی ہی آبادکاری ہو گئی۔ احمد راہی یہاں ایسے رسے بسے جیسے شروع سے اسی کوچے کے باسی تھے۔ اے حمید کچھ اس رنگ سے یہاں آ کر آباد ہوئے کہ چائے کی میز سے اٹھ کر کاؤنٹر پہ جا کر کھڑے ہوئے اور کسٹمروں کے بل بنانے لگے۔ بات یہ تھی کہ اس زمانے میں ٹی ہاؤس کے جو منیجر تھے علیم صاحب وہ اپنے یہاں بیٹھنے والے کسی ادیب کو پریشان حال نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پریشان حال آزاد منش ادیبوں کے ساتھ خصوصی رعایات برتی جاتی تھیں۔ اگر کوئی ادیب کاؤنٹر پر کھڑا بل بناتا نظر آتا تو اس سے یار یہی مطلب نکالتے تھے کہ ٹی ہاؤس اس ادیب کی کچھ مدد کرنا چاہتا ہے۔ اس قسم کا فریضہ یہاں چند دنوں کے لئے انور جلال شمزا نے بھی انجام دیا تھا۔

ٹی ہاؤس شروع ہی سے اس قسم کا چائے خانہ چلا آتا ہے جو ہر چند کہ مال روڈ کے نکڑ پہ آباد ہے۔ مگر مال روڈ کے ریستوراں والے تکلفات یہاں کبھی نہیں دیکھے گئے۔ اور ڈنر اور لنچ پہ نیپکن کا اہتمام' یہ تو یہاں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اعجاز حسین بٹالوی لنچ کے اوقات میں ہائیکورٹ سے نکل کر یہاں پہنچتے۔ کھانے کا آرڈر دیتے۔ بابو بیرا پہلے ایک نیپکن لے کر حاضر ہوتا۔ پھر کھانا سرو کرتا۔ سوئے اتفاق سے انہیں اوقات میں احمد مشتاق اپنے چارٹرڈ بینک سے نکل کر یہاں آتا اور کھانا کھاتا۔ وہ کتنے دنوں تک اپنی میز سے یہ منظر دیکھتا رہا کہ بابو کھانا لگانے سے پہلے بڑے اہتمام سے ان کے لیے نیپکن لے کر آتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا خون

کھولتا رہا۔ ایک دوپہر کو یہ ہوا کہ اس نے میز پر بیٹھتے ہی بابو کو آواز دی۔ کھانے کا آرڈر دیا۔ کھانا آیا تو کہا۔ ''نیپکن کہاں ہے؟ نیپکن لے آؤ۔''

بابو حیرت سے احمد مشتاق کا منہ تکنے لگا۔ ''نیپکن؟''

''ہاں نیپکن'' مشتاق نے آواز میں زور پیدا کر کے کہا۔

''مشتاق صاحب جی' نیپکن تو نہیں ہے۔''

''ہے کیسے نہیں۔ جاؤ نیپکن لے کے آؤ۔''

بابو حیران و پریشان کاؤنٹر پہ پہنچا اور سراج صاحب سے کہا ''مشتاق صاحب جی نیپکن مانگ رہے ہیں۔''

''نیپکن مانگ رہے ہیں؟ اچھا!''

سراج صاحب آدمی شناس تھے۔ اپنے یہاں بیٹھنے والے ادیبوں کے مزاجوں کو خوب سمجھتے تھے۔ فوراً ہی بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ اٹھ کر مشتاق کی میز پر گئے ''مشتاق صاحب' آپ کو پتہ ہے کہ ٹی ہاؤس میں ہم نے نیپکن کا اہتمام کبھی نہیں کیا۔''

''پھر یہ اعجاز صاحب کے لیے خصوصی اہتمام کیوں ہے۔''

''وہ اعجاز صاحب کا اپنا انتظام ہے ہمارا اس نیپکن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

مگر مشتاق اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے کھانے کا آرڈر منسوخ کیا اور بھوکا واپس بینک چلا گیا۔

پتہ نہیں بعد میں اس نیپکن کا کیا ہوا۔ اعجاز صاحب نے تو بھٹو صاحب کا مقدمہ ہاتھ میں لینے کے بعد ٹی ہاؤس آنا چھوڑ دیا تھا۔

ارے یہ تو میں بہت آگے کے زمانے میں نکل آیا۔ میں تو ابھی ٹی ہاؤس کے دور اول کو یاد کر رہا تھا۔ اس وقت ٹی ہاؤس میں تین شاعروں کا دور دورہ تھا۔ ایک تو قیوم نظر آتے تھے۔ ٹی ہاؤس میں داخل ہو کر پہلے کاؤنٹر پہ کھڑے ہوتے اور کسی نہ کسی بہانے قہقہہ لگاتے۔ ایسا قہقہہ کہ پورے ٹی ہاؤس کو پتہ چل جاتا کہ قیوم صاحب آ گئے ہیں۔

دوسرا شاعر ناصر تھا۔ اس کی امت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور قیوم صاحب کی تشویش بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

تیسرا شاعر باہر سائیکل سٹینڈ پر کھڑا تھا۔ میں ان دنوں سائیکل پہ آتا جاتا تھا۔ اور سائیکل کو ٹی ہاؤس کے سٹینڈ پر رکھ کر ناصر کے ساتھ پیادہ پائی کے چکر میں ایسا بھولتا تھا کہ اکثر اوقات بالا ہی بالا گھر کی طرف ہو لیتا۔ یہ بیدل جالندھری کا فرض تھا کہ وہ میری سائیکل کا خیال رکھے اور اگر میں رات کو وہیں چھوڑ دوں تو وہ اسے اندر سنبھال کر رکھے۔ بیدل جالندھری منحنی سا نوجوان تھا۔ سانولی

رنگت' پستہ قد' خاموش طبیعت۔ شعر کہتا تھا اور اکثر مجھے سناتا تھا اور داد پاتا تھا۔ اب میں روزنامہ ''آفاق'' سے منسلک ہو چکا تھا۔ ایک دن کالم میں میں نے ناصر کی غزل کا ذکر کیا۔ شام کو ٹی ہاؤس پہنچا تو دیکھا کہ بیدل جالندھری کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ سیدھے منہ بات نہیں کر رہا۔ میں نے مزاج پوچھا تو بگڑے لہجہ میں بولا ''انتظار صاحب' آپ کو پتہ ہے کہ میں ناصر صاحب سے اچھی غزل کہتا ہوں۔ آپ نے اخبار میں میری غزل کا تو کبھی ذکر نہ کیا۔ ناصر صاحب کی ایسی کمزور غزل کی اتنی تعریف کر ڈالی۔''

میں نے بیدل جالندھری کی بہت للو چپو کی۔ لیکن دل سو اشیشے سے نازک' دل سے نازک خوئے دوست۔ بیدل کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اسے مجھ سے جو شکایت پیدا ہو گئی تھی وہ پھر کسی طور دور نہیں ہوئی۔ ویسے اور دوستوں کو بھی کچھ اسی قسم کی شکایت پیدا ہوئی تھی۔ خاص طور پر ناصر کے اس خاکہ کے بعد جو انہیں دنوں ''نقوش'' میں چھپا تھا۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ ٹی ہاؤس میں سب اچھا نہیں ہے۔ یوں گھل مل کر بیٹھتے ہیں۔ شعر سنتے ہیں سناتے ہیں۔ داد دیتے ہیں' داد پاتے ہیں۔ مگر در پردہ رقابتیں بھی چل رہی ہیں۔

شعر سننے سنانے کی صورت یہ تھی کہ ادھر ناصر نے سگریٹ سلگانے کے بعد چائے کا گھونٹ لیا' ادھر کسی نے سوال داغا ''ناصر صاحب' کوئی تازہ غزل ہوئی۔''

ان دنوں ناصر کی طبعیت مستقل رواں رہتی تھی۔ اطمینان سے گھر بیٹھیں تو قلم کاغذ سنبھالیں اور غزل قلمبند کریں۔ جب طور یہ ہو کہ ابھی کافی ہاؤس میں بیٹھے ہیں۔ وہاں سے اٹھے تو چائنیز میں چائنیز سے نکلے تو ٹی ہاؤس میں۔ اس عالم میں یہی ہوتا تھا کہ شعر وارد ہو رہے ہیں اور انہیں سگریٹ کی ڈبیا پھاڑ کر الٹی طرف لکھا جا رہا ہے۔ جیب میں ڈبیوں کے ٹکڑے اور پنی پر سے اتارے ہوئے کاغذ بھرے رہتے تھے۔ فرمائش پر یہ پرزے جیب سے نکلتے اور غزل سنائی جاتی۔ پھر اللہ دے اور بندہ لے۔ پتہ چلتا کہ اس عاجز کے سوا سب ہی شاعر ہیں۔

شعر سننا سنانا تو ہوا۔ مگر ان دنوں ایک اور مشغلہ زوروں پر تھا۔ کیسا کیسا فاضل اجل ٹی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ مظفر بغل میں اتنی کتابیں داب کے لاتا تھا کہ اس کا پاؤں بھاری رہنے لگا تھا۔ پھر شیخ صلاح الدین جو خود بہت بھاری تھے۔ کتابوں کے بوجھ نے انہیں مزید بھاری بنا دیا تھا۔ زبان میں تھوڑی لکنت تھی۔ لیکن فلسفہ کے موضوعات پر کس روانی سے بولتے تھے۔ فلسفہ تو یوں سمجھو کہ ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ اس لونڈی کو وہ ہماری مالکن بنانے کے درپے تھے۔ انہیں ہمارے حال پہ بہت افسوس ہوتا تھا کہ ہم ادب کے الجھیڑے میں اپنی عمر ضائع کر رہے ہیں۔ فلسفہ سے بے بہرہ ہیں۔ ویسے میں نے تو صاف لفظوں میں اپنی جہالت کا اعتراف کر لیا تھا ''شیخ صاحب فلسفہ کا مضمون آپ کا ہے۔ میں فلسفہ کے نام صفر ہوں۔ یہ مضمون میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''کیسے باہر ہے۔'' اور انہوں نے دوسرے ہی دن وائٹ ہیڈ کا ایک لیکچر میرے حوالے کیا ''اسے پڑھو۔''

اسے پڑھ کر میرا وہ حال ہوا جیسے کوئی دیہاتی شہر میں آ کر پہلی مرتبہ فلم دیکھے اور مبہوت رہ جائے۔ میں نے ایک سانس میں وائٹ ہیڈ کی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ شیخ صاحب میری پروگریس پہ بہت خوش تھے۔ ادھر ناصر نے احمد مشتاق کے ایک شعر میں تھیل کا فلسفہ دریافت کر کے یاروں کو حیران کر دیا۔ شیخ صاحب کو اس پر کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ مگر اسے خالی اپنے درس کا کمال نہیں جانتے تھے۔ ناصر کے متعلق ان کا خیال تھا کہ گھنا آدمی ہے۔ بہت سا علم اپنے اندر چھپائے بیٹھا ہے۔ جیسے پرانے زمانے میں بڑے صوفیا کا طریق تھا کہ اپنی ذات میں علم باطنی کا سمندر ہیں مگر گلی کے نکڑ پر بیٹھے جوتیاں گانٹھ رہے ہیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ نرے موچی ہیں۔ ناصر کی شاعری کا مشغلہ شیخ صاحب کی نظروں میں کچھ اسی قسم کا کاروبار تھا۔

خیر جلدی ہی ہماری منڈلی میں ایک ایسا نوجوان آ گیا جس نے فلسفہ کا بار امانت سارے کا سارا اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ شیخ صاحب ایسے ہی کندھوں کی تلاش میں تھے۔ اب سے پہلے میں نے اس نوجوان کو اس رنگ سے دیکھا تھا کہ مال روڈ کے فٹ پاتھ پر ایک پیپل کے درخت کے تنے سے کمر ٹکائے کھڑا ہے۔ نظریں سامنے سڑک پر گزرتی سائیکل سوار لڑکیوں پر جمی ہیں۔ پھر خلا میں تکنے لگتی ہیں۔ پھر انگشت شہادت بلند کر کے اس طرح گردش دیتا ہے جیسے ہوا کے کینوس پر نسوانی پیکر بنا رہا ہے۔ اس کا نام حنیف تھا۔ جلدی ہی اس نام کے ساتھ اس نے رامے کا لاحقہ جوڑ لیا۔

حنیف رامے ویسے تو ایک نئے مصور کے طور پر ابھر کر سامنے آیا تھا مگر ہماری منڈلی میں آ کر اسے جلدی ہی شیخ صاحب کی نگرانی میں فلسفہ کی ذمہ داریاں بھی سنبھالنی پڑیں۔ یہ مظفر علی سید کے حقوق اور اختیارات پر ڈاکہ زنی کے واردات تھی۔ آخر مظفر کے ناخنوں میں بھی تو علم بھرا پڑا تھا۔ یہ علم بھی نئے سینوں اور نئے دماغوں میں منتقل ہونے کے لیے بیتاب تھا۔ یوں گورنمنٹ کالج کے ذہین نوجوان وہ جنہیں مصوری شاعری یا کسی بھی فن سے شغف تھا مظفر کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ مگر مرشد ہر مرید پر تکیہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے تو گنے چنے تھے جو مرشد کی تربیت سے فیض یاب ہو کر بار امانت اٹھانے کے متحمل ہو سکتے تھے۔ مگر ان سالکوں کی نظریں اب کہیں اور تھیں۔ غالب احمد پہلے ہی شیخ صاحب کے ہاتھ پہ بیعت کر چکا تھا۔ اب حنیف رامے نے بھی مظفر سے منہ موڑا اور شیخ صاحب کو اپنا مرشد بنا لیا۔

رہ گیا احمد مشتاق۔ اس ابھرتے شاعر سے بھی مظفر نے بہت امیدیں وابستہ کی تھیں۔ اور شاید مشتاق جو اتنے سوز سے میرا بائی کے بھجن گا کر ہمارے رتجگوں میں اداسی کا رنگ بھر دیتا تھا وہ مظفر ہی کی تربیت کا فیض تھا۔ کیونکہ اصل میں تو مظفر ہی نے ہم سب کو سچی

شاعری کے درشن کرانے کے خیال سے میرا کے بھجنوں کا اردو رسم الخط میں ایک مسودہ تیار تھا۔ حق یہ ہے کہ ہم سب ہی نے اس مسودے سے بھرپور استفادہ کیا۔ اسی کے زیر اثر ہمارے درمیان فلم ''جوگن'' نے مقبولیت حاصل کی جسے ہم نے میٹنی شو میں جا کر بار بار دیکھا۔ ویسے مظفر نے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اب تک لکھ رہا ہے لیکن مجھ سے پوچھو تو شاعر وہ ان بھجنوں اور دوہوں ہی میں نظر آتا ہے جو اس نے ان دنوں لکھے تھے۔ یہ بے قرار روح اس صنف میں تھوڑا اٹک جاتی تو آج ہمیں دوہے کے لیے خالی جمیل الدین عالی پہ قناعت نہ کرنی پڑتی۔

قرار مظفر کے یہاں ہمیشہ بس حصول علم کی حد تک رہا۔ آگے تو بے قراری ہی بے قراری ہے۔ یار عزیز منصوبہ بندی غضب کی کرتا تھا۔ قلم بعد میں اٹھاتا پہلے ایک جامع منصوبہ بناتا۔ مگر قلم چلتے چلتے زقند لگا کر کسی نئے منصوبے کی طرف چل پڑتا اور یہ منصوبہ اپنی تکمیل کے لیے ترستا رہ جاتا۔ ہزاروں منصوبے ایسے کہ ہر منصوبے پہ دم نکلے۔ تکمیل کی شرمندگی کسی منصوبے کو آج تک نہیں اٹھانی پڑی۔ مظفر اپنے منصوبوں سے وفا نہیں کرتا۔ مظفر سے اس کے چیلے وفا نہیں کرتے۔ عشق کر کے بھی دیکھ لیے۔ مگر عشق بھی سارے تشنہ تکمیل ہی رہے۔ ہاں یہ ہے کہ پچاس فیصدی کی حد تک مراحل یقیناً طے ہو جاتے تھے۔ باقی رہا بقیہ پچاس فیصدی کا معاملہ تو وہ مراحل اپنی تکمیل کے لیے فریق ثانی کی توجہ کے محتاج ہوتے تھے۔ سو سارے عشق پچاس فیصدی کی حد تک بھرپور و بقیہ پچاس فیصدی بے مہری یار کی دلخراش داستان۔ جب ہی تو طبیعت میں وہ گداز پیدا ہوا کہ ہر اچھا شعر ان دنوں دل پہ تیر کی طرح جا کر لگتا تھا اور مظفر تڑپ کر داد دیتا تھا۔ خصوصاً مشتاق کے شعروں پر پ مگر مشتاق کی آنکھ بھی طوطے کی آنکھ نکلی۔ یہ نگ شیخ صاحب نہ جیت سکے تو کیا ہوا۔ اسے ناصر نے سنگوا لیا۔ ادھر بہر حال محرومی مقسوم ٹھہری تھی۔ ایک تو آدھی رات کا جادو۔ اوپر سے مشتاق کے شعروں کا سوز و گداز۔ مظفر نے داد کے جوش میں مشتاق کا ہاتھ تھام لیا۔ اور مشتاق نے محسوس کیا کہ اس کی ہتھیلی پر کوئی گرم شے گری ہے۔ یہ مظفر کا آنسو تھا۔ شعر پر اس سے بڑی داد کیا ہو سکتی تھی۔ مگر

''نہ لا دے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو''

مشتاق اس داد کی تاب نہ لا سکا۔ اگلے دن یہ آنسو دوستوں کے درمیان افسانہ بن چکا تھا۔ باقی یہ یاد نہیں کہ ناصر نے یہ شعر اس واقعہ سے پہلے لکھا تھا یا بعد میں۔

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے
بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

یہ ہمارے رتجگوں کا زمانہ تھا۔ میں ہوں رات کا ایک بجا ہے۔ ٹی ہاؤس سے تو گیارہ بجے ہی اٹھ لیے تھے۔ اس کی بساط تو بس اتنی ہی تھی۔ حد سے حد ساڑھے گیارہ بجے۔ رتجگا کرنا ہے تو کوئی اور ٹھکانا ڈھونڈو۔ وہ اور ٹھکانا ایک وقت میں میٹرو ہوٹل تھا۔ گرمیوں کے دن ہیں۔ کھلے آسمان کے نیچے میزیں سجی ہیں۔ درمیان میں فلور ہے۔ بال روم ڈانسنگ کا اہتمام ہے۔ رات بھیگ چلی ہے۔ رقص کرتے جوڑوں پر سپردگی کی کیفیت طاری ہے۔ شیخ صلاح الدین ان سے بے پروا وقت کے موضوع پر جاری ہیں۔ بتا رہے ہیں کہ وقت ہندو فلسفہ میں دائرہ ہے۔ اسلامی تصور میں وہ زینہ پیچاں ہے۔

''زینہ پیچاں۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔''

''Spiral-'' شیخ صاحب سمجھاتے ہیں ''اردو میں اس کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ زینہ پیچاں کیا ہے۔''

اے لو ادھر ہم رقص جوڑے رخصت ہو گئے۔ موسیقی کی گت بدل گئی۔ روشنی کا رنگ بھی کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اب ہم اندھیرے میں ہیں۔ یعنی سب ہی اردگرد بیٹھے لوگ۔ بس فلور پر روشنی کا ایک تھالا سا بنا نظر آ رہا ہے۔ اینجلا اپنے مختصر لباس میں چھم چھم کرتی نمودار ہوتی ہے۔ اچھا آج تو کیبرے کا دن تھا۔ وقت کا سارا فلسفہ پس منظر میں چلا گیا۔ کم از کم میرے لیے کہ میری نظریں اب اینجلا پر مرکوز ہیں۔ مگر شیخ صاحب اسی جوش سے جاری ہیں۔ اور یار ہمہ تن گوش بنے ہوئے ہیں۔ شیخ صاحب کو اسی لیے تو میٹرو میں بیٹھنا پسند ہے۔ ٹی ہاؤس میں ادبی گنوردل کے بیچ وہ کسی بھی فلسفہ کے مسئلہ پر اتنی یکسوئی کے ساتھ کہاں غور و فکر کر سکتے ہیں۔ لاکھ ہماری ٹیبل سب سے الگ ہو۔ مگر کوئی بھی کسی گھڑی آن دھمکتا ہے۔ فلسفیانہ فکر میں کھنڈت ڈال دیتا ہے۔ یہاں اینجلا کے سوا کسی طرف سے کھنڈت نہیں پڑتی۔ مگر شیخ صاحب کے لیے تو اینجلا کا وجود و عدم برابر ہے۔

لاہور میں اس وقت جو دو تین اونچے درجہ کے ہوٹل تھے ایک ان میں میٹرو تھا۔ اور شاید اینجلا کے زور پر کچھ زیادہ یہ زور میں جا رہا تھا۔ اور یہ دیکھو کہ ہماری ٹولی اپنی محدود بہت ہی محدود آمدنیوں کے باوجود اور ٹی ہاؤس کی فضول خرچی کے باوصف یہاں بیٹھنے کی بھی عیاشی کر لیتی تھی۔ بلکہ جب کرسمس نائٹ اور نیو ایئر نائٹ پر ٹکٹ کے ذریعہ داخلہ ہوتا تھا تو پہلے سے ٹکٹ خرید کر نشستیں محفوظ کرا لیتے تھے۔

میٹرو کے بڑے ہال کے دروازے پر دائیں بائیں دو قد آدم برہنہ نسوانی مجسمے کھڑے تھے۔ جب شہر میں مولویوں کی طرف سے فحاشی فحاشی کا شور اٹھتا تھا تو ان مجسموں کا تن الٹا سیدھا ڈھانک دیا جاتا تھا۔ جب شور تھم جاتا پھر وہ تن ننگے ہو جاتے۔ پھر جب کبھی شور مچتا پھر اسی رنگ سے تن پوشی ہو جاتی۔ بال روم ڈانسنگ ساتوں دن۔ کیبرے کے لیے ایک تو اتوار کی رات مخصوص تھی۔ کوئی ایک

رات ہفتے کے بیچ۔ دو راتیں دھوم سے منائی جاتی تھیں۔ کرسمس کی رات اور نئے سال کی رات۔ پینے پلانے پر پابندی لگ گئی تو پھر دخت رز نے قالب بدل لیا۔ بوتل کی جگہ کیتلی نے سنبھال لی۔ چائے کی پیالی ساغر بن گئی۔

گرمیاں شروع ہونے پر شام پڑے اندر کی رونق باہر آ جاتی۔ رقص آسمان تلے ہوتا۔ رات جوں جوں بھیگتی توں توں محفل رنگ پکڑتی جاتی۔ اور اینجلا جب چھم چھم کرتی نمودار ہوتی تو تھوڑی ہی دیر میں ایک صندلی بلی نمودار ہوتی اور فلور پر پہنچ کر اینجلا کو دیکھتی اور محو حیرت ہو جاتی۔ کوئی ویٹر آ کر اسے دھتکارتا۔ وہ اطمینان سے فلور سے منہ موڑ کر آہستہ آہستہ چل کر اس میز تلے جا بیٹھتی جو کسٹمرز سے ذرا ہٹ کر ہوٹل کے منیجر کے لیے مخصوص تھی۔ منیجر کے ساتھ ایک اور صاحب بیٹھے نظر آتے۔ یوں جوان تھے مگر سر سارا سفید تھا۔ یہ برنی صاحب تھے۔ انصار کے دوست۔

''ماموں' ناصر کاظمی کی شاعری تمہیں کچھ نہیں دے گی۔ ہمارے پاس بیٹھو۔ اینجلا فارغ ہو جائے۔ اس سے ملواتے ہیں۔ اللہ قسم بہت کمال کی عورت ہے۔ خوش ہو جاؤ گے۔''

بس آتے جاتے میں اسی طرح پکڑا جاتا تھا۔

''ملیں گے کسی وقت۔'' میں ٹالتا اور اپنی میز کی طرف جانے لگتا۔

''انصار کا ماموں اور اتنا خشک۔ حد کر دی تم نے ماموں۔'' برنی صاحب ٹھٹھا لگاتے۔

لیجیے اب تین بج رہے ہیں۔ اینجلا اپنا آخری جلوہ دکھا چکی۔ میٹرو کی محفل اجڑنے لگی ہے۔ بیرے بل پلیٹ میں رکھ رکھ کر ہر میز کی طرف لپک جھپک جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ بل ادا کرو اور اپنا رستہ پکڑو۔ ہم بھی اپنا رستہ پکڑتے ہیں۔

باہر نکل آئے ہیں۔ اب کیا کیا جائے۔

''اب گھر چلنا چاہیے۔''

''گھر؟'' ناصر برہمی سے مجھے دیکھتا ہے ''اب تو میری آنکھیں کھلنی شروع ہوئی ہیں۔''

''چائے اب کہاں ملے گی؟''

''لوہاری میں مل سکتی ہے۔''

لیجیے ہم لوہاری دروازے کی طرف چل پڑتے ہیں۔ لوہاری دروازہ۔ پرانے شہر کے مشہور دروازوں میں سے ایک دروازہ۔ بھاٹی دروازے کی اپنی رونق ہے۔ موچی دروازے کی اپنی رونق ہے۔ مگر ہم لوہاری دروازے سے مانوس ہیں۔ تاریک اور نیم

تاریک رستوں سے گزرتے لوہاری کی طرف چلتے ہیں۔ سڑک کے کنارے ایک پان والا نظر آتا ہے۔ ناصر کو یہاں پڑاؤ کرنا ضرور ہے۔ رات کے تنبولیوں سے ناصر کی خوب ٹپتی ہے۔ ادھار بھی چلتا ہے۔ اور لیجئے اس تنبولی کے برابر یہ خستہ حال بابا بیٹھا ہے۔ سامنے ایک میلا سا رومال بچھا ہے۔ اس پر بہت ساری ماچس کی خالی ڈبیاں رکھی ہیں۔ انہیں کھڑا کر کے ترتیب سے کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''بابا' یہ کیا ہے'' ناصر منہ میں پان رکھتے رکھتے پوچھتا ہے۔

''یہ خالی بستیاں ہیں۔ خالی اجڑی بستیاں۔'' اور پھر اپنے کام میں منہمک ہو جاتا ہے۔

''ٹھیک کہتا ہے۔ خالی بستیاں۔'' ناصر اداس ہو جاتا ہے۔ اور ہم آگے چل پڑتے ہیں۔

لوہاری دروازے پر انارکلی کے نکڑ پہ ایک خستہ حال چائے کی دکان ہے۔ یہاں رات بھر کڑک چائے چلتی ہے۔ اندر ایک ٹوٹی پھوٹی بنچ۔ ایک لمبی سی میز۔ کڑک چائے آ گئی۔ اور ناصر کی آنکھیں اب کھل چکی ہیں۔ میٹرو میں بیٹھ کر فلسفہ سنا۔ اب شاعر کی باری ہے۔

ناصر کا بیان جاری رہتا ہے اس وقت تک جس وقت تک چڑیاں نہیں بولتیں۔ چڑیوں کی چہکار سنائی دی اور ناصر چپ۔ اب اس کی آنکھوں میں نیند اترنی شروع ہوتی ہے۔ لو صاحبو' صبح ہونے لگی ہے۔ ہمارا تجگا ختم۔ گھر چل کر جتنی گھڑی آرام کر سکتے ہیں کر لیں۔ دوپہر ہوتے ہوتے شاید پھر ٹی ہاؤس میں ملیں۔

◆◆◆

بے خانماں کی خانہ آبادی

نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ پچھلے پہر گھر پہنچ گئے تو تھوڑا سو لیے۔ گھر نہیں گئے اور پیٹھ لگانے کا وقت نہیں ملا تو بھی کیا ہوا۔ سونا ایسا کونسا ضروری کام ہے۔ سوئے سوئے نہ سوئے۔ اور سونے کے لیے گھر جانا کیا ضروری ہے۔ کم از کم ان دنوں تو یہ مطلق ضروری نہیں تھا۔ ایک دن جانے کیا کام آ پڑا میں صبح سویرے گھر سے نکل پڑا۔ چلتے چلتے چائنیز میں جھانکا تو دیکھا کہ ریستوراں خالی ہے۔ بیرے جھاڑ پونچھ میں مصروف ہیں۔ ناصر کاندھے پہ تولیہ ڈالے باتھ روم کی طرف جا رہا ہے۔ پتہ چلا کہ رات چائنیز ہی میں بسر ہوئی تھی۔ مگر یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں رتجگے کا زیادہ قائل نہیں تھا۔ رات جب بھیگنے لگتی تو محفل کو جما چھوڑ اٹھ کھڑا ہوتا اور گھر کی راہ لیتا۔ مگر آخر کب تک۔ رتجگوں کا جادو چڑھتا چلا جا رہا تھا اور میری قوت مزاحمت ڈھیتی چلی جا رہی تھی۔

خیر ہمارے تو جیسے کیسے گھر موجود تھے۔ بیٹھنے سونے کا ٹھکانا تھا۔ گھروں میں ہنڈیا ڈوئی توے چولہے کا کھڑاک بھی پھیلا ہوا تھا۔ مگر ناصر تو اس سارے کاروبار سے بے نیاز تھا۔ پرانی انارکلی میں جو گھر تھا وہ تو سوتیلے بڑے بھائی کے تصرف میں تھا۔ ایک تنگ و تاریک کمرہ ناصر کو دے رکھا تھا۔ اس کمرے میں ایسا کونسا آرام کا سامان تھا کہ ناصر کے یہاں اس کے لئے کوئی کشش ہوتی۔ صبح پو پھٹے منہ ادھر اٹھ گیا تو جا کر کمر لگالی۔ باقی سونے کا کیا تھا۔ وہ تو کہیں بھی سویا جا سکتا تھا۔ ناصر کے لیے سونے کا سب سے مناسب وقت وہ تھا جب دوپہر کو یار چائنیز کی بالائی منزل میں اکٹھے ہوتے اور شیخ صاحب گمبھیر مسائل پر گفتگو شروع کرتے۔ ویسے تو ان اوقات میں بھی ادبی مخلوق ٹی ہاؤس میں منڈلاتی رہتی تھی۔ ادبی مخلوق پر موقوف نہیں تھا۔ دانشوروں کی جملہ اقسام بھی تو تھیں جو کافی ہاؤس میں ڈیرہ ڈالے پڑی رہتی تھیں۔ ناصر کی ہر حلقہ میں مانگ تھی۔ سو اسے سب سے آنکھ بچا کر چائنیز کی بالائی منزل میں پہنچنا ہوتا تھا۔ یہاں گنے چنے یار اکٹھے ہیں۔ کوئی خطرہ نہیں کہ کوئی نامانوس مخلوق یہاں آئے اور ہماری محفل میں کھنڈت ڈالے۔ سو ادب' تجریدی آرٹ' فلسفہ' کسی بھی موضوع پر اطمینان سے بحث ہو سکتی ہے۔ شیخ صاحب شروع ہیں۔ اور یہ طے ہے کہ وہ اب لمبے چلیں گے۔ ناصر اطمینان کے ساتھ آنکھیں موندتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگتا ہے۔ شیخ صاحب بدستور جاری ہیں۔ انہیں سو فی صد یقین ہے کہ ناصر بیشک سو رہا ہو مگر ان کی بات سن رہا ہے۔ اور ناصر نے شیخ صاحب کے اس یقین کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ جب پوری نیند لے لیتا تو ان کا آخری فقرہ پکڑ لیتا اور اس حوالے سے تھوڑا تبصرہ کر کے باتھ روم چلا جاتا۔ وہاں ہاتھ منہ دھوتا۔ پھر واپس آ کر چائے

کا نیا آرڈر دیتا اور بحث میں سرگرمی سے شامل ہو جاتا۔

ایسی فضا میں ناصر کی شادی کا سوال جو اچانک اٹھ کھڑا ہوا تو ہم سب ہی کو عجیب نظر آتا تھا۔ گھر در سے بے نیاز شاعر اور شادی' کیا یہ انمل نہیں تھی۔ مگر ناصر کو اس انمل کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ شادی کے سلسلہ میں سنجیدہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اگرچہ ہمیں کتنے دنوں تک یہی گمان رہا کہ یہ بھی ناصر کے تخیل کی گونا گوں اڑانوں میں سے ایک اڑان ہے۔ رفتہ رفتہ وہ منزل آئی کہ براتیوں اور ولیمہ کے مدعوین کی فہرستیں بننے لگیں۔ روز کسی نہ کسی بہانے ناصر یہ ذکر چھیڑتا اور پھر مشتاق پنسل کاغذ سامنے رکھ کر مستعد ہو جاتا۔ جب سارے عمائدین شہر کے نام لکھے جا چکے ہوتے تو ناصر کہتا کہ یار غلام محمد کا بھی نام لکھ لو۔

''غلام محمد۔ کون غلام محمد۔''

''یار اپنا وہ گورنر جنرل۔''

''اچھا۔ مشتاق سر کھجانے لگتا۔

خیر یہ نام بھی لکھا جاتا۔ نام تو پتہ نہیں کس کس کے لکھے گئے۔ یہ ساری فہرستیں تو مشتاق کی جیب ہی میں لکھی رہ گئیں۔ ہم مشتاق اور اس کی جیب میں لکھی ہوئی فہرستوں کو چھوڑ کر ہی برات لے کر چل پڑے۔ بوجھو کیسے۔ رات گئے جب دوست اپنے اپنے گھروں کو ہو لیے اور ٹولنٹن مارکیٹ کے نکڑ پر پہنچ کر میں بھی رخصت ہونے لگا تو ناصر نے برآمدے میں بیٹھے پنواڑی سے لے کر ایک پان کھایا پھر مجھ سے کہا'' یار کل دوپہر کو آ جانا۔ یہی کوئی دو بجے۔ کافی ہاؤس پہنچ جانا۔ منٹگمری چلنا ہے۔''

''اچھا؟ کس سلسلہ میں؟''

''وہ ذرا میری شادی وادی کا قصہ ہے۔''

کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ اس اطلاع اور اس بلاوے پر اعتبار کروں یا نہ کروں۔ اگلا دن اتوار کا تھا۔ دفتر جانا نہیں تھا۔ دوپہر کو میں نے تھوڑے تذبذب کے بعد طے کیا کہ کوئی مضائقہ نہیں' چلتے ہیں۔ منٹگمری نہیں بھی جائیں گے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کافی ہاؤس میں نشست کریں گے۔ بیگ میں ایک جوڑا کپڑوں کا رکھ کر چل پڑا۔

اتوار کا دن' دوپہر کا وقت' کافی ہاؤس میں خاموشی تھی۔ اکا دکا کافی کا رسیا بیٹھا تھا۔ خالی ٹیبلوں سے نظر گزرتی ہوئی ایک گوشے میں گئی جہاں شیخ صاحب اور شاہد حمید بیٹھے تھے۔ اطمینان ہوا کہ کوئی تو ہے۔

''باقی براتی کہاں ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''ناصر سے پوچھو۔'' شیخ صاحب نے کھرتل لہجہ میں جواب دیا۔

''ناصر کہاں ہے۔''

''ہوگا یہیں کہیں' آ جائے گا۔'' وہی کھرتل لہجہ۔

میں ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ناصر کا بھائی انصر گھبرایا گھبرایا آیا ''بھائی جان کہاں ہیں؟''

''ہمیں کیا پتہ۔ ہم تو خود اس کا انتظار کر رہے ہیں۔''

چپ ہوا۔ پھر تذبذب کے بعد فوراً بولا ''باقی لوگ کہاں ہیں۔''

''کون لوگ؟'' شیخ صاحب نے اپنے اسی لہجہ میں جواب دیا۔

''جنہیں برات میں چلنا ہے۔'' ''ناصر جانے۔ ہمیں کیا پتہ۔''

مذبذب کھڑا رہا۔ ''اچھا میں بھائی جان کو چل کر دیکھتا ہوں۔ مگر آپ تو پہنچئے۔ روانگی میں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اخیر انصر نے ناصر کو جلد ہی برآمد کر لیا۔ ٹولنٹن کے نکڑ پر بیٹھے پنواڑی کے ساتھ گپ شپ میں مصروف پکڑا گیا۔ جب ناصر ٹی ہاؤس میں نہ ہوتا اور کافی ہاؤس اور چائنیز میں بھی سراغ نہ ملتا تو یہ بات طے ہوتی کہ شہر کے کسی نکڑ پر کسی پنواڑی سے محو گفتگو ہے یا باغ جناح کی طرف نکل گیا ہے۔ مال روڈ اور قریب و دور کے فٹ پاتھوں پر بیٹھے ہوئے سب ہی پنواڑیوں سے ناصر کے دوستانہ مراسم تھے۔ سب کے ساتھ حساب چلتا تھا۔ بعض کے ساتھ حساب دوستاں در دل والا معاملہ تھا۔ تو خیر ذکر یہ تھا کہ ناصر کو پنواڑی کی دکان سے پکڑ کر لایا گیا اور جلدی جلدی چوٹی سہرے کی رسم ادا کی گئی۔ برات چلنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

کافی ہاؤس سے نکل کر میں نے ٹی ہاؤس کی طرف نظر ڈالی تو دیکھا کہ صفدر میر نے سائیکل سے اتر کر سائیکل سٹینڈ پر سائیکل کھڑی کی ہے۔ میں لپک کر وہاں پہنچا ''صفدر صاحب' آج آپ بہت جلدی آ گئے۔''

''ہاں یار حلقہ کے جلسہ میں ایک دوست کا مضمون سننا ہے۔''

''حلقہ کا جلسہ ضروری ہے یا ناصر کی شادی۔''

''ناصر کی شادی؟ کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ناصر کی شادی ہو رہی ہے۔ برات منٹگمری جانے کے لیے تیار کھڑی ہے۔''

''ناصر کی شادی۔'' صفدر نے قہقہہ لگایا ''بکواس مت کرو۔''

''واقعی شادی ہے۔ ہم وہاں جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیں۔''

''میں؟'' صفدر نے پھر قہقہہ لگایا۔

میں نے بہت مشکل سے صفدر کو قائل کیا کہ یہ معاملہ بہت سنجیدہ ہے۔ ناصر نے لاابالی پن میں دوستوں کو اس اطلاع بھی نہیں دی ہے۔ مگر چند براتی تو ہونے چاہئیں۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔''

صفدر نے تھوڑی دیر سوچا۔ پھر کہا' اس سائیکل کا کیا کروں۔''

''بیدل جالندھری کے حوالے کریں۔ وہ رات کوٹی ہاؤس میں کھڑی کر دے گا۔ کل تو ہم آ ہی جائیں گے۔

تو لیجئے ایک براتی اور شامل ہو گیا۔ باقی ناصر کے ایک بڑے بھائی' چھوٹا بھائی انصر اور ایک اور بزرگ تھے۔ خواجہ صاحب۔ خواتین میں ناصر کی بھابھی۔ یہ تھی برات۔ اس برات کے ساتھ ہم منٹگمری پہنچے۔ وہاں دیکھا کہ ڈیرے تنبو تنے ہوئے ہیں۔ کرسیاں قطار اندر قطار بچھی ہوئی ہیں۔ استقبال کرنے والے گجرے ہاتھوں میں لیے کھڑے ہیں۔ براتی کل ملا کر اٹھ نگ۔ ادھر گجرے وافر۔

رات گزر رہی تھی۔ نکاح اب ہوتا ہے نہ تب ہوتا ہے۔ شرائط ہی طے ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ اصل میں دلہن والے بہت فکر مند تھے کہ لڑکا تو شاعر ہے' لاابالی ہے۔ ان کی بیٹی کی زندگی کیسے گزرے گی۔ سو انہوں نے کچھ کڑی شرطیں رکھی تھیں۔ شرطوں کا کاغذ ناصر کے سامنے آیا۔ اور یکا یک ہم نے دیکھا کہ ناصر نے سہرے کی لڑیوں کو چہرے سے تھوڑا ہٹایا اور تقریر شروع کر دی کہ لفظ کیا ہوتے ہیں' ایک ایک لفظ میں کتنے معنی پنہاں ہوتے ہیں۔ اصل میں بزرگوں نے اسے دلاسا دیا تھا۔ یہ رسمی تحریر ہے۔ ان لفظوں کے وہ معنی نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ بس دستخط کر دو۔ ناصر کو تاؤ آیا۔ آپ مجھے لفظوں کے معنی بتائیں گے۔ لفظ تو میری انگلیوں میں کھیلتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جو لفظ ہمیں سادہ نظر آتے ہیں ان کی تہہ میں کیا کچھ ہوتا ہے اور اس رو میں ناصر بولتا چلا گیا۔ اور یکا یک اسے خیال آیا کہ اس کے ساتھ جو بزرگ آئے ہیں انہوں نے یہ شرطیں مان کو کوئی اچھی بات نہیں کی۔ ''آج اگر میرا باپ زندہ ہوتا۔'' اور یہ کہتے ہوئے ناصر کی آواز بھرا گئی۔ اس پر رقت طاری ہو گئی۔ بزرگوں نے بڑھ کر ناصر کو سنبھالا۔ تھوتھمبو کی اور فوراً ہی صیغہ شروع ہو گیا۔

خیر یہ قصے قضیے تو شادی بیاہ کی روایت کا حصہ ہیں۔ ہر بیاہ شادی میں ایسا کوئی رپھڑ ضرور پڑتا ہے۔ پھر بڑے بوڑھے بیچ میں پڑ کر معاملہ طے بھی کرا دیتے ہیں۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ تو لو یار و شاعر کی شادی ہو گئی۔ ہم دلہن کو لے کر دوسرے دن بخیریت واپس آئے۔ ناصر کو دلہن کے ساتھ گھر چھوڑا۔ رات ہو رہی تھی۔ سوچا کہ چائنیز میں چل کر دم لیں' چائے پئیں۔ وہاں جا کر بیٹھے۔ چائے کا

آرڈر دیا۔ نظر اٹھا کر جو دیکھا تو کیا دیکھا کہ ایک گوشے میں مشتاق اکیلا بیٹھا چائے پی رہا ہے اور غضبناک نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ ہمارا حال کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ہم میں سے کسی میں یہ ہمت نہیں ہوئی کہ اسے پکار کر بلائے کہ آؤ چائے پیو۔ اس نے غصیلی آواز میں بیرے کو پکارا۔ بل ادا کیا۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ناصر کی شادی کی خبر یار و اغیار میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ جس نے سنا پہلے حیران ہوا' پھر افسردہ ہوا۔ پھر اسے ناصر پر غصہ آیا۔ ناصر نے اپنے سارے ہی مداحوں کے ساتھ بہت بڑی دغا کی تھی۔ ناصر صرف شاعری نہیں کر رہا تھا۔ اپنی شاعری کو بسر بھی کر رہا تھا۔ مداحوں کے تصور میں شاعر اور اس کی شاعری آپس میں گھل مل کر ایک چیز بن گئے تھے۔

اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں
خاک ہو کر یہیں بکھر جائیں

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بھول رہا ہے

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر
چاند کس شہر میں اترا ہوگا

منہ اندھیرے ہی ناصر کسے ڈھونڈنے چل دیئے
دور ہے صبح روشن ابھی سو رہو سو رہو

یہ شاعری بھی تھی اور مداحوں کے حساب آپ بیتی بھی تھی۔ ایسے رومانی کردار کے ساتھ شادی خانہ آبادی کا تصور لگا نہیں کھاتا۔ یہ شاعرانہ کردار مداحوں کی جذباتی ضرورتوں کو پورا کرتا تھا۔ اچانک شادی کی خبر نے اس سارے رومان کو ملیامیٹ کر دیا۔ مداحوں کو غصہ آنا ہی تھا۔ اچانک ایک مداح نے کافی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے اعلان کیا کہ ناصر مر گیا۔"

"کیا بکواس کرتے ہو۔"

"ناصر جو شاعر تھا وہ تو مر گیا۔ اب اس طرف سے کوئی غزل نہیں آئے گی۔"

مایوس مداحوں کو فوراً ہی اس بات کا یقین آ گیا۔ اب جسے دیکھو کہہ رہا ہے کہ یار شاعر مر گیا۔ اب ناصر شعر نہیں کہہ سکتا۔

ناصر کا ان دنوں کافی ہاؤس میں آنا جانا بھی کم ہو گیا تھا۔ ہم جان کر اس کی طرف نہیں جاتے تھے کہ اس کے ہنی مون میں کھنڈت نہیں پڑنی چاہیے۔

مگر اسی ہنگام جب شاعر کے مرنے کا چرچا ہو رہا تھا اچانک وہ ایک شام ٹی ہاؤس میں داخل ہوا اور مژدہ سنایا کہ غزل ہوئی ہے۔

کچھ تو احساس زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

ایک دم سے یار و اغیار سب کے منہ بند ہو گئے۔ شاعر کی بحالی ہو گئی۔

مگر شاعری اپنی جگہ اور زندگی کی حقیقتیں اپنی جگہ۔ اور زندگی کی حقیقتوں کا تو ناصر کو اب پتہ چلنا شروع ہوا تھا۔ پہلے اس نے کب سوچا ہوگا کہ ازدواجی زندگی شاعرانہ زندگی سے کتنی مختلف ہوتی ہے اور کیا کیا اس کے تقاضے اس کے روگ ہوتے ہیں۔ مگر شادی کے بعد بھی یہ سوچنا اس کے دوستوں' مداحوں اور کرم فرماؤں کی ذمہ داری تھی۔ سو یوں ہوا کہ شادی کے فوراً بعد حفیظ ہوشیار پوری بہت متحرک ہو گئے۔ انہیں فکر تھی کہ اب ناصر کے لیے کسی ملازمت کا جلدی سے جلدی بندوبست ہونا چاہیے۔ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ میاں بشیر احمد کے ''ہمایوں'' کو اس وقت ایک ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کو ناصر نے پورا کیا۔

اور مکان؟ اس محاذ پر ایک دوسرا دوست یا مداح جو بھی کہو سرگرم پایا گیا۔ یہ عبدالعلیم تھے جو محبوب خزاں کے توسط سے ناصر سے ملے اور اس کے گرویدہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے افسر والے رسوخ سے کام لے کر کرشن نگر میں ایک اچھا خاصا بڑا گھر ناصر کے نام الاٹ کرا دیا۔ لیجیے بے خانماں شاعر کی سچ مچ خانہ آبادی ہو گئی۔ اور کبوتر پھر آتے ہی چلے گئے۔ ناصر کی ازدواجی زندگی اور کبوتر بازی کی زندگی کا آغاز بس آگے پیچھے ہوا۔

رتجگوں کا وہ دور جب چڑیوں کی پہلی چہکار کے ساتھ گھروں کو واپسی ہوا کرتی تھی تمام ہوا۔ رتجگے جب وقفہ کے بعد دوبارہ شروع ہوئے تو ان میں قدرے اعتدال آ گیا تھا۔ اب ناصر کے لیے رات کے کسی نہ کسی پہر میں واپسی ضروری ہو گئی۔ یہ واپسی کیسے ہوتی تھی' یہ بھی سناؤں گا۔ فی الحال تو یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ شادی کی وجہ سے جو وقفہ آیا تھا وہ کیسے ٹوٹا اور جب دوبارہ محفل گرم ہوئی تو اس کا کیا رنگ تھا۔

ہاں اس محفل میں ایک چہرہ اور نظر آنے لگا تھا۔

حفیظ ہوشیار پوری ٹرانسفر ہو کر لاہور آ گئے تھے' لاہور کے ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے۔ لیجیے ناصر کے چاہنے والوں

میں ایک رنگ کا اور اضافہ ہو گیا۔ یہ رنگ کیسا تھا' ناصر ہی سے سن لیجئے۔

''حفیظ اچھا غزل گو' پرانے خیال کا آدمی ہے۔ علوم وفنون کے ادق انداز میں اپنی کمزور اور بے جان شخصیت کو چھپا رکھا ہے۔ آنکھیں ذہین چمکدار' سیاہ رنگ' گالیں پچکی ہوئیں' سفید بال' کہیں کہیں سیاہی بھی' پتلا دبلا' مخلص اور وضعدار' میرا پیارا دوست ہے۔''

یہ پیارا دوست روز رات کو پیدل چل کر میٹرو پہنچتا۔ ناصر سے شاعری کی باتیں۔ شیخ صلاح الدین سے کچھ علم وتحقیق کے ذکر اذکار۔

ناصر نے پیدل دیکھ کر ایک روز پوچھا ''آپ پیدل کیوں آتے ہیں۔ آپ کی موٹر کو کیا ہوا۔''

حفیظ صاحب بولے ''کیا بتاؤں۔ میری موٹر میرے کہنے میں نہیں۔ میں اسے سٹارٹ تو کر سکتا ہوں۔ چلا سکتا ہوں۔ مگر میٹرو کے سامنے اسے رکنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔''

حفیظ صاحب کی موٹر صرف ایک رستے پر چلنے کی عادی تھی۔ نسبت روڈ سے چل کر جہاں حفیظ صاحب رہتے تھے۔ ریڈیو سٹیشن کے احاطہ میں جا کر خود بخود رک جاتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ رستے میں کوئی ملاقاتی نظر آیا۔ حفیظ صاحب نے موٹر کو بریک لگائے۔ مگر موٹر بکٹ دوڑتی چلی گئی اور اپنی منزل ہی پر جا کر رکی۔ بس ایک مرتبہ وہ بریک کو خاطر میں لائی تھی اور رستے میں رک گئی تھی۔ مگر پھر اس نے سٹارٹ ہونے سے انکار کر دیا۔

حفیظ صاحب کی موٹر حفیظ صاحب کے کہنے میں نہیں تھی۔ مگر اعداد ان کے بہت کہنے میں تھے۔ بس آپ کے منہ سے فقرہ نکلا اور حفیظ صاحب نے فقرہ پکڑا اور لہک کر بولے ''لو تاریخ نکل آئی۔'' بیٹھے بیٹھے یہی کرتے رہتے تھے۔ بات کرتے کرتے کوئی مصرعہ پڑھا' تڑپ کر بولے ''ارے یہ تو تاریخ نکل آئی۔'' دوسرے کی زبان سے کوئی فقرہ نکلا۔ فقرے کو چٹکی سے پکڑا اور جھٹ سے اس سے تاریخ برآمد کر دی۔ ذکر ہو رہا تھا کہ ناصر کی شادی ہو گئی۔ اب وہ پابند ہو گیا۔ پابند کے لفظ کو پکڑ لیا۔ بولے شادی کی تاریخ نکل آئی ''پابند ناصر کاظمی۔''

جس ذوق وشوق سے تاریخ نکالتے تھے اسی ذوق وشوق سے یاروں کی ہجویں کہتے تھے۔ کسی بھی دوست پر کسی بھی موقعہ پر رواں ہو جاتے۔ پھر چل سو چل۔ شیخ صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں علم وفضل کی ہو رہی تھیں۔ مگر ایک دفعہ جو پٹری بدلی تو بس چل نکلے۔

آ شیخ صلاح الدین

جا شیخ صلاح الدین

پنجابی میں وہ بولا

پا شیخ صلاح الدین

میں نے کہیں پیچھے ذکر کیا ہے کہ شیر محمد اختر اور رضی اختر نے مل کر دکان کھولی تھی۔ دکان کا نام تھا اختر اور اختر۔ حفیظ صاحب کو نام پڑھ کر گدگدی ہوئی۔ اور ہجو لکھ ڈالی۔ اس وقت مجھے پوری ہجو یاد نہیں آئی تھی۔ اب یاد آئی ہے تو سن لیجئے۔

رضی سے جب یہ پوچھا شغل کیا ہے
وہ بولے جی کتابیں بیچتے ہیں
ہے ان کا نام اختر اور اختر
یہ دو پاجی کتابیں بیچتے ہیں
خریدوں گا نہ میں ان سے کتابیں
بہت مہنگی کتابیں بیچتے ہیں
ہے ان میں ایک عاشق ایک معشوق
فقط جنسی کتابیں بیچتے ہیں

ریڈیو کے دوستوں سے سنا کہ جب شوکت تھانوی نے دوسری شادی کی تو ان کے بڑے صاحبزادے غصے سے بھرے ریڈیو سٹیشن پہنچے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بولے 'اباجی' اگر یہ خرمستی..... بس اتنا ہی کہا تھا کہ حفیظ صاحب جو اس مبارک گھڑی میں وہاں موجود تھے اچھل پڑے اور بولے ''بس بس۔ تاریخ ہوگئی۔ ''اباجی خرمستی'' سے شادی کی تاریخ نکلتی ہے۔''

مگر حفیظ صاحب کا اصلی کام تو ان کی غزلیں تھیں۔ اور اس کام کو انہوں نے کبھی سمیٹا نہیں۔ جب یار پوچھتے کہ حفیظ صاحب آپ کا مجموعہ کب شائع ہو رہا ہے۔ جواب دیتے' ریٹائر ہو کر جو جو کام میں نے کیے ہیں ان سب کو سمیٹوں گا۔ ریٹائر بھی ہوئے۔ اپنے بکھرے کلام کو سمیٹا بھی۔ مجموعہ پھر بھی شائع نہ ہوا۔ جب انتقال ہوگیا تو ضیا جالندھری نے مظفر علی سید کو الزام دیا کہ حفیظ صاحب نے اپنی غزلیں یکجا کر کے اس کے حوالے کی تھیں کہ ذرا ترتیب دیکھ لو۔ اس نے مسودہ دبا لیا۔ کتاب چھپتی کیسے۔ لیجئے مظفر اور ضیا میں ٹھن گئی۔ بندہ اس باب میں یہ کہتا ہے کہ اس کے ذمہ دار خود حفیظ صاحب ہیں۔ انہوں نے نیکی کر کے کونسے دریا میں ڈالی۔ مظفر تو وہ اتھاہ دریا ہے کہ خود اس کی نیکیوں کا پتہ نہیں چلا کہ کونسی تہہ میں سما گئیں۔ لکھ لکھ کر مضامین نو کے انبار لگا دیئے۔ مگر کتاب چھپنے کی نوبت نہیں

آنے دی۔ اگر کسی طور آ بھی گئی تو کوئی بڑا سا روڑا اٹکا دیا۔ حفیظ صاحب کا مسودہ مظفر کے پاس۔ یعنی کڑوا کریلا اور نیم چڑھا۔

اچھا ایک حفیظ کا ذکر آیا ہے تو تھوڑا ذکر دوسرے حفیظ کا بھی ہو جائے۔ اصل میں لاہور شہر نے دو حفیظوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ایک ہوشیار پور والے حفیظ کی' دوسرے جالندھر والے حفیظ کی۔

ابوالاثر حفیظ نے غزلیں لکھیں' گیت لکھے' شاہنامہ اسلام لکھا۔ ان سب میدانوں میں اپنا لوہا منوایا۔ بقول خود اہل زباں کب مانتے تھے' ان سے بھی اپنے آپ کو منوایا۔ مگر میں نے انہیں ان کے ایک اور ہی ادبی کارنامہ کے واسطے سے جانا اور مانا۔ خیر اس کا ذکر تو ذرا ٹھہر کر کروں گا۔ پہلے تو مجھے یہ بتانا چاہیے کہ میرا ان سے تعارف کہاں اور کیسے ہوا۔ اسی شہر میں رہتے تھے مگر میں ان سے بیگانہ چلا آتا تھا۔ ادبی محفلوں میں وہ آتے نہیں تھے۔ مشاعروں میں' میں جاتا نہیں تھا۔

مکتبہ جدید کے بک سٹال پر ایک صاحب ہوا کرتے تھے' علاء الدین مظہر۔ سہگل کے عاشق صادق تھے۔ سہگل سے اپنا رشتہ یہ بتاتے تھے کہ جالندھر میں اس کے گھر کی دیوار سے ان کی گھر کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ دوسرے رشتہ دار حفیظ جالندھری جو ان کے ماموں تھے۔ سال کے سال بڑے اہتمام سے سہگل کی برسی مناتے۔ پوری گلی میں جھنڈیاں لگائی جاتی۔ گھر کی بیٹھک میں سہگل کی ایک بڑی سی تصویر اس طرح سجائی جاتی کہ اس پر گیندے اور گلاب کے گجرے لاد دیئے جاتے۔ اگر بتیاں سلگائی جاتیں۔ پھر بیچ میں ایک گراموفون رکھا جاتا جو شاید سہگل ہی کے زمانے کا تھا اور جسے وہ ضرور جالندھر سے لے کر آئے ہوں گے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سہگل کے وہ ریکارڈ جو ہز ماسٹرس وائس کے پاس بھی محفوظ نہیں ہیں ان کے پاس موجود ہیں۔ جس خضوع و خشوع سے وہ یہ برسی مناتے تھے اسی خضوع و خشوع کے ساتھ میں وہاں پہنچتا اور سہگل کے سارے ریکارڈ سن کر آتا۔ ایک برس ماموں نے بھانجے کو اور بھانجے کے ساتھ سہگل کو نوازا اور اس تقریب میں ورود کیا۔ میں نے ذرا چھیڑا تو رواں ہو گئے۔ ہمعصروں میں سے کسی ایک کو جو مان کے دیا ہو۔ جوش کے متعلق کہنے لگے کہ ''بندہ خدا کو بس لغت حفظ ہے۔ لفظوں کی اتنی بھرمار ہے کہ معنی غائب ہو جاتے ہیں۔'' اور پھر کتنے پتہ کی بات کہی کہ ''زبان محض لفظوں سے عبارت نہیں ہوتی۔ زبان میں اصل چیز لہجہ ہے۔ میں چونکہ پنجابی ہوں اس لیے میں نے لفظ اور لہجہ پر بہت غور و فکر کیا ہے۔ لکھنو جا کر وہاں کے گلی کوچوں میں گھوما پھرا اور زبان سنی۔ زبان تو وہی ہوتی ہے جو گلیوں اور بازاروں میں بولی جاتی ہے۔ میں کھلے کانوں کے ساتھ لکھنو' دلی' علی گڑھ گیا اور زبان کو اپنے اندر اتارا۔ میں کہتا ہوں کہ لکھنے والا یا تو کسی زبان کو اختیار نہ کرے۔ اختیار کرتا ہے تو اس کا حق ادا کرے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دلی میں اکیس لہجے ہیں اور لکھنو میں صرف تین۔ میں نے ان لہجوں کو جانا اور سمجھا ہے۔ اب جو نوجوان جدید شاعری فرما رہے ہیں ان کے یہاں نہ شاعری ہے نہ زبان۔ اس جدیدیت کے استاد ہیں جناب فیض احمد فیض'' رکے۔ پھر بولے۔ ''اور یہ نثری نظم۔ میرے عزیز شعر کو وزن میں رکھنے کے لئے اتنا ہی دکھ جھیلنا پڑتا ہے جتنا عورت کو

بچہ جننے میں جھیلنا پڑتا ہے۔ بلکہ شعر کہنے میں شاعر جس درد سے گزرتا ہے وہ دردِ زہ سے بڑھ کر ہے۔"

بس اس کے چند ہی دنوں بعد ان کی طرف سے مجھے ایک کتاب موصول ہوئی۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ "اس کتاب کا اول سے آخر تک جلد از جلد مطالعہ فرمالیں اور بعد ازاں اپنی رائے سے دنیا کو بتادیں کو شاہنامہ اسلام کے مصنف نے چیونٹی نامہ کیوں اور کیسا لکھا ہے۔"

اور بندہ اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دنیا کو (ہماری دنیا سے لے دیکے اردو کی دنیا ہے) بتا دینا چاہتا ہے کہ شاہنامہ اسلام برحق مگر جس نے "چیونٹی نامہ" نہیں پڑھا وہ حفیظ سے بیگانہ ہے۔ میں نے شاعر اسلام کا یہ نثری شاہکار پڑھا' چیونٹی نامہ یعنی "ایک مہذب و متمدن مخلوق" کی داستان حیات اور حفیظ صاحب کی عظمت کے آگے سر جھکا دیا۔

میں نے حفیظ صاحب کو زیادہ قریب سے نہیں دیکھا لہٰذا اس کے بارے میں جو اچھی بری باتیں کہی جاتی ہیں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایک واقعہ سے میں نے یہ جانا کہ یہ بزرگ اپنی طرز کا وضعدار تھا اور پرانے تعلقات کا اس کے یہاں بہت پاس تھا۔

واقعہ اس طرح ہے کہ صلاح الدین محمود ایک دن ایک نوجوان کو ساتھ لے کر میری طرف آئے۔ لمبا قد' چھریرا بدن' گوری رنگت' ڈاڑھی کسی قدر بڑھی ہوئی' چہرے پر کچھ کچھ وحشت کے آثار۔ تعارف کرایا کہ یہ میرے علی گڑھ کے زمانے کے دوست ہیں۔ اب ملاقات ہوئی ہے اور تمہاری اطلاع کے لیے یہ رشید احمد صدیقی کے بیٹے ہیں۔ میرا مطلب ہے چھوٹے بیٹے۔ مشرقی پاکستان کی ابتلا میں مکتی باہنی والوں کے گھیرے میں آگئے تھے۔ کسی نہ کسی طرح ان سے بچ کر خراب و خستہ ہوتے ہوتے پاکستان پہنچے ہیں۔ باقی اپنا یہ احوال خود سنائیں گے۔"

اس عزیز نے اپنا احوال سنایا۔ شرٹ کے بٹن کھول کر اپنا بدن دکھایا۔ جا بجا زخموں کے نشان۔ پھر اپنے احوال کے دفتر کو سمیٹ کر اچانک مجھ سے پوچھا "آپ ریوتی سرن شرما کو جانتے ہیں۔"

"ہاں بالکل۔ کیوں۔"

"میں اس واسطے سے آپ کو جانتا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی باغی بہن سے قطع تعلق نہیں کیا۔ بہن بہنوئی سے تمہارا ربط و ضبط تھا۔"

"قطع تعلق کیا معنی' میں نے تو اس کام میں بہن کی مدد کی تھی۔"

خیر میں نے اس جوان عزیز کا احوال اپنے کالم میں بیان کیا۔ دوسرے دن دفتر پہنچا ہی تھا کہ ایک فون آیا۔ اس شہر میں رشید احمد

صدیقی کے کتنے مداح، شاگرد اور ہمعصر ہوں گے۔ مگر مجھے ایک فون آیا۔ وہ حفیظ صاحب کا تھا۔ رقت بھری آواز میں بول رہے تھے ''رشید صدیقی میرا یار تھا۔ علی گڑھ جاتا تھا تو اسی کے گھر ٹھہرتا تھا۔ اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس بچہ کو دیکھا ہے۔ اس کا حال پڑھ کر میرا دل کٹ گیا۔ رشید صدیقی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مگر میں بیٹھا ہوں۔ اس سے کہو کہ اس شہر میں تمہارا ایک چچا ہے۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہے۔ اسے میرے پاس بھیجو۔''

اگلے دن جب وہ آیا تو میں نے اسے حفیظ صاحب کا پیغام دیا اور تاکید کی کہ ان سے جا کر ملو۔ وہ وہاں گیا۔ اور پھر لاہور جتنے بھی دن رہا اسی گھر میں رہا۔ مگر واقعات نے اس جوان عزیز کو خفقانی بنا دیا تھا۔ ایک روز بے کہے سنے چلا گیا۔ پھر شاید کراچی کی طرف نکل گیا۔ حفیظ صاحب کا مجھے فون آیا۔ وہ اس کی اس حرکت پر بہت آزردہ تھے۔

◆◆◆

نئی نسل کا شگوفہ، نوخیز ادیبوں مصوروں کی مسکوٹیں

ناصر کاظمی کی ڈائری سے ایک ورق:

22 مئی 1953ء۔۔۔۔۔۔۔۔پاک ٹی ہاؤس میں ''بزم خیال کی بنیاد رکھی۔

یکم جون۔۔۔۔۔۔۔۔''تحریک خیال'' کی تجویز پر غور۔

2 جون۔۔۔۔۔۔۔۔تحریک خیال کی بنیادی کمیٹی کا اجلاس۔شیخ صلاح الدین صاحب صدر، احمد مشتاق خزانچی، انتظار حسین سکریٹری، حنیف رامے اور شاکر علی نے بھی شرکت کی۔

3 جون۔۔۔۔۔۔۔۔ٹی ہاؤس میں نئی نسل کے لکھنے والوں کا اجتماع۔

4 جون۔۔۔۔۔۔۔۔شیخ صاحب نے منشور پیش کیا۔

11 جون۔۔۔۔۔۔۔۔Heat Wave, Art Wave, & Palmistry Wave

میٹرو میں رات کے بارہ بجے تک حنیف رامے کی صدارت میں تحریک خیال کمیٹی کا اجلاس۔یہ غزل کہی۔

''چاند جب پہلی رات کا دیکھا''

بزم خیال، تحریک خیال، نئی نسل۔لو میں تو بھولا ہی جا رہا تھا۔ناصر نے یاد دلایا اور اب آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آ رہا تھا۔مگر سب کچھ کہاں۔کتنی باتیں ذہن سے بالکل اتر چکی ہیں۔مثلاً ''خیال'' کا اجرا تو یاد ہے۔تحریک خیال کے متعلق ذہن پیچھے کی طرف دوڑا رہا ہوں۔تفصیلات بالکل یاد نہیں آ رہیں۔بہر حال یہ سب نئی نسل کے خیال کی گلکاریاں تھیں۔مگر نئی نسل چہ؟

رتجگوں کو آخر رنگ لانا ہی تھا۔تخلیقی درد سے بھری یہ راتیں ضائع کیسے چلی جاتیں۔آخر کوئی بے قراری تو تھی کہ یار تپتی دوپہروں میں اور جاڑے پالے کی راتوں میں یوں مارے مارے پھرتے تھے اور ناصر نے تو اپنی شب بیداری کے جواز میں ایک فلسفہ بھی تراش رکھا تھا کہ تخلیق کا درد اصل میں رات کی امانت ہے۔تخلیق کا ہر جادو رات کے سناٹے میں جاگتا ہے۔تو ادھر رات کے یہ مسافر تخلیق کے جذبے سے سرشار پھرتے تھے ادھر عسکری صاحب ادبی جمود کی سنادنی سنا رہے تھے۔تو ان یاروں کے بیچ یہ سوال اٹھنا ہی تھا کہ یہ عسکری صاحب کس ادبی جمود کی بات کر رہے ہیں۔جو لکھ رہا ہو تخلیقی امنگ لیے پھرتا ہو وہ کیسے مانے گا کہ ادبی جمود ہے۔

یاروں نے کہا کہ شاید وہ نسل جس کے ساتھ عسکری صاحب جوان ہوئے تھے جمود کا شکار ہو چکی ہے۔ مگر ہم تو نئی نسل ہیں۔ پاکستان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہم نے ادب میں آنکھ کھولی ہے۔

یہ بات ٹی ہاؤس سے چلی اور کافی ہاؤس تک پہنچی۔ کافی ہاؤس میں تو پہلے ہی ہنڈیا پک رہی تھی۔ نوخیز مصوروں کی ٹولی اپنے بزرگوں سے امادہ بغاوت تھی۔ تجریدی مصوری کی کھچڑی کھد بد کر رہی تھی۔ انہیں دنوں ایک مصور نیا نیا شہر میں وارد ہوا تھا۔ ایک دوپہر میں نے ٹی ہاؤس میں جھانکا تو وہاں کسی یار کو نہ پا کر کافی ہاؤس کا رخ کیا۔ وہاں جھانکا تو دیکھا کہ ایک میز پر ایک اجنبی گم سم بیٹھا ہے اور مظفر علی سید نئی مصوری کے موضوع پر رواں ہے۔ میں بھی جا شامل ہوا۔ کتنی دیر ہی منظر دیکھتا رہا کہ وہ شخص نہ منہ سے بولتا ہے نہ سر سے کھیلتا ہے۔ ہونق بنا مظفر کا منہ تکتا ہے۔ اور مظفر ہے کہ نئی مصوری کے مضمون پر جاری و ساری ہے۔

جب ہم دونوں کافی ہاؤس سے نکلے تو میں نے پوچھا ''مظفر یہ کون صاحب تھے۔''

''یہ صاحب'' مظفر نے مجھے ایسا دیکھا جیسے میری جہالت پر ماتم کر رہا ہو' یہ شخص ایشیا کا سب سے بڑا تجریدی مصور ہے۔ شاکر علی۔'' مظفر نے یہ بیان اتنی سنجیدگی سے دیا کہ میں آگے کچھ بول ہی نہ سکا۔

ایشیا کا یہ سب سے بڑا تجریدی مصور ابھی صرف کافی ہاؤس میں بیٹھا مہک رہا تھا۔ کافی ہاؤس سے باہر شہر میں ابھی اس کی خوشبو نہیں پھیلی تھی۔ اور ہماری پوری ٹولی کا معاملہ یہ تھا کہ ایک قدم ٹی ہاؤس میں تو دوسرا قدم کافی ہاؤس میں۔ نوخیز مصوروں کے ساتھ مسکوٹیں ہونے لگیں۔ بغاوت کے منصوبے بننے لگے۔

توپیں نصب ہو گئیں۔ دغنے کی دیر تھی۔ نئی نسل کے موضوع پر چائے کی میز پر تو بہت طوفان اٹھ رہا تھا۔ مگر کسی کا قلم ابھی نہیں اٹھا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کس رسالہ سے توقع رکھی جائے کہ وہ ہمارے اعلان خود مختاری کو اپنے اوراق میں جگہ دیدے۔ ناصر ان دنوں ''ہمایوں'' کا مدیر تھا۔ مگر سر پہ میاں بشیر احمد بیٹھے تھے۔ جوان کی وضع وہ ہمایوں کی وضع۔ اس رسالہ میں ایسے قصوں کی کہاں گنجائش تھی۔ بہر حال میرا مضمون تو وہاں چھپ گیا۔ وہ مضمون تھا جو میں نے ''پرانی نسل کے خلاف ردعمل'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ پہلے حلقہ میں پڑھا گیا۔ پھر ''ہمایوں'' میں چھپا۔ حلقہ میں شیر محمد اختر مجھ پر گرم ہو گئے۔ کہنے لگے ''یہ ذاتی نوعیت کا مضمون ہے۔ عسکری صاحب نے ابھی پچھلے دنوں تمہارے مجموعہ ''گلی کوچے'' پر معاندانہ تبصرہ کیا۔ یہ مضمون اس کا ردعمل ہے۔''

یہ تو میرے گمان ہی میں نہ تھا کہ مجھ پر یہ الزام بھی آ سکتا ہے۔

جب مضمون ''ہمایوں'' میں چھپ گیا تو میں نے ناصر سے کہا کہ میں نے تو مضمون لکھ دیا۔ مگر تمہیں بھی تو کچھ بولنا چاہیے۔

''میں تو تمہارے مضمون سے پہلے ہی اعلان بغاوت کر چکا ہوں۔''

''وہ کب؟'' میں نے چکرا کر پوچھا۔

''عجب سادے آدمی ہو تم۔ میری غزل ''سر مقتل بھی صدا دی ہم نے'' تم نے نہیں پڑھی۔ اس میں تو نام لے لے کر پرانی نسل کو رد کیا گیا ہے۔''

اس غزل کو پڑھتے ہوئے پچھلی نسل کے نامور شاعروں کے مجموعوں کے ناموں کو ذہن میں رکھئے۔

سر مقتل بھی صدا دی ہم نے
دل کی آواز سنا دی ہم نے
پہلے اک روزن در توڑا تھا
اب کے بنیاد ہلا دی ہم نے
پھر سر صبح وہ قصہ چھیڑا
دن کی قندیل بجھا دی ہم نے
آتش غم کے شرارے چن کر
آگ زنداں میں لگا دی ہم نے
رہ گئے دست صبا کملا کر
پھول کو آگ پلا دی ہم نے
آتش گل ہو کہ ہو شعلہ ساز
جلنے والوں کو ہوا دی ہم نے
کتنے ادوار کی گم گشتہ نوا
سینہ نو میں چھپا دی ہم نے
دم مہتاب فشاں سے ناصر
آج تو رات جگا دی ہم نے

''قندیل'' قیوم نظر کا مجموعہ کلام۔ ''زنداں'' یوسف ظفر کا مجموعہ۔ ''دست صبا'' فیض صاحب کا مجموعہ۔ ''آتش گل'' جگر صاحب کا اور ''شعلہ ساز'' فراق صاحب کا۔

میں نے یہ جواب سنا اور لاجواب ہو گیا۔

اور لیجیے یہ قصہ چل رہا تھا کہ ہم بھی اک رسالہ کے مدیر بن گئے۔ بس اللہ میاں نے چھپر پھاڑ کر بروقت یہ دولت عطا کی۔ میں تو اورینٹل کالج عبادت صاحب سے ملنے گیا تھا۔ وہاں ہمارے بزرگ پروفیسر وقار عظیم بھی بیٹھے تھے۔ اور انارکلی کا ایک تاجر اپنی ایک آرزو لے کر ان کے پاس آیا بیٹھا تھا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ ایک ادبی رسالہ نکالے۔ ادارت کے لیے کسی نامور ادیب کی تلاش میں تھا۔ وقار صاحب نے میری صورت دیکھی تو اسے اس گمنام ادیب سے بھڑا دیا۔ میں نے جواب کے لیے ایک دن کی مہلت مانگی۔ شام کو ٹی ہاؤس آ کر مظفر اور ناصر کی اس باب میں رائے طلب کی۔ دونوں نے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو۔ دیر مت کرو۔ فوراً جا کر بات کرو۔ ہمیں اس وقت رسالہ کی سخت ضرورت ہے۔ مظفر نے فوراً جیب سے قلم نکالا۔ کاپی کھولی اور رسالہ کا نقشہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ قلم ان دنوں مظفر کی جیب سے ایسے نکلتا تھا جیسے سورمائی زمانے میں بات بات پر ساونتوں کی نیام سے تلوار نکلتی تھی۔ یہاں حال یہ تھا کہ پتہ کھڑکا اور مظفر کی جیب سے قلم نکلا۔ منصوبے نوک قلم پر دھرے رہتے تھے۔ مظفر کے منصوبوں کے مرتب و مدون کیا جائے تو اس کے مضامین کے مجموعوں سے زیادہ ضخیم جلدیں مرتب ہوں گی۔ تو پرچے کا منصوبہ ہاتھ کے ہاتھ تیار ہو گیا۔ اور پرچے کا نام کیا ہوگا۔ مظفر کو فوراً خیال آیا کہ ایک رسالہ خیال تھا۔ اس نام سے پہلے یگانہ نے رسالہ نکالا تھا۔ پھر میراجی نے نکالا۔

''اور اب ہم نکالیں گے۔''

لیجیے سب کچھ طے ہو گیا۔ میں نے اگلی صبح جا کر ہاں کر دی۔

مظفر کے منصوبوں سے خیال آیا..... ایسی زرخیز کوکھ والیاں بھی تو ہوتی ہیں کہ بچے افراط سے جنتی ہیں۔ مگر ان کے جنے جیتے نہیں۔ مگر یہاں تو میری ذمہ داری تھی۔ اس منصوبے کو تو پروان چڑھنا ہی تھا۔ رسالہ نکلنے سے پہلے رسالہ کے اشتہار نے ہنگامہ پیدا کیا۔ اشتہار میں ایک فقرہ کہ ناصر کو سوجھا تھا لکھا گیا ''اس رسالہ کا ایک ایڈیٹر بھی ہوگا۔'' فقرے نے اپنا کام کیا۔ وہ ایسا زمانہ تھا جب رسالوں کے ناشرین اپنے ادیب ایڈیٹروں کو پیچھے ہٹا کر خود ہی ایڈیٹر بنتے چلے جا رہے تھے۔ ان سب کو بگڑنا ہی تھا۔ سب سے زیادہ نذیر چودھری اور محمد طفیل ناراض ہوئے۔ اسی نشیب میں تو خاص طور پر پانی مر رہا تھا۔

خیر پہلے پرچے نے تو داد حاصل کر لی۔ ہاں طے یہ ہوا تھا کہ یہ خالص ادبی پرچہ نہیں ہوگا۔ ادب اور آرٹ دونوں کو اس میں سمیٹا

جائے گا۔ اور یہ کہ ادیبوں کی نئی نسل کے پہلو بہ پہلو کافی ہاؤس میں جو مصوروں کی نئی نسل پر پرزے نکال رہی ہے ان کی بھی یہ رسالہ ترجمانی کرے گا۔ سو پہلے شمارے میں شاکر صاحب کی تصویر اور ساتھ ہی اطالوی مصوری پر ان کا ایک مضمون چھپا تھا۔ یہ گویا اس شہر میں شاکر صاحب کی رسم بسم اللہ تھی۔ دوسرے شمارے میں ان کی ایسی تصویر جو تجریدی رنگ لیے ہوئے تھی چھپی۔ عنوان تھا Bull سانڈ۔ ساتھ میں مظفر کا مضمون ''شدہ کلا۔'' بس اس کے ساتھ ہی پرچہ اعتراضات کی زد میں آ گیا۔ یہ کیسی تصویر ہے۔ اس میں سانڈ کہاں ہے۔ اور یہ شدہ کلا کس چڑیا کا نام ہے۔ یہ رسالہ ہے یا شدھی کی تحریک۔

میں ایک دوپہر کوفی ہاؤس داخل ہوا تو دیکھا کہ قیوم صاحب اپنے ایک نئے شاگرد کو لیے بیٹھے ہیں۔ قیوم صاحب اب گورنمنٹ کالج میں اردو کے پروفیسر تھے۔ کالج سے نبٹ کر ٹی ہاؤس آتے۔ داخل ہوتے ہی ایک قہقہہ سے اپنی آمد کا اعلان کرتے۔ کوئی نہ کوئی شاگرد ان کی معیت میں ہوتا۔ ان کا طریقہ یہ چلا آ رہا تھا کہ جو شاگرد ہونہار نظر آتا اسے پہلے ٹی ہاؤس جھنکاتے۔ پھر حلقہ ارباب ذوق میں لے جا کر چھوڑ دیتے۔ جو شاگرد آج اس کے ساتھ آیا تھا وہ جیسے کچی کلی۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ بس جیسے پالنے سے اتر کر گھٹنیوں چلتا ٹی ہاؤس میں آن پہنچا ہو۔ میں نے بیٹھ کر ابھی سانس ہی لیا تھا کہ قیوم صاحب چہکے ''انتظار صاحب یہ نوجوان ''خیال'' میں جو تصویر چھپی ہے اس کے بارے میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ ہاں بھئی انتظار صاحب آ گئے ہیں۔ پوچھ لو ان سے۔''

نوجوان نے جھرجھری لی ''یہ پینٹنگ چھپی ہے' سانڈ کا آخر مطلب کیا ہے۔''

میں نے ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی۔ مگر قیوم صاحب بھلا ایسے کیسے جانے دیتے تھے ''انتظار صاحب' اس نوجوان کو سمجھائیں نا۔ وہ میرا مغز چاٹ رہا ہے۔ یار اسے سمجھاؤ۔''

یہ قیوم صاحب کا خاص اپنا انداز تھا۔ شاگردوں کو ٹی ہاؤس میں اور حلقہ ارباب ذوق میں لا کر ادیبوں سے بھڑا دیتے تھے۔ شاید یہ سوچ کر کہ اس طور ان کا حوصلہ بڑھے گا' تھوڑی تربیت ہو جائے گی۔ اور یہ جو فلاں فلاں بیٹھے ہیں اور مجھے آنکھیں دکھاتے ہیں کچھ ان کی بھی طبیعت درست ہو جائے گی۔ یہ عمل تھوڑے دن چلتا تھا۔ مگر جو واقعی ذہین شاگرد ہوتا تھا وہ اس فضا میں آ کر جلدی ہی بالغ ہو کر خود قیوم صاحب کو آنکھیں دکھانے لگتا تھا۔ اور یہ جو شاگرد اب ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تھا اس کا نام سعید محمود تھا۔ وہ یہاں پہنچ کر کچھ زیادہ ہی تیزی سے بالغ ہوا۔ قیوم صاحب نے اسے ٹی ہاؤس کا رستہ دکھا دیا۔ یہ اس کے لیے کافی تھا۔ باقی ٹی ہاؤس میں اس نے اپنا مقام خود پیدا کیا۔ دیوانگی کے مراحل اس نے بڑی تیزی سے طے کیے۔ جلدی اسے احساس ہوا کہ قیوم صاحب کی میز تو اس کے لیے بہت تنگ میدان ہے۔ ایک تو یہاں کسی سے پاؤنڈ اور جوائس پر بحث نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ اس میز کے موضوعات تھے ہی نہیں۔ پھر

قیوم صاحب تو شام پڑے ٹی ہاؤس سے رخصت ہو کر گھر چلے جاتے۔ ساتھ میں ان کی نکڑی بھی چلی جاتی۔ سعید محمود کی دیوانگی کے تقاضے اس سے بہت زیادہ تھے۔ سو وہ سرکتے سرکتے جلدی ہی میز بدل کر ہمارے بیچ آ گیا اور شیخ صلاح الدین اور مظفر سے سینگ لڑانے لگا۔

شیخ صاحب کا اپنا طریقہ واردات تھا' مظفر کا اپنا۔ خیر شیخ صاحب کا طریقہ واردات تو سیدھا تھا۔ پہلے ہی ہلہ میں مار گرانے کی کوشش کرتے۔ ایلیٹ اور پاؤنڈ' یہ تو شاعر ہی نہیں ہیں۔ اب آپ ان سے بحث کرتے رہیے۔ انہوں نے تو فیصلہ سنا دیا۔ مظفر کا طریقہ واردات پیچدار تھا۔ ان دنوں ٹی ہاؤس میں ایلیٹ ہی کا طوطی بول رہا تھا' تنقید کے حوالے سے بھی' شاعری کے حوالے سے بھی۔ سو ہر پھر کر وہی بحث کا موضوع بنتا تھا۔ مظفر حریف کو کھل کھیلنے کا موقعہ دیتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اسے پکڑتا۔ اس پہ جتاتا کہ تم نے ایلیٹ کو پورا نہیں پڑھا ہے۔ اور جتنا پڑھا ہے اتنی حد تک بھی اسے سمجھا نہیں ہے۔

پھر مظفر کی مار بہت دور تک تھی۔ شیخ صاحب فلسفہ کے میدان میں بیشک مشرق و مغرب کے ڈانڈے ملا دیں' یونان سے چل کر قدیم ہند' اور قدیم ہند سے اسلام پر آ جائیں۔ مگر ادب میں وہ یورپ سے باہر کم ہی نکلتے تھے۔ مظفر کا یہ عالم کہ ابھی بادیلیر پر ریشہ خطمی ہو رہا ہے اور ابھی اسے چرکپن کا ایک شعر یاد آ گیا۔

کپڑے چرکپن جب بدلتے ہیں
عطر کے بدلے موت ملتے ہیں

پھر سگریٹ کا لمبا کش لیا چٹکی بجا کر راکھ کو جھاڑا اور اس تحقیر سے بادیلیر کا نام لیا کہ ہم گمان کرنے لگتے کہ بادیلیر تو چرکپن کے سامنے طفل مکتب ہے۔ پھر کبھی کبیر' کبھی میرابائی' کبھی جعفر زٹلی۔ زٹلی کے عصری شعور سے بات چلتی اور پھر پتہ چلتا کہ ایک شاعر اشرفی بھی تو تھا۔

کیچڑ میں کوڑی دیکھیں تو دانتوں سے لیں اٹھا
اے اشرفی زمانہ تو کنگال ہو گیا

پھر سگریٹ کا لمبا کش۔ چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی۔ عصری شعور اسے کہتے ہیں۔ اور ہمیں ساری ترقی پسند شاعری گھاس نظر آنے لگتی۔ اور شیخ صاحب ہیں کہ گم متھان بیٹھے ہیں۔ نہ تائید نہ تردید۔

تو ہمارے چھوٹے سے جنگل میں دو شیر ببر اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کا باہمی نباہ روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اب

یہ تیسرا شیر کا بچہ سعید محمود بیچ میں آن کودا۔

سچ پوچھو تو ہماری نئی نسل کو ان دو شیروں کی باہمی رقابت لے ڈوبی۔ خیر جب تک 'خیال' نکلتا رہا' خیریت رہی۔ مظفر کی ساری توجہ اس رسالہ کے حوالے سے آرٹ کی تنقید پر تھی یا بھجن اور گیت پر۔ مگر اس رسالہ کی عمر ہی نے وفا نہیں کی۔ تیسرا پرچہ بہر حال نکلا۔ مگر کن حالات میں۔ میں پھر ناصر سے رجوع کرتا ہوں۔

5 مارچ 1953ء کافی ہاؤس کے باہر گولی چلی۔ دن کو ساڑھے تین بجے کرفیو لگ گیا۔ لیکن لوگ اسی طرح چل پھر رہے تھے۔ رات بھر گولی چلتی رہی۔ بدنصیب اور غافل عوام اور لاپرواہ ظالم حاکم۔

میں کافی ہاؤس کی اس دوپہر کی نشست کو یاد کرتا ہوں۔ باہر ایک شور اٹھا۔ تحریک ختم نبوت کا ایک جلوس ساری رکاوٹیں توڑ کر مال پر آن پہنچا تھا۔ کافی ہاؤس کا دروازہ بند تھا۔ ہم نے بالائی منزل پر جا کر کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھا۔ رینجرز کا ایک دستہ بندوقیں تانے عین کافی ہاؤس کے سامنے مال پر قطار باندھے کھڑا تھا۔ جلوس امنڈا چلا آ رہا تھا۔ جب بالکل قریب آیا تو بس آناً فاناً گولی چلنی شروع ہو گئی۔ مال خونم خون ہو گئی۔

6 مارچ گھر سے نکلنا دشوار ہوا۔ ہر موڑ پر فوجیوں کے مورچے۔ آگ، قتل کی واردات۔

22 مارچ پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ ارباب ذوق کی مجلس ہوئی۔ مارشل لاء کی وجہ سے وائی ایم سی اے کا ہال نہ مل سکا۔

28 شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے اور رات جاگ رہی ہے۔

یکم اپریل رسالہ ''خیال'' چھپ کر ملا۔

ہاں بس دوستوں ہی کو ملا۔ عام قارئین تک نہیں پہنچ پایا۔ بمشکل سٹال تک پہنچا۔ مگر کرفیو لگا ہوا تھا۔ کھلنے کے مختصر اوقات میں لوگ آٹا دال خریدنے کی فکر کرتے یا ''خیال'' خریدتے۔ ناشر نیا نیا اس میدان میں اترا تھا۔ یہ احوال دیکھ کر ہمت چھوڑ بیٹھا۔ ''خیال'' بند ہو گیا۔

''خیال'' تو بند ہو گیا۔ مگر ''خیال'' کا خیال دل سے نہیں گیا۔ اس سے یاروں نے نئی نسل کے تصور کو وابستہ کر لیا۔ کہتے تھے کہ رسالہ بند ہو گیا تو کیا ہوا۔ ہم اسے تحریک بنائیں گے۔ پھر یاروں کو خیال آیا کہ تحریک شروع کر رہے ہیں تو اس کا کوئی منشور بھی تو ہونا چاہیے۔ منشور کون تیار کرے۔ قرعہ فال شیخ صاحب کے نام نکلا۔ شیخ صاحب نے انگریزی میں پوری شرح و بسط کے ساتھ منشور لکھا۔ ڈین ریستوران میں وہ سب لکھنے والے جو اپنے آپ کو نئی نسل جانتے تھے جمع ہوئے۔ ان کے ساتھ سب نئے مصور جمع ہوئے۔

مگر اس اجتماع میں کچھ اور ہی گل کھلا۔ منشور کی ہندی کی چندی کر دی گئی۔ مظفر اس میں پیش پیش تھا۔

بس اس کے ساتھ نئی نسل تتر بتر ہو گئی۔ ویسے تو مخالفت کرنے والے اکثریت میں تھے۔ چار یار ہی تو ایک طرف رہ گئے تھے۔ ناصر، شیخ صاحب، حنیف اور میں۔ رہا مشتاق سو وہ ڈانواڈول تھا۔ بہر حال اکثریت منظم نہ ہو سکی۔ تسبیح کے دانے بکھرے سو بکھرے۔

مگر ٹی ہاؤس میں بہت گہما گہمی ہے۔ اس کی رونق بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کافی ہاؤس کے کتنے باسی اب ٹی ہاؤس میں دیکھے جاتے ہیں۔ بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کافی ہاؤس اجڑ رہا ہے، ٹی ہاؤس کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ مصور ایک ایک کر کے کافی ہاؤس سے رخصت ہو رہے ہیں۔ ان کا رخ اب آرٹ کونسل کی طرف ہے۔ کافی ہاؤس کے کتنے دیوانے جو کافی ہاؤس سے باہر قدم نہیں نکالتے تھے اب ٹی ہاؤس میں دیکھے جاتے ہیں۔ نواب ناطق اب وقتاً فوقتاً یہاں بیٹھے اور اپنی شاعری سناتے نظر آتے ہیں۔

''بمباق طریہا لک بمباق طریہا لک''

دروازہ کھلتا ہے اور ایک نرالی شخصیت نمودار ہوتی ہے۔ لمبا لگ لگ۔ بدن سینک سلائی۔ بر میں ہرے رنگ کا ہاؤس کوٹ۔ گم سم۔ خاموشی سے آ کر بیٹھ جاتا ہے۔

''لطیفی صاحب، چائے پیجئے گا۔''

ناصر کاظمی ان کا کتنا احترام کرتا تھا۔

''جی۔ اور دو توس بھی منگا لیجئے۔''

چائے آئی۔ چائے کے ساتھ دو توس آئے۔ لطیفی صاحب نے دونوں توس اٹھائے اور باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد خالی واپس آئے اور خاموشی سے چائے پینی شروع کر دی۔ لطیفی صاحب سے چائے کے متعلق جب بھی پوچھا انہوں نے ساتھ میں دو توسوں کی بھی فرمائش کی۔ اور ہمیشہ یہ دیکھا گیا کہ توس آ کر رکھے گئے اور وہ لے کر باہر نکل گئے۔ ایک روز میں کافی ہاؤس میں اس زاویے سے بیٹھا تھا کہ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ سامنے لطیفی صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ بار بار دروازے کے شیشے پر ایک کتے کی تھوتھنی نظر آتی ہے۔ کوئی کتا کافی ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھ کر شیشے سے اندر جھانکتا تھا اور پھر اوجھل ہو جاتا تھا۔ میں حیران کہ یہ کتا آخر کیا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ویٹر نے پلیٹ میں دو توس لا کر رکھے۔ لطیفی صاحب نے دونوں توس رومال میں لپیٹے اور باہر نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور ہمارے ساتھ کافی پینے لگے۔ پھر وہ کتا نظر نہیں آیا۔

ایک سہ پہر کو میں ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تو اصغر سلیم کو سخت غصے کے عالم میں دیکھا۔ کہہ رہا تھا ''یار لطیفی صاحب عجب آدمی ہیں۔

آئے اور پوچھا کہ تمہارے پاس اٹھنی ہوگی۔ میں نے اٹھنی جیب سے نکال کر دیدی۔ انہوں نے اٹھنی جیب میں رکھی اور چلے گئے۔ یار حد ہوگئی۔ میری جیب میں ایک ہی اٹھنی تھی۔ سوچا تھا کہ چائے پیوں گا۔ اب میں کیا کروں۔"

"نہ دیتے۔" میں نے کہا۔

"یار انکار کیسے کرتا۔"

خیر بات آئی گئی ہوئی۔ شام ہوتے ہوتے لطیفی صاحب بھی کسی طرف سے آن نمودار ہوئے۔ تھکے ہارے جیسے لمبی مسافت طے کر کے آرہے ہیں۔ جیب سے اٹھنی نکال کر اصغر سلیم کو واپس کی "اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

اصغر سلیم ہکا بکا "کیا بات ہوئی۔ اب کیوں ضرورت نہیں ہے۔"

"ہوا یوں کہ" لطیفی صاحب کہنے لگے "میں مزنگ کی طرف سے آرہا تھا۔ وہاں برگد کے نیچے ایک فقیر خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اس کا حال پوچھا اور اس سے کہا کہ تم یہیں رہنا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے لیے کچھ لے کر آؤں گا۔ میں آپ سے اٹھنی لے کر گیا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ میں نے مزنگ کی ایک ایک گلی چھان ماری۔ کہیں اس کا اتا پتہ نہیں تھا۔ جانے کہاں چلا گیا۔"

لطیفی صاحب کا تعلق لدھیانہ سے تھا۔ لدھیانہ کے صاحب ثروت لوگوں میں سے تھے۔ تقسیم کے ہنگام ہجرت کر کے لاہور آئے تو یہاں بے گھر، بے در ہو گئے۔ آج یہاں کل وہاں۔ سعید محمود انہیں اپنے گھر لے گیا۔ سعید محمود کا ایک شوق یہ بھی تھا کہ کسی ادیب میں جنون کے آثار دیکھتا اور وہ بے ٹھکانہ ہوتا تو اسے اپنے گھر لے جا کر مہمان رکھتا۔ منیر نیازی کو بھی تھوڑے دنوں مہمان رکھا تھا۔ مگر لطیفی صاحب نے اس گھر میں اچھے خاصے دن گزارے۔

سعید کا گھر میرے رستے میں پڑتا تھا۔ صبح ہی صبح جب میں سائیکل پر سوار دفتر کے لیے روانہ ہوتا تو سعید کے گھر کے احاطہ میں جو درخت تھے ان پر چڑیوں کے غول کے غول اترتے نظر آتے۔ چڑیوں نے سخت شور مچایا ہوتا۔ چند دنوں تک سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ اس راہ میں آخر اسی ایک گھر پر چڑیوں کی یورش کیوں ہوتی ہے۔ ایک دن لان پر جو نظر گئی تو دیکھا کہ لطیفی صاحب کھڑے ہیں۔ ان کے سر پر، ان کے دونوں کاندھوں پر چڑیاں لدی ہوئی ہیں۔ باقی کچھ درخت سے اتر اتر کر ان کے گرد پھر پھر اڑ رہی ہیں اور شور مچا رہی ہیں۔ لطیفی صاحب کے ہاتھوں میں روٹی کے ٹکڑے یا دانہ دنکا قسم کی کوئی چیز ہے۔ وہ اسے بکھیر رہے ہیں۔

ایک رات آوارہ گردی کرتے کرتے بہت رات ہوگئی۔ سعید ساتھ تھا۔ ہم اس کے گھر کے قریب تھے۔ ناصر نے کہا کہ اب گھر کون جائے۔ آج سعید ہی کے گھر جا کر گھڑی دو گھڑی سو لیتے ہیں۔ صبح کو گھر جائیں گے۔ میرا گھر وہاں سے قریب تھا۔ مگر میں نے

بھی وہیں ڈیرا ڈال دیا۔ صبح ناشتے کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ ناشتے سے ابھی ہم نے فراغت حاصل نہیں کی تھی کہ لطیفی صاحب نمودار ہوئے۔ انہوں نے میز پر اپنا بڑا سا رومال بچھایا۔ حلوہ پوری' توس وغیرہ وغیرہ سب کو سمیٹ کر اس میں باندھا اور خاموشی سے نکل گئے۔ ہم ہکا بکا یہ کیا ہوا۔

اگلی شام میں اس راہ سے گزرا تو دیکھا کہ دو کتے سعید کے گھر کے گیٹ کی طرف منہ کیے کھڑے ہیں۔ اسی آن لطیفی صاحب ایک بڑا سا پڑا دونوں ہاتھوں میں سنبھالے برآمد ہوئے۔ دونوں کتوں نے انہیں اپنی اداؤں سے خوش آمدید کہا۔ پھر وہ برابر کی گلی میں مڑ گئے جہاں مزید کتوں نے اسی شان سے ان کا استقبال کیا۔

لطیفی صاحب ویسے بہت مصروف نظر آتے تھے۔ وجہ مصروفیت یہ بتاتے تھے کہ اپنی تحریروں کا انڈکس تیار کر رہا ہوں۔ انڈکس کی تیاری میں دفتر لکھے گئے مگر انڈکس پھر بھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ایک دن لطیفی صاحب نے بستر بوریا باندھا اپنے دفتر کو سمیٹا اور اس گھر سے چلے گئے۔ کتوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے میں نے ان کے جانے پر اس علاقے کے کتوں کا ردعمل معلوم کرنے کا تردد نہیں کیا۔ ہاں چڑیوں پر جوان کے جانے کا اثر ہوا وہ میرے ذہن پر نقش ہے۔ صبح کو گزرتے ہوئے میں اس گھر پر ضرور نظر ڈالتا تھا۔ چڑیوں کی چہک مہک غائب ہو چکی تھی۔ کچھ دنوں تک تو یہ لگا جیسے اس علاقے کی چڑیاں چہکنا ہی بھول گئی ہیں۔

لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ باقی سب پہ توم۔ حسن لطیفی کی دیوانگی کا ایسا رعب تھا کہ وہ کچھ ہی کریں کوئی دم نہیں مارتا تھا۔ مگر عظیم قریشی اپنی طرز کے دیوانے تھے۔ لطیفی صاحب سے ٹکرا گئے۔ بولے "لطیفی تم کیا یہ لمبی لمبی نظمیں لکھتے ہو جیسے شیطان کی آنت۔ مجھے دیکھو دو مصرعوں میں مضمون سمیٹتا ہوں۔ یہ نظم لکھی وہ پھینکی۔"

عظیم قریشی کی شاعری بھی نرالی تھی خود بھی نرالے تھے۔ عمر ڈاک خانے کی ملازمت میں کٹی۔ شلوار قمیص اور کوٹ' یہ پہناوا تھا۔ ایک سائیکل دم کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ بیشک پیدل چلیں سائیکل کا ساتھ رہنا ضروری تھا۔ ٹی ہاؤس میں بیٹھے کبھی نہیں پائے گئے۔ ٹی ہاؤس کے گیٹ پر سائیکل کے ساتھ کھڑے اکثر دیکھے جاتے تھے۔ سائیکل سٹینڈ پر سائیکل کھڑی کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اور سائیکل لے کر ٹی ہاؤس کے اندر نہیں آ سکتے تھے۔ سو ٹی ہاؤس کے باہر فٹ پاتھ پر محفل جماتے۔ ٹی ہاؤس سے جو نکلتا اسے روکتے۔ کہتے نظم ہوئی ہے۔ سنو۔ ان کی نظم سننے میں کسی کو کیا تامل ہو سکتا تھا۔ دو مصرعے ہوتے تھے۔ بہت لمبی کھنچی تو تین مصرعے۔ مگر کیا شاعری تھی۔ یا بالکل ٹھس۔ یا پھر جادو

یہاں پھول تھے اور وہاں پھول تھے
مگر چاند نے سب کے سب کھا لئے

عظیم قریشی نے میراجی کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ مگر رنگ ان کا اپنا تھا۔ پہلی کتاب شاید تقسیم سے پہلے رادھا کے گیت کے نام سے چھپی تھی۔ اب انہیں دنوں نیا مجموعہ ''آج کے نغمے کل کے شعلے'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ کہنے لگے ''انتظار میاں' میں نے اپنا مجموعہ صرف تین شخصوں کو بھیجا ہے۔ پنڈت نہرو کو' چرچل کو اور برنارڈ شا کو۔''

میں نے کہا ''قریشی صاحب' پنڈت نہرو کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ مگر چرچل اور برنارڈ شا تو اردو نہیں جانتے۔ وہ آپ کی شاعری کیسے پڑھیں گے۔''

گرما کر بولے ''انتظار میاں' اگر چرچل اور برنارڈ شا کو عظیم قریشی سے استفادہ کرنا ہے تو انہیں اردو سیکھنی پڑے گی۔ کیوں کیسی کہی۔ لاؤ ہاتھ ملاؤ۔''

ہاتھ ملایا۔ سائیکل پہ بیٹھے اور یہ جا وہ جا۔

ایک دن مشرق میں آ کر جھانکا ''انتظار میاں' نظم ہوئی ہے۔ عنوان ہے ایٹم بم۔ نظم سنو:

اور ابلیس کی توہین کرو
اور ابلیس کی توہین کرو
اور ابلیس کی توہین کرو

کیسی کہی۔''

''بہت خوب ہے۔''

''مشرق میں چھپے گی؟''

''ضرور چھپے گی۔''

''پھر یہ لو۔ ہاتھ ملاؤ۔''

ہاتھ ملایا اور سٹاک سے کمرے سے باہر۔

عجلت میں تھے۔ ٹی ہاؤس کے سامنے دم بھر کے لیے رکے۔ سائیکل سے اترے۔ ہم کچھ دوست باہر کھڑے تھے۔

''نظم ہوئی ہے۔سنو''

غنچہ بولا میں بھی زخمی
شعلہ بولا میں بھی زخمی
کتبہ بولا میں بھی زخمی

نظم ختم ہوئی۔ہاتھ ملایا۔سائیکل پہ چڑھ کر پیڈل پہ پیر مارا اور اڑنچھو ہو گئے۔اب آپ نظم کے معنی ٹٹولتے رہیے۔

کبھی کبھی نظم ڈاک کے ذریعہ موصول ہوتی۔خط اپنے ڈھنگ سے لکھتے تھے

میرے پیارے پیارے انتظار ادیب ونقاد زرنگار سید والا تبار۔عزیزم سعادت آثار۔روحی فداک مجتبیٰ۔بارگاہ حسین میں نذارنہ فقیر صورت سلام اپنی جان۔عظیم قریشی کا سلام بہ بارگاہ امام عالی مقام سید الشہدا سیدنا حضرت امام حسین ابن علی ابن ابی طالب۔مشرق کے محرم نمبر میں ضرور بالضرور شائع ہو جائے۔حساب دوستاں در دل

گرویدہ انتظار

درویش عجز وانکسار

کشتہ آل اطہار

(آشم۔فقیر) عظیم

عظیم قریشی کی سائیکل کا ذکر آیا ہے تو پھر مجھے کچھ اور سائیکلوں کا بھی ذکر کرنا چاہیے۔اصل میں پاکستان میں ابھی سائیکل کا زمانہ چل رہا تھا۔ٹی ہاؤس میں جو یار آتے تھے ان میں کچھ سائیکل سوار تھے کچھ پیدل تھے۔اور پیادہ پائی کا چلن اتنا تھا کہ سائیکل موجود ہے مگر پیدل چل رہے ہیں۔جب ہم سڑکیں ناپنا شروع کرتے تھے تو میں اپنی سائیکل ٹی ہاؤس کے سٹینڈ پر چھوڑ دیتا تھا مگر شیخ صاحب کی سائیکل ان کے ساتھ رہتی تھی۔جتنا وہ چلتے تھے اتنا ہی ان کی سائیکل ان کے ساتھ چلتی تھی۔ان کی سائیکل ان کی پیادہ پائی کا جز بن گئی تھی۔اور ایک ہمارے قیوم صاحب کی سائیکل تھی جو ان کی شخصیت کا حصہ بن گئی تھی۔اس وقت کے اندازہ تھا کہ زمانہ ان سب سائیکلوں کو کھا جائے گا۔آخر میں بس مبارک احمد کی سائیکل رہ جائے گی۔بہر حال ٹی ہاؤس اس وقت صرف سائیکل آشنا تھا۔نئی سواری جو ٹی ہاؤس کے سائیکل سٹینڈ پر پہلے پہل نمودار ہوئی وہ شہرت بخاری کی موٹر سائیکل تھی۔

مگر قیوم صاحب کی سائیکل سب پر بھاری تھی۔سوار بھاری تھا تو سواری کو بھی بھاری ہونا تھا۔انہوں نے اس وقت حلقہ میں

Purge کا عمل شروع کرنے کی ٹھانی تھی۔ آخر نئی نسل کے حوالے سے ٹی ہاؤس میں جو بحثیں ہو رہی تھیں ان سے قیوم صاحب بے خبر تو نہیں تھے۔ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں حلقہ میں یہ بحث پہنچ گئی تو حلقہ والوں کا چال چلن بھی بگڑے گا۔ سو 16 جون 1954ء کو منعقد ہونے والے حلقہ کی انتظامیہ کے جلسہ میں ''انتظار حسین رکن حلقہ کے رویے کو زیر بحث لایا گیا۔'' اور محسوس کیا گیا کہ '' کچھ عرصے سے رکن مذکور نہ صرف حلقہ سے عدم تعاون کا ثبوت دے رہے تھے بلکہ حلقہ کی صفوں میں انتشار پیدا کر رہے تھے اور اس کی یک جہتی کو ہر طرح ضعف پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔'' لہٰذا'' طے پایا کہ انتظار حسین کو حلقہ کی رکنیت سے خارج کیا جائے اور مرکز کی توثیق کے بعد کھلے اجلاس میں اخراج کا اعلان کیا جائے۔'' انتظامیہ کے اگلے جلسہ میں طے پایا کہ'' ناصر کاظمی اور مظفر علی سید کے رویے پر کڑی نظر رکھی جائے۔'' اس کڑی نظر کے نتیجہ .....

نتیجہ میں یہ دونوں یار بھی حلقہ سے نکالے گئے۔ ادھر پنجاب یونیورسٹی کی سیاست بھی حلقہ میں دخل پا گئی تھی۔ پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی پر بھی انتشار پسندانہ سرگرمیوں کے الزامات لگے۔ انہیں بھی حلقہ سے نکال دیا گیا۔ لیجئے سب تخریبی عناصر کا قلع قمع ہو گیا۔ حلقہ پاک ہو گیا۔

◆◆◆

رتجگوں کی آخری بہار عرف چار پیاروں کی ٹولی

یہ سویرا کا دفتر ہے۔ رات بھیگتی جا رہی ہے۔ چار یار اکٹھے ہیں۔ ناصر' شیخ صاحب' حنیف' میں۔ بحث جاری ہے۔ میٹرو سے ہجرت کر کے اب ہم سویرا کے دفتر میں آ گئے ہیں۔ حنیف ان دنوں ''سویرا'' کا مدیر تھا۔ اس دفتر میں اس کا ایسا جی لگا کہ ہمیں بھی اس نے یہاں کھینچ بلایا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ میٹرو میں شور بہت ہوتا ہے۔ اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی جگہ سچا تھا۔ شور تو وہاں تھا۔ اور اینجلا جب فلور پہ نمودار ہوتی تھی تو میوزک اتنا تیز ہو جاتا تھا کہ شیخ صاحب بھی اینجلا سے اپنی بے اعتنائی کے باوجود گڑبڑا جاتے تھے۔ بھول جاتے تھے کہ فلاں مسئلہ پر برکلے نے کیا کہا تھا اور ہیوم نے کیا کہا تھا۔ اور ان سے پہلے ارسطا طالیس کیا کہہ چکا تھا۔ تو شیخ صاحب نے حنیف کی تجویز پر فوراً ہی صاد کر دیا۔

ویسے بھی اب حالات اور سے اور ہو چکے تھے۔ ناصر کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آوارگی اور شب بیداری کا گراف نیچے آ گیا۔ اور اب ڈار بھی لمبی نہیں رہی تھی۔ کتنے یار ڈار سے بچھڑ گئے تھے۔ نئی نسل میں تفرقہ پیدا ہو چکا تھا۔ مظفر اب ہماری ڈار میں شامل نہیں ہے۔ نور عالم بھی اس سبھا میں پابندی سے نہیں آتا۔ غالب شہر میں وارد ہو تو یہاں آن ٹپکتا ہے۔ مشتاق جب آتا ہے تو جلدی ہی بور ہو کر چلا جاتا ہے۔ پھر کئی کئی دن صورت نہیں دکھاتا۔ اسے بور ہونا ہی چاہیے۔ بحث کس قسم کی ہوتی ہے۔ فلسفہ' فلسفہ' فلسفہ۔ شیخ صاحب تلے ہوئے ہیں کہ وقت کے مسئلہ کو اس طرح طے کر دیا جائے کہ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے۔ ڈور کے سلجھانے میں حنیف برابر کا شریک ہے۔ بقدر توفیق ناصر بھی ٹکڑا لگاتا ہے۔ اور جب وہ بولنا شروع کرتا ہے تو وہ فلسفیوں کو ایک طرف دھکیل کر اپنے شاعرانہ تخیل کے زور پر زمان و مکان پر کمندیں ڈالتا ہے۔ ویسے اسے یہاں بیٹھ کر پتہ چل گیا ہے کہ تھیل کا فلسفہ کیا تھا۔

رہا میں تو مجھے ایک خاموش سامع شمار کیجیے۔ شاکر صاحب کے بعد اگر کوئی دوسرا ایسا تھا جو دانشورانہ بحثوں کے بیچ گھنٹوں کے حساب سے گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھ سکتا تھا تو وہ میں تھا۔ اس محفل میں بیٹھ کر مجھے اب اس ہنر میں اور زیادہ مہارت ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی سوچتا کہ خدا اس صحبت کو سلامت رکھے' اگر یہ صحبت اسی طرح گرم رہی تو میں انشاء اللہ شاکر صاحب کا ریکارڈ توڑ کر اپنا نیا ریکارڈ قائم کروں گا۔

مگر اس بیچ کچھ اور باتیں بھی ہوئیں۔ آخر جو ہم لکھتے تھے وہ کہاں لے جائیں۔ چھپنا چھپانا بعد میں تھا۔ پہلے یہاں بیٹھ کر سناتے

تھے اور دوستوں سے داد لیتے تھے اور تنقید سنتے تھے۔ ناصر نے جو منظوم ڈرامہ لکھا تھا وہ پہلے میں نے یہیں بیٹھ کر سنا تھا۔ میں نے ایک کہانی لکھی وہ جو ''کٹا ہوا ڈبا'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ جب لکھ چکا تو یہاں آ کر سنائی۔

جب کہانی ختم ہوئی تو حنیف بولا ''شیخ صاحب' آپ نے دیکھا۔ اس شخص نے ہمارے ساتھ کتنا بڑا دھوکا کیا ہے۔''

میں سٹپٹایا کہ یہ کیا ہوا۔

''وقت پر آپ نے جتنی بحث کی' یہ خاموش بیٹھا رہا۔ جب بھی میں نے ٹہوکا یہی کہا کہ میری سمجھ میں یہ فلسفہ نہیں آتا۔ گھنا آدمی ہے۔ سب سمجھ رہا تھا۔ سب کچھ افسانے میں سمیٹ لیا۔''

میں اب دوسرے پہلو سے سٹپٹایا۔ یا اللہ میں نے تو کہانی لکھی ہے۔ شیخ صاحب کے وقت کے فلسفہ کو کیسے سمیٹ لیا۔ مگر شیخ صاحب کو حنیف کی بات سے اتفاق تھا۔

میرا تب بھی یہی خیال تھا اور اب بھی یہی خیال ہے کہ نظریہ ہو یا فلسفہ لکھنے والا اس سے شوق کرنا چاہتا ہے تو بیشک کرے لیکن اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ جب وہ لکھنے بیٹھے تو اسے بھول جائے۔ اگر اس میں بھولنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اول الذکر صورت میں وہ نرا ترقی پسند ہو کر رہ جائے گا۔ دوسری صورت میں منظوم فلسفہ لکھے گا جو نہ فلسفہ ہوگا نہ ادب۔ بیشک لکھنے والے کو ان پڑھ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن خبر کے ساتھ تھوڑی بے خبری بھی ہو تو یہ لکھنے والے کے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ مگر اس وقت مجھے بحث تھوڑا ہی کرنی تھی۔ حلقہ میں بیٹھ کر ایک کام کی بات میں نے ضرور سیکھی۔ یہ کہ جب آپ کی تحریر زیر بحث ہو تو آپ اپنے منہ میں تالا ڈال لیں۔ جو کچھ کہا جائے اسے تحمل سے سنیں۔

تو خیر اس افسانے پر جب گفتگو ہو چکی تو حنیف نے اعلان کیا کہ سویرا کو ایک اچھا افسانہ مل گیا ہے۔

میں پھر سٹپٹایا۔ ''مگر یہ افسانہ تو میں ''نقوش'' کو دے چکا ہوں۔''

حنیف نے غصے سے مجھے دیکھا۔ پھر شیخ صاحب سے رجوع کیا ''شیخ صاحب' آپ نے انتظار کی حرکت دیکھی۔ اس نے ہم سے اجازت لی تھی۔ کس سے پوچھ کر یہ کہانی ''نقوش'' کو دی گئی ہے۔''

اب میں مجرم تھا اور کٹہرے میں کھڑا تھا۔

شیخ صاحب نے فیصلہ صادر کیا کہ افسانہ ''نقوش'' سے واپس لایا جائے۔

''مگر شیخ صاحب میرے لیے تو طفیل صاحب سے جا کر کہنا کہ افسانہ واپس دیدو بہت مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ تو بہت غیر اخلاقی

حرکت ہوگی۔''

''کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں ہوگی۔''

میں نے ناصر کی طرف دیکھا۔ ناصر چپ۔

میرے تامل کو دیکھ کر آخر طے یہ ہوا کہ ناصر طفیل صاحب سے بات کرے گا۔ ہم دونوں طفیل صاحب سے جا کر ملے۔ ناصر نے بات کی۔ طفیل صاحب نے افسانہ واپس دینے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر وہ افسانہ ''نقوش'' ہی میں چھپا۔ لیکن طفیل صاحب سے میری جو ایک وضعداری چلی آتی تھی اس میں ہمیشہ کے لیے ایک دراڑ پڑ گئی۔

اب شیخ صاحب اور حنیف نے مجھے نوٹس دیا کہ دوسرا افسانہ فوراً لکھو۔ اور وہ افسانہ اس افسانے سے کمتر نہیں ہونا چاہیے۔ اگلے ہفتے ہم وہ افسانہ سنیں گے۔

تو دوستوں کے جبر نے ہفتے کے اندر اندر مجھ سے دوسرا افسانہ لکھوایا۔ اتنے مختصر عرصے میں شاید پہلی مرتبہ میں نے کوئی افسانہ لکھا تھا۔ مقررہ شب دوستوں کے بیچ بیٹھ کر سنایا۔ تینوں نے اطمینان کا سانس لیا' خوشی کا اظہار کیا ''یہ افسانہ اس سے بھی بہتر ہے۔''

یہ وہ افسانہ تھا جو سویرا میں ''سیڑھیاں'' کے عنوان سے چھپا اور اب میرے کسی مجموعہ میں شامل ہے۔ چونکہ اس وقت میرے سب ہی دوستوں نے اس افسانے کو پاس کر دیا تھا۔ بعد میں میرے سمجھدار نقادوں نے بھی اس لائق توجہ جانا۔ سو کیا مضائقہ ہے کہ میں اسے اپنی اچھی تحریروں میں شمار کر لوں۔ سو اگر ایسا ہے تو پھر میں یہ کیوں مانوں کی جبر سے اچھا شعر' اچھا افسانہ نہیں لکھوایا جا سکتا۔ ہاں یہ دیکھنا پڑے گا کہ جبر کی نوعیت کیا ہے۔ اور جبر کرنے والا کون ہے۔ ڈکٹیٹر' پارٹی لائن' یا وہ دوست جو تمہارے تخلیقی جذبے کو اکسا رہے ہیں یا تخلیقی غیرت کو للکار رہے ہیں۔

ہاں مجھے اپنا ناولٹ ''دن'' بھی شاید اسی کھاتے میں ڈالنا چاہیے۔ چونکہ اس وقت حنیف نے ''سویرا'' کے لیے چند منتخب لکھنے والوں کو ناولٹ لکھنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ لگے ہاتھوں مجھے بھی نوٹس دیدیا کہ اس نمبر کے لیے تمہیں ناولٹ لکھنا ہے اور ہر صورت لکھنا ہے۔ تو کیا میں اس ناولٹ کو بھی حنیف رامے کے جبر کا ثمر کہوں

''مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی''

پھر کچھ مزاج کی بھی بات ہوتی ہے۔ حنیف نے ''سویرا'' کے لیے ناصر پر بھی ایسی ہی پابندی لگائی تھی۔ اس سے میر پر مضمون لکھوانا تھا۔ مت پوچھو کہ ناصر کو کس کس طرح گھیرا گیا۔ کیا کیا پابندیاں عائد کی گئیں۔ حسن طارق نے اپنی فلم کے لیے اس سے گیت

لکھنے کی فرمائش کی۔ ناصر فوراً آمادہ ہوگیا۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ ٹی ہاؤس میں روز شام کو حسن طارق کا فون آتا۔ ہمارا کام اسے یہ بتانا تھا کہ آج ناصر ٹی ہاؤس نہیں آیا۔ جب وہ ٹی ہاؤس آتا تو ناصر سنک کر باتھ روم میں چھپ جاتا اور ہم حسن طارق کو بتاتے کہ ناصر آیا تو تھا' کسی کے ساتھ چلا گیا۔

ناصر کو ایک برس حلقہ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرنی پڑ گئی۔ مگر خطبہ کیسے لکھا جائے۔ ناصر سے کچھ بھی کہنے کو کہہ دو بس سر پہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا تھا۔ اجلاس کے بیچ دو دن رہ گئے۔ منتظمین پریشان کہ خطبہ کب لکھا جائے گا' کب چھپے گا۔ ناصر کی ڈھونڈیا پڑی ہوئی تھی۔ ناصر غائب تھا۔ بڑی مشکل سے برآمد ہوا۔ اب اس کے لیے مفر نہیں تھا۔ گھبرایا ہوا میرے دفتر آیا۔ بولا ''بڑی مشکل ہے۔ حلقہ کا خطبہ لکھنا ہے۔''

''پھر لکھو۔''

''کیسے لکھوں۔ ویسے جو کہنا چاہتا ہوں وہ تو سارا ذہن میں ہے۔'' اور اس نے بتانا شروع کیا کہ اس خطبہ میں وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ''مگر اس کا مضمون کیسے بناؤں۔''

میں نے وہی نسخہ استعمال کیا جو مولیر کے اس کردار کے استاد نے استعمال کیا تھا جو فنون لطیفہ اور شاعری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد استاد سے ملتجی ہوا کہ اب مجھے بتایئے کہ نثر کیا ہوتی ہے۔ اور نثر لکھنے کا فن سکھایئے۔ استاد نے کہا کہ جو تم بول رہے ہو یہی نثر ہے۔ وہ سخت حیران ہوا کہ اچھا تو میں ساری عمر نثر بولتا رہا ہوں۔ میں نے ناصر سے کہا کہ جو تم بول رہے ہو یہ بنا بنایا مضمون ہے۔ بس اسے اسی طرح لکھ دو۔

''مگر لکھوں کیسے؟''

''بس قلم اٹھاؤ اور لکھنا شروع کر دو۔''

''مشکل یہ ہے کہ جب میں نثر لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو قلم اور کاغذ کے بیچ میں صحرائے اعظم آ جاتا ہے۔''

''اچھا تم بولو۔ میں لکھتا ہوں۔''

ناصر تھوڑی دیر بولتا رہا' میں لکھتا رہا۔ ''اچھا لاؤ' اب میں خود لکھا ہوں۔'' اب ناصر کو یقین آ گیا تھا کہ وہ جس طرح بول رہا ہے اسے اسی طرح لکھ دیا جائے تو خطبہ تیار ہو جائے گا۔ تھوڑی دیر تک لکھنے کے بعد بولا ''یاں سے اٹھو۔ چائے خانے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں۔''

لیجئے قریب کے ایک چائے خانے میں چل کر بیٹھ گئے۔ ناصر نے وہاں بیٹھ کر اچھا خاصا لکھ لیا۔ ''اچھا اب ٹی ہاؤس چلتے ہیں۔''

ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے پی۔ کچھ سطروں کا اضافہ وہاں ہوا۔ ''اچھا اب میں چل پڑا ہوں۔ گھر جا کر مکمل کروں گا۔''

بلی اپنے بچے کو سات گھر جھنکاتی ہے پھر اس کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ ناصر نثر لکھنے کے معاملہ میں بالکل بلی تھا۔

لکھنا رو رو کر۔ بولنا فراٹے کے ساتھ۔ لیجئے کیا بات یاد آئی۔ وہ تو میں بھولا ہی جا رہا تھا۔ انہیں دنوں جب ہم ''سویرا'' کے دفتر میں بیٹھتے تھے اور آدھی آدھی رات تک بولتے تھے میں نے اور ناصر نے ایک واردات کر ڈالی۔ واردات ناصر ہی نے کی۔ میں تو بس لقمہ دے رہا تھا۔ اسے آپ ٹیبل ٹاک کا شگوفہ کہہ لیں۔ یہ شگوفہ کیسے پھوٹا۔ ہم شام کو ٹی ہاؤس میں اکٹھے ہوئے۔ طریقہ یہی تھا کہ ٹی ہاؤس میں اکٹھے ہوتے۔ یہاں باری لگا کر پھر ''سویرا'' کے دفتر کی طرف جاتے۔ تو شیخ صاحب کا انتظار تھا۔ وہ آئے نہیں۔ مشتاق کو موقعہ ملا ''ناصر علموں بس کریں او یار شیخ صاحب کا علم تمہاری غزل کو لے بیٹھے گا۔''

مشتاق نے بات کیا کی تھی' ایک تیر مارا تھا کہ ناصر کے دل میں جا کر ترازو ہو گیا۔

''اٹھو یاریاں سے'' ناصر نے جھرجھری لی ''آج شیخ صاحب نہیں آئیں گے۔ سویرا کے دفتر کا پروگرام موقوف۔ میٹرو چلتے ہیں۔''

کتنے دنوں بعد ہم میٹرو آئے تھے۔ اتنا آباد نہ سہی مگر نقشہ وہی تھا۔ وہی اینجلا وہی صندلی بلی۔ وہی سلیم شاہد کا ٹہلتے ٹہلتے آنا اور ناصر سے شعر کی فرمائش کرنا۔ سلیم شاہد کا گھر لکشمی منشن میں تھا۔ منٹو صاحب کے گھر کے برابر۔ مگر خانہ برباد نے جانے کن حالات میں کب گھر چھوڑا تھا۔ اب تو یہی لگتا تھا کہ صدا سے میٹرو میں رہتے ہیں۔ رات بھیگنے پر کسی بھی گھڑی نمودار ہو جاتے۔ خوب صورت نقش' گوری رنگت' شربتی آنکھیں' کچھ خمار کی کیفیت لیے ہوئے' دہرا بدن۔ اپنے حال میں مست' ٹہلتے ٹہلتے آتے اور ہماری میز کے سرے پر آ کھڑے ہو جاتے۔ ناصر سے مخاطب ہوتے ''ناصر' کوئی شعر سناؤ۔ نیا ہو۔''

ناصر شعر سناتا۔ کھڑے کھڑے لطف لیتے' داد دیتے اور واپس چلے جاتے۔

آج کیبرے کا دن نہیں تھا۔ فلور بھی کچھ بھرا نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف دو جوڑے' کچھ تھکے تھکے انداز میں مصروف رقص تھے۔ بینڈ بھی اسی حساب سے تھکا تھکا بج رہا تھا۔

''بہت فلسفہ بگھار لیا۔'' ناصر بولا ''آج غیر علمی باتیں ہوں گی۔''

''شکر ہے کہ آج شیخ صاحب نہیں ہیں۔''

مشتاق نے ٹکڑا لگایا۔

''یار ٹیبل ٹاک ہونی چاہیے۔''

''بہت اچھا خیال ہے۔'' مشتاق نے تائید کی۔

''انتظار، ہم غالب پہ بات کریں گے مگر بالکل غیر علمی انداز میں۔'' رک کر ''مگر ریکارڈ کیسے ہوگی۔''

مشتاق نے فوراً جیب سے قلم نکالا۔ کاپی کھولی۔ کاغذ نکالا ''تم لوگ باتیں کرو۔ میں لکھتا ہوں۔''

ٹیبل ٹاک کا عنوان قائم کیا گیا ''غالب اور ہم۔'' ''ماہ نو'' میں اشاعت کے لیے رفیق خاور کو پوسٹ کر دیا۔ اس بندہ خدا نے بلا تامل اسے ''ماہ نو'' کی تازہ اشاعت میں شامل کر لیا۔ ''ماہ نو'' سرکاری پرچہ ہونے کے باوجود اس زمانے میں معقول قسم کا ادبی رسالہ تھا۔ دائرہ اشاعت اس کا وسیع تھا۔ شور مچ گیا کہ ''ماہ نو'' میں یہ کیا چھپا ہے۔ اور داد سے زیادہ بیداد۔ بعضوں نے ہنسی میں اڑایا۔ بعضوں کو غصہ آیا۔ ہم مطمئن کہ ردعمل ہماری توقع کے مطابق ہوا۔ اسی رو میں ہم نے دو ڈھائی ٹیبل ٹاک اور کر ڈالیں۔ وہ بھی ''ماہ نو'' میں چھپیں۔

شیخ صاحب اور حنیف کے کچھ ذہنی تحفظات تھے۔ اصل اعتراض یہ تھا کہ گفتگو برحق مگر ان میں علم کی کمی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کی نیت سے ''سویرا'' کے دفتر میں گفتگو کا اہتمام کیا گیا۔ وہاں یہ ہوا کہ علم زیادہ ہو گیا۔ بہر حال گفتگو کے دو دور چلے۔ ایک کا عنوان ''خوشبو کی ہجرت۔ دوسری کا عنوان ''رفتار بدن۔'' ''ٹیبل ٹاک'' کی بجائے اسے مکالمہ کا نام دیا گیا کہ اس نام میں انہیں ایک علمی ثقاہت نظر آتی تھی۔ یہ مکالمات ''سویرا'' میں شائع ہوئے۔

◆◆◆

ستاون اٹھاون

اب 1957ء شروع ہو رہا تھا۔ ٹی ہاؤس کا نقشہ جوں کا توں تھا۔ مگر ہماری میز کی فضا بدل چکی تھی۔ وہ جو سلسلہ تھا کہ ٹی ہاؤس کے بند ہوتے ہوتے وہاں سے اٹھے اور سویرا کے دفتر میں جا کر پڑاؤ کیا۔ وہ سلسلہ اب ختم ہو گیا۔ حنیف رامے کی شادی ہو گئی تھی۔ اب وہ آوارہ گردی سے توبہ کر کے شریفانہ زندگی گزارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو سمجھ لو ہمارے بیچ میں سے ایک تنگ نکل گیا اور ہاں اب مظفر بھی ہمارے بیچ نہیں تھا۔ وہ ملازمت کی تقریب سے لاہور سے جا چکا تھا' مگر اب سعید محمود قیوم صاحب کی میز سے قطع تعلق کر کے ہمارے بیچ رس بس چکا تھا۔

انہی دنوں ناصر کی زندگی میں دو تبدیلیاں آئیں اور ان دونوں تبدیلیوں کے براہ راست ہم پر اثرات مرتب ہوئے۔ ایک تبدیلی ناصر کے یہاں یوں آئی کہ ''ہمایوں'' بند ہو گیا۔ کتنے زمانے سے یہ ماہنامہ کتنی پابندی سے نکل رہا تھا کہ نمازی کی نماز قضا ہو جائے مگر ہمایوں کا مہینے کی پہلی کو شائع ہو جانا اٹل تھا۔ ایک تو ایسی پابندی کے واسطے سے اس نے ادبی رسالوں کی دنیا میں اپنا امتیاز قائم کیا تھا۔ باقی امتیازات الگ ہیں۔ کس شان کے ساتھ مہینے کے مہینے اپنی پریشانی پر اس شعر کو جھومر بنائے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچتا تھا۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

مگر ہمایوں زمانے کی چال سے دوسروں کو خبردار کرتے کرتے خود اس کی زد میں آ گیا۔ میاں بشیر احمد کی وضعداری یہاں آ کر جواب دے گئی۔ بس اچانک ''ہمایوں'' سے ان کا جی بھر گیا۔ پرچہ بند۔ ناصر کی ادارت ختم۔

دوسری تبدیلی کا احوال بھی سن لیجئے۔ ناصر پرانی انارکلی کے نواح میں ایک گھر کے ایک کمرے میں گزر بسر کر رہا تھا۔ شادی سے پہلے اس رہائش میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ مگر شادی کے بعد یہاں رہائش مشکل ہو گئی تھی۔ ناصر کے ایک پرستار نے جو افسر قسم کی چیز تھے' کرشن نگر میں ایک اچھا خاصا کشادہ مکان اس کے نام الاٹ کرا دیا۔ اس تبدیلی سے ہم سب ہی دوست متاثر ہوئے۔ وہ اس طرح کہ ناصر رات کو اکیلا گھر جائے یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں۔ رات کے جس پہر میں بھی واپسی ہوتی کبھی پوری ٹولی کا پوری ٹولی نہ سہی چند دوستوں کا یہ فرض ہوتا تھا کہ اسے دروازے تک چھوڑ کر آئیں۔ کرشن نگر ذرا دور کا علاقہ تھا۔ رات گئے ناصر کے ساتھ پیدل کرشن نگر

تک جانا' پھر وہاں سے پیدل یا سائیکل پر واپس گھر جانا کم از کم مجھے اکھرنے لگا تھا۔ ہاں اب ایک سہولت ضرور تھی' میری واپسی اکیلی نہیں ہوتی تھی۔ اب سعید محمود بھی ساتھ ہوتا تھا۔

میں نے جب بار بار ریگل کے موڑ پر آ کر کنی کاٹ کر اپنے گھر کی راہ لینے کی کوشش کی تو ناصر نے کہا کہ اچھا ٹولنٹن مارکیٹ تک میرے ساتھ چلا کرو۔ اس سے آگے میں خود چلا جایا کروں گا۔"

"ٹولنٹن مارکیٹ تک کیا خاص بات ہے۔"

ناصر کا جواب سننے سے پہلے اچھا ہو کہ لاہور سے باہر کے یار اس نکڑ کی اہمیت کو سمجھ لیں۔ مال روڈ پر یہ نکڑ ایک زمانے تک مخصوص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ سمجھ لو کہ یہ پورا علاقہ ایک طرح کا کلچرل کمپلکس تھا۔ سامنے پنجاب یونیورسٹی' اس کے بلمقابل عجائب گھر اور نیشنل کالج آف آرٹس' اسی کے عقب میں پنجاب پبلک لائبریری۔ سامنے کافی ہاؤس۔ خود ٹولنٹن مارکیٹ کوئی بہت بڑا مارکیٹ نہیں تھا۔ انگریزوں کے وقتوں کی ایک عمارت تھی' جس میں چند جنرل سٹور اور کچھ مختلف قسم کی دکانیں قائم تھیں۔ سامنے ایک لمبا برآمدہ جس کے آخری گوشے میں جو پرانی انارکلی سے متصل تھا' ایک پان سگریٹ والا بیٹھتا تھا' جس کا دیا شاید رات بھر ہی ٹمٹماتا رہتا تھا۔ واپسی کے سفر میں ناصر کا یہ آخری پڑاؤ تھا۔ یہاں اسے رکنا ضرور تھا۔ رات کا آخری پان کھا کر اور نیا سگریٹ سلگا کر آگے بڑھتا تھا۔ تو میں نے ناصر کو جب بار بار یہ اصرار کرتے دیکھا کہ مجھے بس ٹولنٹن تک چھوڑ آیا کرو تو پوچھا کہ "ٹولنٹن کی نکڑ کی کیا تخصیص ہے؟"

جواب دیا "بات یہ ہے کہ رات کو جب میں ٹولنٹن کے نکڑ پہ پہنچتا ہوں تو سامنے اس نکڑ پہ جہاں بائبل سوسائٹی کی دکان ہے مجھے مولانا حالی کھڑے نظر آتے ہیں۔ گلے میں مفلر' ہاتھ میں چھڑی' اور لب پہ یہ شعر:

مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور
میں اپنی ذات میں اک انجمن ہوں

وجہ معقول نظر آئی اور اب ہم نے جیسے یہ طے کر لیا ہو کہ کتنی بھی رات گزر گئی ہو' ناصر کا اس نکڑ تک ساتھ دینا ضروری ہے اور جب ناصر کو یہ نظر آیا کہ اس سے یہاں سے آگے اکیلے جانا ہے تو پھر اس نے اس کی ایک اور صورت نکالی۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کا احساس ہوا کہ رات کے کسی پہر میں بھی ہم اس نکڑ پہ پہنچیں' یہاں ایک تانگہ کھڑا نظر آتا ہے اور تانگہ والا جیسے کسی کے انتظار میں بیٹھا اونگھ رہا ہو۔ ہمیں دیکھ کر وہ مستعد ہو جاتا۔ ناصر نے رات کا آخری پان کھایا' سگریٹ سلگایا اور بے کہے سنے تانگ میں جا کر بیٹھ گیا۔ اچھا تو گویا اس پان سگریٹ والے کے ساتھ ساتھ اس تانگہ والے سے بھی ناصر کی یاری ہو گئی تھی۔

کبھی کبھی میں اس تانگہ میں بیٹھ کر ناصر کے ساتھ کرشن نگر تک جاتا اور اسے گھر پہنچا کر اسی تانگہ میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ سو رفتہ رفتہ میرا اس تانگہ والے سے تعارف ہوا۔ یہ جالندھر کا مہاجر تھا۔ زمانے سے اسے بہت شکایتیں تھیں۔ اردو کے شاعروں سے بھی زیادہ۔ ایک شکایت اسے ناصر سے بھی تھی۔ کہنے لگا ''ناصر صاحب جی تو وڈے آدمی ہیں۔''

میں نے کہا ''بالکل ہیں۔''

کہنے لگا ''گورنر سے ان کی اتنی دوستی ہے۔ روز وہ ان کے گھر پہ آتا ہے۔ میں نے ناصر صاب جی سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ گورنر سے میری سفارش کر دو۔ وعدہ بھی کر لیتے ہیں پر کرتے نہیں۔''

اس بیان پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ پھر میں نے پوچھا ''تم کیا سفارش کرانا چاہتے ہو؟''

مگر یہ خود اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا سفارش کرانا چاہتا ہے۔ بس وہ یہ کہہ کے چپ ہو گیا ''اس کے قبضے میں تو سب کچھ ہے۔ ایک مرتبہ اس سے میرا ذکر تو کریں۔''

اس شکایت کے باوجود ناصر سے اس کا تعلق خاطر بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ان اوقات میں مجال ہے کہ کسی اور سواری کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔ بیشک گھنٹوں خالی کھڑا رہے' کھڑا رہتا تھا اور انتظار کرتا رہتا تھا۔

ہمایوں سے فراغت کے بعد ناصر کو عجب سوجھی۔ یہ کہ اپنا رسالہ نکالا جائے۔ پہلے میں نے یہ بات ایک کان سنی' دوسرے کان اڑا دی۔ جب وہ اس معاملہ میں سنجیدہ ہوتا چلا گیا تو میں نے پوچھا ''ناصر یہ پرچہ تم کیسے نکالو گے۔ اس کے لیے تمہارے پاس وسائل کہاں ہیں؟''

ناصر نے وسائل کے بارے میں کچھ اس طرح سے نقشہ کھینچا کہ مجھے خیال گزرا کہ اس نے واقعی مختلف ذرائع سے کچھ بندوبست کر لیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ ناصر نے اشتہارات کے سلسلہ میں جو اپنے تعلقات کے حوالے سے معاملہ کی صورت بتائی تھی اس سے لگتا تھا کہ یہ رسالہ تجارتی طور پر بھی اتنا کامیاب رہے گا کہ ناصر کے لیے یہ ذریعہ روزگار بن جائے گا۔ گویا چپڑی اور دو دو۔ ادبی مقاصد کی بھی تکمیل ہو گی اور گھر کا خرچ بھی چلے گا۔

''اس کا نام ہم ''خیال'' رکھیں گے۔ گویا یہ ''خیال'' کا دوبارہ اجرا ہو گا۔''

''اچھا۔''

''اور یہ کہ تم میرے ساتھ ادارے میں شامل ہو گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے' مگر اچھی طرح سوچ لو۔ پھر تین پرچے نکالنے کے بعد بند نہ کرنا پڑے۔''

''خوب سوچ لیا ہے۔ اور تم تو صرف ایڈیٹر ہو' منیجمنٹ تو میرے پاس ہوگا۔ دیکھنا پرچہ کس ٹھاٹ سے نکلتا ہے اور کتنا بزنس لاتا ہے۔''

جب میں پوری طرح قائل ہوگیا تو میں نے کہا ''ایک تجویز میری ہے۔ یہ 1957ء ہے' ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں سن ستاون کی جنگ آزادی کی سوسالہ یاد منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کیوں نہ ہم مئی سے اپنے پرچے کا آغاز کریں اور پہلا پرچہ سن ستاون نمبر کے طور پر پیش کریں۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔'' ناصر نے فوراً ہی اس تجویز کو قبول کرلیا۔ ویسے تو شیخ صاحب نے بھی اس وقت اس تجویز پر صاد کردیا تھا اور سعید محمود تو فوراً ہی سرگرم عمل ہوگیا۔ شہر کی لائبریریاں تھیں اور وہ تھا۔ لائبریریوں کے کونوں کھدروں سے گرد میں اٹی کتابیں درباب سن ستاون ٹٹول ٹٹول کر برآمد کرتا اور ٹی ہاؤس میں شام کو جب ہم اکٹھے ہوتے تو میز پر کتابوں کا اتنا انبار ہوتا کہ بیرے کے لیے پیالیوں کا چننا ایک مسئلہ بن جاتا۔ یار گزرتے گزرتے حیران ہوکر کتابوں کے انبار دیکھتے اور پوچھتے ''تم لوگ ادبی پرچہ نکال رہے ہو یا تاریخ کی کتاب مرتب کر رہے ہو۔'' اور سعید محمود ثابت کرنے پہ تل جاتا کہ ایک ادیب کے لیے تاریخی شعور کا ہونا کتنا ضروری ہے۔

مگر یہ نوزائیدہ تاریخی شعور ہماری صحبت کو راس نہیں آیا۔ شیخ صاحب کا تاریخی شعور سن ستاون کی جنگ آزادی کے بارے میں کچھ اور ہی کہتا تھا۔ ان کا تاریخی شعور روز شام کو ہمارے تاریخی شعور سے اس شدت سے ٹکراتا کہ چائے کی میز پر سن ستاون برپا ہو جاتا۔ شیخ صاحب اتنے برہم ہوئے کہ انہوں نے ٹی ہاؤس ہی آنا چھوڑ دیا۔

مضامین کے ساتھ ساتھ کتنے شاعر دوستوں سے ہم نے سن ستاون کے حوالے سے نظمیں لکھوالیں۔

''مگر افسانہ اس موضوع پر کون لکھے گا۔'' ناصر نے سوال اٹھایا۔

''ہاں' افسانے کا مسئلہ ٹیڑھا ہے۔ افسانہ کون لکھے گا۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تم لکھو گے اور کون لکھے گا۔'' ناصر نے فوراً ہی مجھ پر کاٹھی ڈال دی۔

اس حوالے سے افسانے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرے دھیان میں یہ بات آئی کہ اگر اس عہد کی فضا کو گرفت میں لانا مقصود ہے تو افسانے کی نئی فارم کو سلام کرو اور داستان کی فارم کو برت کر دیکھو۔ سو اس واسطے سے میں نے اس فارم کو برتنے کی جرات

کی اور مختصر داستان ''جل گرجے'' کے عنوان سے لکھی۔ یوں اس فارم سے پہلی مرتبہ میرا ربط وضبط ہوا ورنہ شور تو میں خاصے پہلے سے مچا رہا تھا کہ ناول اور مختصر افسانے کی اصناف تو ہم نے مستعار لی ہیں۔ اظہار کی جو افسانوی صورتیں ہمارے جدی تجربوں سے پھوٹی تھیں وہ کہاں گم ہو گئیں۔

خیر تو خیال کا سن ستاون نمبر بڑی گرمجوشی سے مرتب ہو رہا تھا اور ساتھ میں اگلے پرچے کی تیاریاں بھی ہو رہی تھی۔ جن یاروں کو سن ستاون نمبر دار انہیں کھا رہا تھا وہ خیال کے اگلے پرچے کے لیے قلم تیز کر رہے تھے۔ شاید سب سے پرجوش شاکر صاحب تھے جن کی تصویر تو بعد میں ملنی تھی۔ ایک مضمون انہوں نے اپنے تخلیقی تجربے کے حوالے سے گرما گرمی میں لکھا اور ہمارے حوالے کیا۔

مگر ہوا کیا۔ پرچہ مرتب ہو گیا۔ کتابت کے مرحلے سے بھی گزر لیا۔ مگر مئی کا مہینہ تیزی سے گزر رہا تھا اور پرچے کا دور دور پتا نہیں تھا۔ اب ناصر کے مینجمنٹ کی نزاکتیں ہم پر منکشف ہونی شروع ہوئیں۔ اس نے سرمائے کا جو انتظام کیا تھا۔ اس کی حقیقت بھی اب سامنے آئی۔ خدا خدا کر کے کاغذ کا انتظام ہوا۔ مگر ابھی تو طباعت کا مرحلہ درپیش تھا۔ آخر سودا یہ ہوا کہ پرچہ چھاپ دو۔ مہینے کے اندر اندر پرچہ بک جائے گا اور ہم بل ادا کر دیں گے۔ مگر پرچہ چھپ کر کہیں آخر جون میں آیا۔ اس وقت مارکیٹ سن ستاون کے حوالے سے کتابوں اور رسالوں کے خصوصی نمبروں سے لبریز ہو چکا تھا۔ پھر شہر سے باہر کے آرڈروں کی تعمیل کیسے ہو۔ بس ہم ہی سنتے رہے کہ بہت آرڈر آئے ہیں اور پارسل دمادم بھیجے جا رہے ہیں۔ آخر میں ہوا یہ کہ سارا پرچہ اونے پونے ''آئینہ ادب'' کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ پریس کا بل کچھ اس رقم سے ادا ہوا کچھ ہم نے غلام علی اینڈ سنز کے لیے ایک دو کتابیں مرتب کر کے معاوضہ وصول کیا اور پریس کا حساب بے باق کیا۔ ابن انشا نے کہا کہ یار تم نے جب پہلی مرتبہ ''خیال'' نکالا تھا تو اشتہار میں اعلان کیا تھا کہ اس پرچے کا ایک ایڈیٹر بھی ہوگا۔ جب تیسری مرتبہ ''خیال'' نکالنے کا خیال دل میں لاؤ تو اشتہار میں اعلان کرنا کہ اس پرچے کا ایک ناشر بھی ہوگا۔

سن ستاون کی جنگ آزادی میں بھی شکست ہی تو ہوئی تھی شکست اس حوالے سے ناصر کا بھی مقدر ٹھہری۔ ''خیال'' نکالنے کا خیال اس نمبر کی اشاعت کے ساتھ ہی خواب بن گیا۔

بہر حال ہم نے جیسے تیسے کر کے سن ستاون کی یاد تو منا ہی لی۔ اس واسطے سے ماضی کی تھوڑی خوشبو بھی اپنے میں رچا بسالی' مگر عسکری صاحب نے اس موضوع پر لکھتے لکھتے ماضی کے ساتھ حاضر کا ٹانکا لگا دیا۔ ''1957ء میں دنیا کے مسلمانوں کو جو سنگین مسائل درپیش ہیں ان کے سامنے 1857ء کیا مال ہے۔'' اور یہ کہ ''1957ء میں ہماری آزمائش 1857ء سے بھی کڑی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم 1958ء کے عذر سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں۔''

مگر آزمائشوں نے 1957ء سے گزر کر 1958ء میں زور پکڑا اور عرب دنیا کا تو یہ حال تھا کہ جیسے اسے کسی بڑے انقلاب نے آلیا ہو۔ کتنے عرب ملکوں میں انقلاب آچکا تھا۔ کتنے ملکوں کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ جمال عبدالناصر کا عرب نیشنلزم ایک انقلابی قوت بن کر مغربی سامراج کو للکار رہا تھا۔ اسے سوویت روس کی حمایت و تائید حاصل تھی۔ لیجئے اس چکر میں ہمارے عسکری صاحب کی بھی کایا پلٹ ہوگئی۔ کہاں وہ سوویت روس کے نام سے بدکتے تھے' کہاں اب وہ اس کا کلمہ پڑھتے نظر آتے تھے۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ عرب سوویت روس کی مدد سے امریکہ اور اس کے حلیفوں سے ایسی ٹکر لیں گے کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ سو اب انہیں سوویت روس کی ناگوار باتیں بھی گوارا تھیں۔ ہنگری میں اس کی فوجی کارروائی کی وجہ سے سارتر جیسے روس دوست بھی اس سے فرنٹ ہوگئے تھے' مگر عسکری صاحب نے اس کارروائی کا بھی جواز ڈھونڈ لیا تھا۔

ہاں انہی دنوں قیوم صاحب یونیسکو کی معرفت یورپ کا ایک دورہ کر کے واپس آئے تھے اور ٹی ہاؤس میں یاروں کے بیچ بیٹھ کر سارتر سے اپنی ملاقات کا احوال سنا رہے تھے۔ یہ ملاقات تھی بس یوں سمجھو کہ

''جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا''

سارتر نے ان دنوں ہنگری کے حق میں مہم چلا رکھی تھی۔ قیوم صاحب سے ملاقات ہوئی تو چھوٹتے ہی پہلا سوال کیا کہ ''ہنگری میں روس کی فوجی کارروائی کے بارے میں آپ کا ردعمل کیا ہے۔''

قیوم صاحب نے جواب دیا ''میں تو شاعر ہوں' سیاست سے واسطہ نہیں رکھتا۔''

''مگر میرا تو اس وقت مسئلہ ہنگری ہے۔''

بس اسی پہ سلام علیکم وعلیکم السلام ہوگئی۔

قیوم صاحب کی دلیل سننے کے لیے عسکری صاحب بھی تیار نہیں تھے۔ اس کا مسئلہ عربوں کی جدوجہد تھی اور سب سے بڑھ کر الجزائر کی فرانسیسی سامراج کے خلاف مزاحمتی جنگ۔

ویسے تو ہماری ادبی دنیا میں پہلے ہی سے سارتر کا طوطی بول رہا تھا۔ ایلیٹ پاؤنڈ تو اب اردو والوں کے لیے نئے پرانے ہو چکے تھے۔ اب ٹی ہاؤس کی میزوں پر سارتر اور کامیو کا سکہ چلتا تھا' مگر الجزائر کی جدوجہد کے بارے میں کامیو کے موقف نے اسے فرانس کے دانشوروں کے بیچ ہی خوار نہیں کیا۔ وہ پاکستان میں بھی کم از کم عسکری صاحب کی نظروں میں تو بہت گر گیا۔ ہاں الجزائر کی حمایت نے عسکری صاحب کو سارتر کا اور زیادہ گرویدہ بنا دیا۔ اور پاکستان میں اب سبط حسن سے ان کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ سوویت روس

پیارا تو سوویت روس کے نیاز مند بھی پیارے۔ اب جو چھٹیوں میں کراچی سے لاہور آئے تو ''لیل ونہار'' کے دفتر کے پھیرے لگنے لگے۔ بس انہیں ملاقاتوں سے یہ شگوفہ پھوٹا کہ ادیبوں کی طرف سے یوم الجزائر منایا جائے۔

''پاکستان ٹائمز'' کے دفتر میں فیض صاحب کے کمرے میں گنے چنے ادیب جمع ہوئے' دونوں رنگ کے۔ کچھ ترقی پسند' کچھ رجعت پسند۔ باقی ایسے کہ نہ رجعت پسند میں نہ ترقی پسندوں میں۔ گویا نہ بدنام نہ نیک نام۔ یہی جیسے سید امتیاز علی تاج اور آفتاب احمد خاں۔

یوم الجزائر کے منانے کے سلسلے میں جو کمیٹی بنائی گئی اس کے صدر فیض صاحب' سیکرٹری یہ خاکسار' باقی اراکین میں دو کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ اعجاز حسین بٹالوی اور حمید اختر۔

میں ٹی ہاؤس بعد میں پہنچا۔ یہ خبر پہلے پہنچ گئی۔ یاران حلقہ نے کہا کہ اچھا انتظار حسین ترقی پسند ہو گیا۔ ہماری نئی نسل والی ٹولی نے کہا کہ اچھا تو تم نے پرانی نسل کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ادھر یو ایس آئی ایس میں جو صحافی دوست بیٹھے تھے ان کی نظروں میں ایک دم سے ہمارا چال چلن مشکوک ہو گیا۔ اس ادارے میں راز صاحب خوب بزرگ تھے۔ انہیں مجھ سے مجھے ان سے تعلق خاطر چلا آتا تھا۔ میں نے ہزار الجزائر کے مسلمانوں کے مصائب و آلام کے واسطے دیئے' مگر کوئی قائل نہ ہوا۔ اس زمانے میں کیا الجزائر کی جدوجہد آزادی' کیا عربوں کی سامراج کے چنگل سے نکلنے کے لیے جدوجہد' ان سب کی حمایت کو اشتراکیت کے خانے میں ڈالا جاتا تھا۔

خیر تو چار چھ دن ہمیں بھی فیض صاحب کی ہدایت میں کام کرنے کا فریضہ ادا کرنا پڑا۔ دوسرے تیسرے دن ان کے دفتر میں حاضری دینا' ان سے ہدایات لینا اور جلسہ کی تیاری کے لیے دوڑ دھوپ کرنا' مگر آخر میں آ کر عجب ہوا۔ جلسہ سے ایک دن پہلے میں نے فیض صاحب کو فون کیا۔ پتا چلا کہ وہ تو کراچی گئے ہیں اور ہفتے بعد آئیں گے۔ میرے قدموں تلے سے تو زمین نکل گئی۔ کل جلسہ ہے۔ میں اکیلا کیا کروں گا۔ ویسے بھی جلسے کرنے کرانے کا میرا تو کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ میں تو فیض صاحب کے سہارے چل رہا تھا۔ بس میں نے ایک عقلمندی دکھائی اور یہ نکتہ مجھے عسکری صاحب نے سمجھایا تھا کہ مدعوین کو بتانا مت کہ فیض صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہی میں نے کیا۔ جلسہ کی صدارت کے لیے ایک پریذیڈیم بنایا گیا تھا۔ میاں بشیر احمد' مولانا غلام رسول مہر اور سید امتیاز علی تاج کو گویا مل کر صدارت کرنی تھی۔ میں نے تینوں میں سے کسی کے کان میں یہ بھنک نہیں پڑنے دی کہ جس نے آپ کو صدارت کی دعوت دی تھی وہ جلسہ میں نہیں ہوگا۔ خیر مہر صاحب نے تو جلسہ میں آ کر پوچھا ہی نہیں کہ فیض صاحب کہاں ہیں۔ میاں بشیر احمد نے

پوچھا تو میں نے سرسری کہہ دیا کہ انہیں کسی ضروری کام سے آج کراچی جانا پڑ گیا۔ انہوں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ردعمل کا اظہار تاج صاحب کی طرف سے ہوا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اردگرد نظر ڈالی۔ استقبال کرنے والوں سے مصافحہ کیا۔ پھر پوچھا' بھئی فیض کہاں ہے۔ میں نے ان سے بھی سرسری کہا کہ انہیں کسی ضروری کام سے آج کراچی جانا پڑ گیا۔ اس پر وہ کسی قدر برہمی سے بولے عجب آدمی ہے۔ ہمیں پھنسا کر خود کراچی چلا گیا۔ مگر صدارت کی خالی کرسی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے انہیں زیادہ برہمی کا موقعہ نہیں دیا۔

مقالہ نگاروں میں سرفہرست مولانا صلاح الدین احمد تھے۔ مگر ان کا مسئلہ فیض صاحب تھے ہی نہیں' بلکہ ہوا یوں کہ ابتدائی میٹنگ میں انہیں بلانے کے لیے عسکری صاحب اور سبط صاحب دونوں نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ تم جا کر مولانا سے میٹنگ میں آنے کی گزارش کرو' مگر میری گزارش کا جواب مولانا نے یہ دیا کہ بہت نیک کام ہے' جب جلسہ کرو گے تو میں حاضر ہوں گا اور مقالہ بھی پڑھوں گا' مگر یہ میٹنگ جس جگہ ہو رہی ہے وہاں میں حاضری دینے سے معذور رہوں گا۔

بہرحال جلسہ بہت دھوم سے ہوا۔ الجزائر کی جدوجہد سے جذباتی تعلق ادیبوں کے سوا بھی ایک خلقت کو یہاں کھینچ کر لے آیا تھا۔ وائی ایم سی اے ہال میں جب تل دھرنے کی جگہ نہ رہی تو ہال کے باہر برآمدے میں اور صحن میں اور سیڑھیوں سے نیچے تک مجمع پھیلتا چلا گیا۔

فرانسیسی تسلط کے خلاف الجزائریوں کی جدوجہد نے بہادری اور مزاحمت کی ایک مثال قائم کی تھی۔ ویت نام کے بعد مزاحمت کا یہ دوسرا بڑا استعارہ تھا جو بیسویں صدی کے بیچ ایشیائی افریقی دنیا کو میسر آیا تھا۔ اردو ادب نے بھی اس استعارے کو گرمجوشی سے اپنایا۔ ادبی رسالوں میں ان دنوں یہ موضوع عام تھا' شاید اس استعارے نے شاعروں کو زیادہ گرمایا۔ یوں کہانیاں بھی لکھی گئیں۔ ڈھائی تین کہانیاں میں نے بھی باندھیں' مگر پھر میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ یہ محض فرض کی ادائیگی تھی یا ان کہانیوں کی ادبی قیمت بھی ہے۔ اگر فرض کی ادائیگی مقصود تھی تو وہ تو رسالوں میں اشاعت سے پوری ہو گئی۔ پھر انہیں ادبی کاوشوں کے طور پر مجموعہ میں کیوں شامل کیا جائے۔

ہاں اسی زمانے میں فرانس میں ایک کتاب ''Question'' کے نام سے شائع ہوئی جس نے بہت شہرت پائی۔ یہ ایک فرانسیسی کی اپنی روئیداد تھی' جسے الجزائری جدوجہد سے وابستگی کی بنا پر تشدد کے عمل سے گزرنا پڑا تھا جو فرانسیسی فوج کے ہتھے چڑھ جانے والے الجزائریوں کی تقدیر تھی۔ سارتر نے اس پر ایک زبردست دیباچہ لکھا۔ جب یہ کتاب انگریزی میں ترجمہ ہو کر پاکستان

پہنچی تو اصل کتاب کا ترجمہ ظفر صدانی نے کیا۔ سارتر کا دیباچہ میں نے ترجمہ کیا۔ سعید محمود نے اپنے والد کے ادارے کے طرف سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

اس وقت کسے معلوم تھا کہ اتنے ارمانوں اور اتنے دکھ بھوگنے کے بعد آزادی میسر آنے کو ہے وہ آگے چل کر کیا رنگ لائے گی اور الجزائریوں کو خود اپنوں ہی کے ہاتھوں کیسے بھیانک تشدد سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اصل میں شادی اور آزادی کا معاملہ ایک سا ہے۔ دونوں ہی کام بڑے ارمانوں کے ساتھ انجام پاتے ہیں' مگر کچھ پتا نہیں ہوتا کہ اس کے بعد یہ ارمان پروان چڑھیں گے یا ان کا خون ہوگا۔ پاکستان کا خواب دیکھنے والوں کو بھی کب پتا تھا کہ بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ خواب کی تعبیر الٹی ہو جائے گی۔ وہ لوگ اچھے رہتے ہیں جو خواب کی تعبیر کی چکا چوند میں دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ جو خواب انہوں نے دیکھا تھا وہ بحمد اللہ پورا ہو گیا۔ اذیت ان کے حصے میں آتی ہے جو تعبیر کو الٹتے ہوئے دیکھنے کے لیے زندہ رہتے ہیں۔ جلدی گزر جانے کے اپنے فائدے ہیں۔ زیادہ زندہ رہنے کی اپنی اذیتیں ہیں' تو انہی دنوں پاکستان کی سیاست کا بھی نقشہ الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔ مگر آنے والے وقت کا شاید کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا۔

◆◆◆

مارشل لا کا آنا اور ادیبوں کے دن پھرنا

زمانہ قیامت کی چال چل گیا۔ مارشل لا لگ گیا۔ آنے والے انتخابات کی گہما گہمی ختم' جلسے جلوس بند' لب بند' زباں بند' اخباروں پہ اوس پڑ گئی' لیڈروں کی بیان بازیاں قصہ ماضی ہوئیں۔ اب اخبارات میں ان کی جگہ مارشل لائی احکامات نے لے لی تھی۔

کافی ہاؤس میں ایک تختی نصب کر دی گئی۔ حضرات سیاسی گفتگو سے اجتناب کریں۔ شام کو میں ٹی ہاؤس پہنچا تو معمول کے خلاف خاموشی کا سماں تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں مگر بہت احتیاط کے ساتھ۔ کوشش کہ مارشل لا کو موضوع بحث نہ بنایا جائے' مگر پھر یوں ہوا کہ کسی نے مارشل لا پر کوئی اڑتا سا تبصرہ کیا۔ کسی نے گول مول فقرہ کہا۔ کسی نے اشاراتی انداز میں کوئی بات کی۔ رفتہ رفتہ حجاب اٹھتا گیا۔ اور جب گیارہ بجے کے قریب ٹی ہاؤس بند ہو رہا تھا تو بحث اپنی عروج پر تھی کہ مارشل لا صحیح لگا ہے یا غلط لگا ہے۔

اگلے دن شام کو جب ہم جمع ہوئے تو دفعتاً حسن لطیفی ایک اشتہار قسم کی چیز ہاتھ میں لیے داخل ہوئے۔ ہم سے منہ موڑ کر سونتے ہوئے سامنے آویزاں بلیک بورڈ کے پاس گئے۔ اس پر اشتہار چسپاں کیا' پھر بیرے سے کچھ بات کی۔ وہ لپک جھپک اندر گیا اور دو توس لے کر پلٹا۔ لطیفی صاحب نے توس لیے اور خاموشی سے باہر نکل گئے۔ باہر ایک کتا ان کا انتظار کر رہا تھا۔

ان کے جانے کے بعد ہم نے بلیک بورڈ پر جا کر دیکھا کہ کیا اشتہار ہے۔ یہ لطیف صاحب کی تازہ ترین نظم تھی۔ عنوان تھا۔

''واقعہ خوب ہوا' خوب ہوا' خوب ہوا''

ساتھ میں جنرل ایوب خاں کی وردی میں تصویر۔

یہ شاعر کی طرف سے مارشل لا کا خیر مقدم تھا اور ایوب خاں کو خراج تحسین۔

تیسرے چوتھے دن انجم رومانی غزل لکھ کر لائے۔ اس کا لہجہ دوسرا تھا۔

بیدار اہل قافلہ سونے کے دن گئے
ہشیار آگ میں ہے یہ جنگل گھرا ہوا
ہاں دیکھ کر ذرا کہ اندھیرا ہے راہ میں
ہاں تیز تر قدم کہ ہے بادل گھرا ہوا

اس دور کی بساط پہ ہر شاہ کو ہے مات
گھبرائیے نہ دیکھ کے پیدل گھرا ہوا

انجم صاحب سیدھے سادھے آدمی' جلدی گھبرا جاتے تھے۔ یاروں نے انہیں ڈرایا ''انجم صاحب پکڑے جاؤ گے۔ یہ تو مارشل لا کے خلاف غزل ہے۔''

انجم صاحب بہت پریشان ہوئے۔ وہ تو یہ غزل ''لیل ونہار'' میں چھپنے کے لیے دے آئے تھے۔ فوراً وہاں گئے۔ غزل کے نیچے نوٹ لکھ آئے۔ ''یہ غزل 7 اکتوبر 1958ء سے پہلے لکھی گئی تھی۔''

جب پرچہ چھپ کر آیا اور یاروں نے یہ نوٹ پڑھا تو انہوں نے انجم صاحب کو مزید ڈرایا ''انجم صاحب یہ نوٹ دے کر تو آپ نے مارشل لا حکام کو دعوت دی ہے کہ اس غزل کو پڑھو۔ وہ تو اب اس غزل کو خاص طور پر پڑھیں گے۔''

قینچی کا سگریٹ پینا' کھانسنا اور غزل لکھنا..... انجم صاحب کے یہ تین محبوب مشغلے چلے آتے تھے۔ وضع کے ایسے پکے کہ نہ کبھی سگریٹ کا برانڈ بدلا' نہ کھانسنا بند ہوا' نہ غزل کا رنگ بدلا۔ یہ بھی نہیں کہ وقت کے ساتھ زیادہ پختگی آ جائے۔ پختگی کیا آتی شروع ہی سے پختہ چلے آ رہے تھے۔ سو حلقہ والوں نے استاد انجم رومانی کہنا شروع کر دیا تھا۔ انجم صاحب اس ماموں کے بھانجے تھے جس نے نجومی ہونے کے ناتے ستاروں کے حساب سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ انہیں بادشاہ بننا ہے' بھانجا نجومی تو نہیں بنا' مگر فلکیات میں قدم رکھتا تھا۔ ویلی کوفسکی سے شغف مستزاد۔ ویلی کوفسکی کی سائنسی بحثوں کے حوالے سے ستاروں کا حساب کر کے ہمیں بتاتے کہ طوفان نوح کب آیا تھا اور آسمان سے پتھر کب اور کس طرح برسے تھے۔ مذہبی صحیفوں میں جو معجزے بیان ہوئے ہیں ان سب کو سائنسی سچائیاں بتاتے اور ویلی کوفسکی کا حوالہ دے کر دودھ کا دودھ' پانی کا پانی کر دیتے۔

کٹر مذہبی آدمی ایسے کہ اگلے پچھلے جس بزرگ' جس قاضی مفتی مولوی' جس عالم دین کا نام لیا فوراً فتوی جاری کہ وہ تو مسلمان ہی نہیں تھا۔ نماز کا احوال اللہ جانے مگر روزہ ہم نے انہیں پابندی سے رکھتے دیکھا۔ رمضان کے ایام میں اتوار کے دن جب حلقہ کے جلسہ میں شرکت کے لیے آتے تو جیب میں ایک ٹماٹر ڈال کر بھی لاتے۔ وہ ٹماٹر بیرے کے حوالے کیا جاتا۔ جب حلقہ کا جلسہ ختم کر کے ٹی ہاؤس میں آ کر بیٹھتے تو اس ایک ٹماٹر کا سوپ ان کے سامنے آ جاتا۔ کسی کسی اتوار کو ایک انڈا بھی ساتھ لاتے۔ ٹماٹر کے سوپ کے ساتھ ابلا انڈا۔ یہ گویا خصوصی افطاری کا اہتمام ہوتا۔

سخت اکل کھرے' حلقہ میں مشکل ہی سے کسی سے ان کی بنتی تھی۔ ہنسنے مسکرانے سے سخت پرہیز۔ مگر ہجو اور ہزل لکھنے میں طبیعت

ہمیشہ حاضر دیکھی گئی۔ مبارک احمد کی شادی پر سہرا کہا کچھ اس رنگ کا

اس کی خالہ کا خدا حافظ ہے
جس کا خالو ہو مبارک احمد

صفدر میر کے رنگ ڈھنگ دیکھے تو طبیعت رواں ہوگئی۔ شعر کہا:

دیکھنا رکھیو نہ کوئی در کھلا
پھر رہا ہے شہر میں صفدر کھلا

انہی دنوں اسی فضا میں ناصر نے ایک تازہ غزل لکھی۔

ان سہمے ہوئے شہروں کی فضا کچھ کہتی ہے
کبھی تم بھی سنو یہ دھرتی کیا کچھ کہتی ہے
یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشی آواز نما کچھ کہتی ہے

اور مقطع یہ تھا۔

ناصر آشوب زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلق خدا کچھ کہتی ہے

لیکن ادبی فضا دیر تک سہمی ہوئی نہیں رہتی۔ جلد ہی کراچی سے ایک شگوفہ پھوٹا اور لاہور کے سارے ادیبوں کی نظریں کراچی کی طرف لگ گئیں۔ اس شہر سے کہ ملک کا اس وقت تک صدر مقام تھا۔ سات ادیبوں کا ایک بیان جاری ہوا جس میں مارشل لا کا خیر مقدم کرتے ہوئے نئے حاکموں سے ادیبوں کی بہبود کے لیے کچھ کرنے کی اپیل کی گئی تھی اور یہ ادیب ایسے ویسے نہیں تھے۔ ان میں غلام عباس اور قرۃ العین حیدر بھی شامل تھیں اور اس بیان کے فوراً بعد خبر آئی کہ کراچی میں ادیبوں کا ایک کل پاکستان کنونشن ہوا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کراچی سے یاروں کو بلاوے آنے لگے۔ جس کے نام دعوت نامہ آ گیا وہ نہال ہوگیا' جسے دعوت نامہ نہ ملا اس نے سر پہیہ پیر گاڑی ایک کر دیا اور دعوت نامہ حاصل کر کے دم لیا۔ ادھر جمیل الدین عالی اپنے وقت کے حاتم بنے ہوئے تھے۔ کوئی اس در سے نامراد نہیں پھرا۔ جس نے جھوٹوں کہہ دیا کہ بندہ بھی لکھتا ہے۔ اس کا نام زمرہ ادبا میں درج ہوا اور دعوت نامہ جاری ہوگیا اور اس

ہنگام پتا چلا کہ لکھنے کی قسمیں ہیں اور ادب کی کتنی فرعیں ہیں۔ اس پر انجم رومانی نے ''رائٹر نامہ'' (بروزن آدمی نامہ) کے عنوان سے ایک ہجو لکھ ڈالی جس کی تان یہاں آ کر ٹوٹی کہ

''ٹائپ جو کر رہا ہے سو ہے وہ بھی رائٹر''

بات یہ ہے کہ ادیب کہلانے کو کس کو جی نہیں چاہتا اور اب تو معاملہ ہی ایسا آ پڑا تھا۔ سمجھ لو کہ ادب ذریعہ عزت بننے لگا تھا۔ سو ادیب بننے کے لیے اس آن جی کچھ زیادہ ہی تلملانے لگا

''تپش شوق نے ہر ذرے پہ ایک دل باندھا''

جسے دیکھو دعوت نامہ در بغل ادیب ہونے کا مدعی ہے اور کراچی جانے کے لیے پر تول رہا ہے۔

روانگی سے ایک دن پہلے ٹی ہاؤس میں کرایوں کی رقم تقسیم ہوئی۔ جسے رقم ملتی تھی وہ فوراً اسٹیشن کی طرف دوڑتا تھا کہ جلدی سے سیٹ ریزو کرا لے۔

ناصر نے چائے پیتے پیتے عجب فقرہ کہا ''انتظار' یہ ہم دربار شام میں جا رہے ہیں۔'' دل میں پہلے ہی چور تھا۔ اس فقرے نے ایسی تصویر دکھائی کہ میں تھوڑی دیر کے لیے بالکل ہی گڑبڑا گیا۔ پھر میں نے ہمت کی اور کہا ''یار کرایہ وصول کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ جانے پہ دل نہ ٹھکے تو کرایہ واپس کیا جا سکتا ہے۔''

شہرت بخاری نے یہ بات سنی اور صفدر میر کے کان میں جا پروئی کہ یہ دو آدمی اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کھڑی کرنے کے چکر میں ہیں۔ صفدر نے لال پیلی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ واضح ہو کہ ان دنوں صفدر سے ہم سب ہی یاروں کی گاڑھی چھن رہی تھی' مگر صفدر کا پتا تھوڑا ہی ہوتا تھا کہ کب کس گھڑی آنکھ پہ میل آ جائے۔ اور اقبال کے مرد مومن والی شان کہ اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق۔ عمیق ہو یا نہ ہو شدت اس میں بہت ہوتی تھی۔ دوستی ہوئی تو ایسی کہ تن کے کپڑے اتار کے دے دیئے۔ لڑائی ہو گئی تو پھر اس سے برا کوئی نہیں۔ اور لڑائی کے لیے کسی لمبی چوڑی وجہ کی ضرورت تھوڑا ہی پڑتی تھی۔ کسی ننھی سی بات سے شک کا ایک پہاڑ کھڑا ہو جاتا اور پھر لڑائی سی لڑائی' جیسا میرے ساتھ ہوا۔ وہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ خیر میں بھی ایسا کون سا فرشتہ ہوں۔ لڑنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ وقتاً فوقتاً میرا بھی چاہتا ہے۔ آخر لڑنا بھی تو ظالم و جاہل انسان کی بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ ہاں یہ ہے کہ آدمی دیکھ کر لڑنا چاہیے۔ عزت داروں کا آئین جنگ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ لڑنے سے پہلے دیکھ لیتے ہیں کہ جس سے لڑ رہے ہیں اس کی اپنی بھی کوئی عزت ہے۔ پھر صفدر سے لڑنے میں مجھے ایک اور سہولت بھی نظر آئی۔ ذاتی لڑائی لڑنا کچھ بھلی بات نہیں لگتی۔ صفدر صاحب میں

صفت یہ تھی کہ وہ ذاتیات کو نظریاتی رنگ دے دیتے تھے۔ اس سے لڑائی میں ایمان اور کفر کی جنگ والی شان پیدا ہو جاتی تھی۔

صفدر صاحب کو ہر رجعت پسند شے سے نفرت تھی' معہ اپنی شاعری کے۔ یہاں سے ان کے یہاں ایک تضاد کی صورت جنم لیتی ہے' وہی جو انہوں نے سلیم احمد کے یہاں دریافت کی ہے کہ ''اکثر نظریہ ساز ادیبوں کے یہاں نظریہ بھی ہوتا ہے اور تخلیق بھی' مگر دونوں ایک دوسرے سے روٹھے رہتے ہیں' آپس میں بات چیت نہیں کرتے۔ ہم اپنا منہ ادھر کر لیں تم اپنا منہ ادھر کر لو والا معاملہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ سلیم احمد صاحب کا طور ہے۔ وہ اسلامی ادب کے بڑے زبردست مبلغ رہے ہیں اور ہیں' لیکن خود اپنے فارمولے کے مطابق اسلامی ادب پیدا کرنے کے قائل نہیں معلوم ہوتے۔'' ٹھیک کہا' ویسے اس بیان کو صفدر کی آپ بیتی بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں بھی نظریہ اور تخلیقی تجربہ ایک دوسرے سے روٹھے نظر آتے ہیں۔ نظریہ مارکسی انقلاب' مگر دل اپنا پرانا پاپی ہے۔ بادیلیر سے لے کر میراجی تک ہر زوال پسند پر ریجھا ہوا ہے۔ نتیجہ کیا نکلا۔ یہی کہ قسمت کے مارے ممتاز حسین ایک روز ٹی ہاؤس آ نکلے۔ احمد مشتاق نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور ان پر واضح کیا کہ ترقی پسندوں میں کوئی کھرا شاعر ہے تو وہ صفدر میر ہے۔ ممتاز حسین کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ویسے تو خود مشتاق کا معاملہ بھی سلیم اور صفدر والا ہی تھا۔ وہ عزیز دوسروں کی شاعری میں سیاسی شعور ٹٹولتا رہتا تھا جو بالعموم اسے وہاں دستیاب نہیں ہوتا تھا اور اس بنا پر وہ شاعر مردود و مقہور ٹھہرتا تھا۔ مگر خود مشتاق نے اپنی غزل کو ہر قسم کی سیاسی آلائش سے پاک رکھا اور خالص شاعری کی۔ اور مجھے دیکھو کہ میں ان تینوں دوستوں کی سیاست سے بے تعلق مگر تینوں کی شاعری کا شیدا۔ صفدر سے بہت لڑائی رہی۔ اس کی شاعری سے کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔

بہر حال ان دنوں صفدر صاحب سے ہماری گاڑھی چھنتی تھی۔ انارکلی کے ایک ہوٹل میں ان کا ڈیرا تھا۔ ٹی ہاؤس سے چار قدم کا فاصلہ تھا۔ سو وقت بے وقت ٹی ہاؤس سے نکلے اور صفدر صاحب کے ڈیرے پر۔ دوپہر ہوئی تو اسی دسترخوان پہ کھانا کھایا' وہیں تھوڑی سی کمر لگالی۔ پاکستان کے حالات جس تیزی سے بدل رہے تھے اس کے سبب مجھے اب ان کی شاعری کے ساتھ ان کے سیاسی تجزیوں پر بھی اعتبار آنے لگا تھا۔ سو جب رائٹرز کنونشن کا شگوفہ پھوٹا تو میں نے بطور خاص ان کی سیاسی بصیرت سے استفادے کی کوشش کی۔ اصل میں ہم سب ہی یاروں کو وسوسہ تھا کہ یہ کنونشن کیوں ہو رہا ہے؟ آگے چل کر کیا گل کھلائے گا۔ ادھر مولانا صلاح الدین احمد نے کرتا دھرتاؤں سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس تقریب میں شرکت نہیں کروں گا۔ صفدر صاحب کا کہنا تھا کہ اس کے معنی و مطلب کچھ بھی ہوں مگر اس میں شرکت ضرور کرنی چاہیے۔ وہ اپنے حساب سے کہہ رہے تھے۔ ہمارے حساب میں بھی بال آخر اس

کام میں شریک ہونا ہی نکلا۔

ٹی ہاؤس سے ساتھ چلے تھے۔ کراچی جا کر کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ وہاں سارے ترقی پسند اسی حساب سے آئے بیٹھے تھے' جس حساب سے صفدر صاحب گئے تھے۔ تو ان کی پرواز ان کے ساتھ۔ میں کنونشن کے افتتاحی اجلاس سے نکل کر عسکری صاحب کی طرف ہولیا۔ ادھر ایک نیا اختلاف پھوٹ پڑا تھا' مگر اس کا مجھے ایک دن پہلے ہی پتا چل گیا تھا۔ ایک دن پہلے میری شاہد صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے یہاں اس بات پر بہت تلخی نظر آ رہی تھی کہ کنونشن میں وہ تو شریک ہو رہے ہیں' مگر عسکری صاحب نے ان کا بھی منہ نہیں کیا اور کنونشن میں شریک ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ ویسے عسکری صاحب نے ساقی سے رشتہ پہلے ہی توڑ لیا تھا جب اس کا روس نمبر نکلا تھا' یعنی اینٹی روس نمبر۔

عسکری صاحب کب سے مجھے لکھ رہے تھے کہ ایک پھیرا کراچی کا لگاؤ۔ اب میں وہاں پہنچا تو کس رکھائی سے ملے۔ میں سمجھ تو گیا مگر چپ رہا۔ رفتہ رفتہ کھلے بولے ''میں سمجھ رہا تھا کہ تم اور ناصر نہیں آؤ گے۔''

میں نے کہا کہ شرکت سے انکار کا شرف لاہور والوں میں سے تو بس مولانا صلاح الدین احمد نے حاصل کیا۔ باقی ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب ہی یہاں کھنچے چلے آئے ہیں' مگر آپ کی نیت کا حال تو ہمیں بالکل معلوم نہیں تھا۔''

بولے ''ہاں' وہ تمہارے ابن الحسن میرے پاس آئے تھے۔ میں نے کہا کہ آ جاؤں گا۔ پولیس کو بھیج کے بلوا لینا۔''

پھر عسکری صاحب نے سلیم کو بھی بلوا بھیجا۔ ہم نومبر 1947ء کی ایک ٹھنڈی صبح مغلپورہ کے سٹیشن پر ایک دوسرے سے بچھڑے تھے۔ اب گیارہ برس بعد مل رہے تھے۔ پھر ہم آپس میں ایسے مگن ہوئے کہ کنونشن کو بھول ہی گئے۔ پھر میں نے اختتامی اجلاس ہی میں جا کر ایوب خاں کے خطبہ کو سننے کا شرف حاصل کیا۔

سلیم کو تو 1947ء میں جیسا چھوڑا تھا اب بھی ویسا ہی پایا' مگر وہ جو اس ٹولی کا دوسرا جوان تھا' جمیل خان اور جس نے آگے چل کر جمیل جالبی کے نام سے اپنی محققی کا ڈنکا بجایا وہ کتنا بدل گیا تھا۔ ماشاء اللہ کیا قد نکالا تھا۔ جب میرٹھ میں دیکھا تھا تو نام خدا ابھی شاید مسیں بھی نہیں بھیگیں تھیں۔ چھریرا بدن' گوری رنگت' پتلے پتلے ہونٹ' ستواں ناک' جیسی اچھی صورت ویسا اجلا لباس' میرٹھ کالج کا نیا دانہ اور اب جو دیکھا تو نقشہ کچھ سے کچھ ہو چکا تھا' لمبا قد' چوڑا چکلا بدن' چہرہ سرخ و سفید' کلے میں گلوری' ہونٹوں پر پان کی لالی' جیب میں پانوں کی ڈبیا اور قوام کی ڈبی۔ کتنی جلدی جلدی مگر کس شائستگی سے جیب سے یہ ڈبیاں نکلتی تھیں۔ ''ناصر صاحب' پان لیجئے۔ اور یہ قوام چکھئے۔'' ناصر کاظمی کو جمیل خاں کیا ملے' دونوں جہان کی نعمت مل گئی۔ فوراً ہی مجھے اپنی رائے سے آگاہ کر دیا۔ ''یہ تمہارے جمیل

صاحب آدمی شستہ ہیں۔"

پانوں کی اس ڈبیا اور قوام کی اس ڈبچی نے ہمارے بہنوئی شمشاد حسین کو بھی متاثر کیا۔ "ارے میاں تمہارے دوستوں میں بس یہی ایک جوان کام کا ہے۔ باقی تو سب مجھے یوں ہی سے لگتے ہیں۔"

جمیل جالبی اصل میں اپنے دادا میاں کے ایک خستہ و بوسیدہ مخطوطے سے برآمد ہوئے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ 1948ء میں نظام کے دفتر میں مجھے ایک مخطوطہ موصول ہوا۔ پہلے بوسیدہ ورقے شکستہ خط میں لکھے ہوئے۔ بھیجنے والے جمیل خاں۔ لکھا تھا کہ جالب دہلوی میرے دادا تھے۔ یہ ان کا مخطوطہ ہے۔ اسے نظام میں قسط وار شائع کیا جائے تو کیا خوب بات ہوگی۔ پتا نہیں کتنی قسطیں نظام میں چھپیں' مگر میرا پھوہڑ پن یا محققانہ روایت سے ناآشنائی کہ اس مخطوطہ کو سنبھال کر نہیں رکھا۔ ہاں اور ابھی اس مخطوطہ کی اشاعت کی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہوا تھا کہ ایک اور مخطوطہ موصول ہوا۔ یہ خود جمیل خاں کا مخطوطہ تھا۔ سفید اجلے اوراق جمیل خاں کی خوش نما تحریر۔ موضوع پاکستانی کلچر۔ شاید اس کی بھی کچھ قسطیں نظام میں چھپی تھیں۔

زمانے بعد جمیل خاں نے مجھ سے ان دونوں مخطوطوں کا تقاضا کیا۔ مگر مجھ کم فہم سے ان مخطوطوں کی قدر و قیمت جاننے میں چوک ہوئی۔ اپنی لاپروائی سے انہیں گم کر دیا اور جمیل خاں پر اس کا ردعمل کیا ہوا۔ اپنے لکھے کو تو انہوں نے دوبارہ لکھ ڈالا اور شاید اب مطالعہ اور غور و فکر کے بعد زیادہ سمجھداری سے لکھا۔ یوں ان کی کتاب "پاکستانی کلچر" منصہ شہود پر آئی۔ باقی دادا کے مخطوطے کی گمشدگی کا جواب انہوں نے اس طرح دیا کہ اسی طرح کے خستہ و بوسیدہ کرم خوردہ مخطوطے تحقیق کر کر کے برآمد کرنے شروع کر دیئے اور جلد ہی نقاد سے محقق بن گئے۔ اسے دادا میاں کا فیضان کہنا چاہیے کہ ان کے ایک مخطوطے کی گمشدگی نے ان کے لیے تحقیق کا کام کیا۔ پھر ایسے مخطوطے دریافت کرنا ہی ان کا فن ٹھہرا۔ دادا کے احسان کا بدلہ انہوں نے اس طرح دیا کہ ان کے نام کو اپنے نام کے ساتھ چسپاں کر لیا اور جمیل خاں سے جمیل جالبی بن گئے۔

اب عسکری صاحب کی سنئے۔ اگر ادیبوں کا کنونشن ہوا تو اس میں بے چارے ادب کی کیا خطا ہے۔ عسکری صاحب کو دیکھو کہ وہ ادب ہی سے فرنٹ ہو گئے۔ میں نے حسب عادت ادب کا ذکر چھیڑا تو بولے "یار' میں تو تمہارا ادب وودب اب پڑھتا نہیں' قرآن کے جو اردو ترجمے ہوئے ہیں میں تو آج کل ان کا تقابلی مطالعہ کر رہا ہوں۔"

اور یہ تو حرف آغاز تھا۔ پر ہمیں پتا ہی ہے کہ عسکری صاحب پھر تصوف کے کوچے میں نکل گئے۔ سفر کرتے کرتے آخرش مولانا اشرف علی تھانوی پر جا کر دم لیا۔ پھر انہوں نے بقدر ضرورت ادبی تنقید کا بہشتی زیور بھی یہیں سے برآمد کر لیا' مگر وہ وقت ابھی دور تھا۔

ادب کے معاملہ میں بھی ابھی صرف اردو ادب سے بیزار ہوئے تھے۔ مغربی ادب اور فلسفہ کے رد کی نوبت ابھی نہیں آئی تھی۔ اس وقت تو ان کے یہاں کیمرے اور ایذرا پاؤنڈ کا دور چل رہا تھا۔

ہاں وہ ادبی کنونشن کی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے شہر و دیہات سے جو اتنے بہت سے معروف، نیم معروف، غیر معروف ادیب، نیم ادیب، غیر ادیب اکٹھے ہوئے تھے ان کی بحثوں سے پیدا کیا ہوا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ پیدا ہوا۔ اگرچہ پیدائش آسانی سے نہیں ہوئی۔ ایسی گھڑی بھی آئی کہ جمیل الدین عالی تقریر کرتے کرتے بے ہوش ہو گئے۔ بہر حال رائٹرز گلڈ عالم وجود میں آ گیا اور یہ کہ

''شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر بن گیا۔''

جمیل الدین عالی ادیبوں کے ڈپٹی کلکٹر بن گئے۔

ادیب سمجھے کہ اب ان کے دن پھر جائیں گے۔ محرومی کے دن گئے۔ مرادیں پوری ہوں گی۔ ہوائی بات نہیں کرتا۔ عالی سے سنی کہتا ہوں۔ کیا بزرگ کیا جوان، کیا معروف کیا غیر معروف، ہر طرح کے ادیبوں نے اپنے حساب سے ادب کی، زبان کی، قوم کی جو خدمات انجام دی تھیں اس کا احوال لکھ لکھ کر گلڈ کے دفتر میں بھیجنا شروع کیا

''لکھتے نامہ لکھے گئے دفتر''

ویسے قسمت والوں کی مرادیں پوری بھی ہوئیں۔ کتنوں کے دن واقعی پھر گئے۔ فیض، بہتوں کو پہنچا، کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ آدم جی انعام تو خیر اونٹ کی ڈاڑھ میں زیرہ بن کر رہ گیا۔ پہلے مرحلے میں یہ انعام دو ہی لکھنے والے حاصل کر سکے۔ غلام عباس اور شوکت صدیقی۔ محرومین کو شور مچانا ہی تھا، سو مچایا۔ بہر حال مدیں اور بھی تھیں۔ ہاں سیر و سفر کی صورتیں بھی پیدا ہوئیں۔ پہلے ہی ہلے میں ادیبوں کا ایک جہاز بھر کر مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان بھیجا گیا۔

کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے
پھر بھی کتنے رہ گئے مگر مے باقی ماہتاب باقی

ادھر مولانا صلاح الدین احمد تھے جو عسکری صاحب کی طرح کنارہ کش ہو کر نہیں بیٹھے۔ معلوم ہوا کہ موقعہ کی تاک میں تھے۔ موقعہ جلدی ہی آ گیا۔ حلقہ ارباب ذوق کا سالانہ جلسہ ہوا۔ مولانا نے صدارت کی۔ کنونشن اور رائٹرز گلڈ کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ شاعری جزویست از پیغمبری۔ ادیب تو پیغمبر ہوتے ہیں۔ کبھی پیغمبروں نے بھی گلڈ بنائے ہیں۔ فقرہ چلنے والا تھا۔ خوب چلا۔

ویسے ہم آپ جیسے پیغمبر تھے۔ وہ ہم آپ جانتے ہی ہیں۔ من آنم کہ من دانم۔

مولانا نے اسی پر بس نہیں کیا۔ زبان کھلی سو کھلی۔ اصل میں سیاسی لیڈروں نے تو بولنا بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ اس زبان بندی کے زمانے میں غیر متوقع حلقوں سے آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ ایک جج صاحب رواں ہو گئے۔ یہ جسٹس کیانی تھے۔ انہوں نے طنز و مزاح کو پردہ بنایا اور جاری ہو گئے۔ مولانا اپنے رنگ سے شروع ہوئے اور ایسے شروع ہوئے کہ ایک دفعہ ایوب خاں کے روبرو بات کرنے پہ تل گئے۔ وہ انجمن حمایت الاسلام کا سالانہ جلسہ تھا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ میں وہاں کس تقریب سے پہنچا تھا جہاں تک یاد پڑتا ہے یہ وہ موقعہ تھا جب جمال عبدالناصر نے پاکستان کا دورہ کیا تھا اور جب اس کا لاہور میں ورود ہوا تو میں نے سوچا کہ عربوں کے خاکستر سے یہ جو چنگاری اٹھی ہے اسے ضرور دیکھنا اور سننا چاہیے۔ سو میں نے اپنی اخبار نویسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی استقبالیوں میں اپنی شرکت کا بندوبست کر لیا۔ اسی ریلے میں انجمن کے جلسہ میں بھی جا پہنچا۔ وہاں جمال عبدالناصر کو بعد میں سنا۔ پہلے کچھ اور ہی دیکھنے اور سننے کو ملا۔ دیکھا کہ ایوب خاں کرسی صدارت پر رونق افروز ہیں۔ اور مولانا مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ کیا گرم مقالہ تھا کہ ایوب خاں کے چہرے پہ ایک رنگ جائے ایک رنگ آئے۔ جب اس مرد آہن کے بولنے کی باری آئی تو کھڑا ہوا۔ کہا کہ ابھی مجھے کسی صاحب نے بتایا ہے کہ یہ جو صاحب ابھی بول رہے تھے یہ اردو کے کسی رسالہ کے ایڈیٹر و ایڈیٹر ہیں۔ تحقیر آمیز لہجہ میں ایسے ہی چند کلمات کہے اور پھر اسی گرمی میں پوری تقریر کر ڈالی۔

مولانا کیا وضع کے پکے تھے۔ جو شعار اپنا لیا پھر مجال ہے کہ اس سے سر مو تجاوز کر جائیں۔ گھنی مونچھیں' بھرا بھرا جسم' بر میں سوٹ' سر پہ ہیٹ' ہاتھ میں چھڑی جاڑے' گرمی' برسات' کوئی بھی موسم ہو یہ لباس اپنی جگہ قائم ہے۔ سواری سے اجتناب۔ پیدل چلنا شعار میں شامل۔ مئی جون کے ایام' دوپہر کا وقت' چلچلاتی دھوپ مگر مولانا ہیں کہ اسی طرح سوٹ پہنے چھڑی ہاتھ میں لئے پیدل مال پہ چلے جا رہے ہیں۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ادبی دنیا کے دفتر سے کہ مال پر واقع تھا' نکلتے اور چھڑی ٹیکتے نگینہ بیکری کی طرف چل پڑتے۔

اسی شاہراہ پر ادبی دنیا کے دفتر سے تھوڑے فاصلہ پر آفاق کا دفتر تھا جہاں میں کام کرتا تھا۔ اکثر اسی راہ پر میری ان سے مڈھ بھیڑ ہوتی۔ میں اپنے کالم پر ان سے داد لیتا اور ٹی ہاؤس کی طرف مڑ جاتا۔ وہ آگے جا کر نگینہ بیکری کی طرف مڑتے۔

دربیان بلونگڑا روحانیت

ہاں اسی عمارت کے ایک چھوٹے سے گوشے میں اشفاق احمد نے اپنا داستان گو کا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ ایک ہلکی پھلکی خوبصورت سی ریسنگ سائیکل پر سوار یہاں پہنچتے اور اپنے داستان گو کے شغل میں جت جاتے۔ یہ ہمسائیگی اس روز ختم ہوئی جس روز پروگریسو پیپرز

لمیٹیڈ کو مارشل لا حکومت نے میاں افتخار الدین سے چھین کر اپنے تصرف میں لے لیا اور قدرت اللہ شہاب نے بڑے خضوع و خشوع سے وہ مشہور اداریہ لکھا جو پاکستان ٹائمز میں ''نیو لیف'' کے عنوان سے اور ''امروز'' میں ترجمہ ہو کر ''نیا ورق'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے ساتھ ''لیل و نہار'' کے بھی شب و روز بدل گئے۔ سبط حسن رخصت' اب اشفاق احمد اس پرچے کے ایڈیٹر تھے۔ مگر یہ ایڈیٹری چند روزہ تھی۔ اشفاق کو تو ابھی بہت آگے جانا تھا۔

اشفاق احمد افسانے سے شروع ہوئے تھے۔ پھر افسانہ پیچھے رہ گیا' وہ آگے نکل گئے۔ افسانے کے آسمان کا یہ ٹوٹا ہوا تارا الیکٹرونک میڈیا کے فلک پر جا کر مہ کامل بنا۔ پہلے ان کی ریڈیائی پروگرام تلقین شاہ نے شہرت و مقبولیت حاصل کی اور ایسی شہرت و مقبولیت کہ خود ان کا دوسرا نام تلقین شاہ ٹھہرا۔ پھر ملک میں ٹیلی ویژن آ گیا اور پھر لگا کہ اشفاق کو اصل زبان تو اب ملی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس عزیز نے کچھ اور شوق بھی پیدا کر لیے۔ شوق تصوف کے ساتھ ایک شوق یہ ٹھہرا کہ کسی پہنچے ہوئے بزرگ کو تلاش کیا جائے اور اس سے فیض حاصل کیا جائے۔ پہنچے ہوئے بزرگ کو وہ اپنی محبت کی زبان میں بابے کہتے ہیں۔ بابے کی تلاش کے شوق نے رفتہ رفتہ یہ شکل اختیار کی کہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد کونے کھدرے سے ٹٹول کر کسی بابے کو لاتے ہیں۔ گھر پہ یاروں کو جمع کر کے کھلاتے پلاتے ہیں' پھر اپنی نئی دریافت پر ان سے داد مانگتے ہیں۔ تھوڑے دنوں میں جب اس بابے سے جی بھر گیا تو اسے فراموش کیا اور نئے بابے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ پھر کوئی نرالا دانہ ڈھونڈ کر لانا' یاروں کی دعوت کرنا اور نئی دریافت پر داد مانگنا۔ اس عمل میں کتنے بابے آئے اور چلے گئے۔ اشفاق احمد اپنی جگہ قائم ہیں۔

اشفاق احمد تصوف سے بھی شغف رکھتے ہیں اور سگان دنیا کے بیچ گزارہ بھی سلیقہ سے کرتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا کہ ان ضدین کے ساتھ نباہ کیسے کرتے ہو' تو انہوں نے مجھے کچھ تصوف کے رموز سمجھائے۔ کہا کہ روحانیت کی دو قسمیں ہیں۔ بندر روحانیت اور بلونگڑا روحانیت۔ بندر روحانیت کیا ہے یہی کہ بندر کا بچہ ماں سے چمٹا رہتا ہے۔ بندریا درختوں کوٹھوں پر لمبی چھلانگیں لگاتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ چھٹا ہوا ہے۔ اگر کبھی اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے تو ایسا گرتا ہے کہ اس کا سر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ تو اے بندر کے بچے' اے ظالم و جاہل انسان' تو دانش سے پیوستہ رہ' ورنہ ایسا گرے گا کہ تیرا سر پاش پاش ہو جائے گا۔

اور بلونگڑا روحانیت۔ اس کا تت یہ ہے کہ بلی کا بچہ ماں کو نہیں پہچانتا۔ اس سے بے تعلق کسی بھی چیز جو اسے بھا جائے کھیلنے لگتا ہے۔ مگر جب بھوک لگتی ہے یا کوئی افتاد پڑتی ہے تو میاؤں کرتا ہے۔ ماں اس کی پکار سنتی ہے اور دوڑ کر آتی ہے۔ غافل انسان بھی یوں خدا کو بھلا بیٹھتا ہے۔ مگر جب مصیبت پڑتی ہے تو میاؤں کرتا ہے اور اللہ غفور الرحیم فوراً اس کی میاؤں سنتا ہے۔

تو اے اشفاق احمد کی بلونگڑا روحانیت سمجھو کہ وہ دنیا کے سارے شوق کرتے ہیں۔ ٹی وی ریڈیو سے کھیلتے رہتے ہیں' سیریل پہ سیریل باندھتے چلے جاتے ہیں۔ بیچ بیچ میں میاؤں کرتے ہیں اور اللہ میاں ان کی میاؤں سنتا ہے۔

اشفاق احمد تحریر و تقریر دونوں کے بادشاہ ہیں۔ قلم بھی خوب چلتا ہے۔ زبان بھی خوب جوہر دکھاتی ہے۔ جب وہ محفل میں بیٹھ کر یا سٹیج پر کھڑے ہو کر جاری ہوتے ہیں تو انہیں سنتے جاؤ اور سر دھنتے جاؤ۔ میں جب انہیں سنتا ہوں تو میری ایک آنکھ ہنستی ہے' دوسری آنکھ روتی ہے۔ سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ وہ جو ایک بات لچر سی بزبان ملا تھی اسے اس شخص سے اپنی طاقت لسانی سے کیا بنا دیا۔ جب وہ کسی بابے کو تلاش کر کے لاتے ہیں تو میری ایک آنکھ ہنستی ہے' جب مسجد کے ملا کو بانس پہ چڑھاتے ہیں تو میری دوسری آنکھ روتی ہے۔

◆◆◆

زمانہ بدل گیا

صاحبو زمانہ بدل گیا۔ نئی سواریوں کی نمود ہے۔ پرانی سواریاں پسپا ہونے لگی ہیں۔ زمانہ اصل میں سواری کے حساب سے بدلتا ہے یا شاید سواریاں زمانے کے حساب سے بدلتی ہیں۔ بارے اس سڑک کا بیان ہو جائے جسے سیلانی لاہور کا دل جانتے ہیں اور مال روڈ بہت کشادہ نہ ہوتے ہوئے بھی کشادہ اور پرسکون نظر آتی تھی۔ دائیں بائیں چوڑے فٹ پاتھ' بلند و بالا درخت اور سبزے کے تختے' بیچ بیچ میں پھولوں کی کیاریاں' سڑک پر کاریں کم اور تانگے زیادہ۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کوئی بس نمودار ہوتی اور منی بس' ڈبل ڈیکر اور ہاں سائیکلیں' سائیکلوں میں زیادہ نمایاں زنانہ سائیکلیں کہ انقلاب انگیز فلم جس کا نام ''رومن ہولی ڈے'' تھا ابھی یہاں نہیں لگی تھی' سو ہر کمر چوٹیا سے آراستہ نظر آتی تھی۔ کسی کمر پر ایک چوٹیا' کسی کمر پر دو چوٹیاں اور رنگ برنگ قمیصیں اتنی نیچی کہ گٹوں کو چھوتے چھوتے رہ جاتی تھیں۔ سائیکلوں پر دوڑی چلی جا رہی ہیں۔ رخ یونیورسٹی کی طرف ہے۔

اور تانگہ وہ اس شہر میں ابھی ایک معزز سواری سمجھا جاتا تھا۔ شرفاء ٹھسے سے تانگہ کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہیں اور مال سے گزر رہے ہیں۔ دن ڈھلنے لگا ہے۔ ایک تانگہ نمودار ہوا ہے۔ کافی ہاؤس کی سمت اس کا رخ ہے۔ پچھلی نشست پر ایک بزرگ صورت شخص چھڑی سنبھالے بیٹھا ہے۔ بھاری جثہ' لمبے تڑنگے' مونچھیں بھری بھری' آنکھیں پر عینک لگی ہوئی' یہ مولانا چراغ حسن حسرت ہیں۔ معمول کے مطابق کافی ہاؤس پہنچیں گے روزانہ کی صحبت گرم ہوگی۔

چھریرا بدن' گوری رنگت' پتلے پتلے نقش' سنہری کمانی والی عینک' بر میں بگلے جیسا سفید ململ کا کرتا' پتلی موری والا پائجامہ' یہ سعادت حسن منٹو ہیں۔ ان کے ادھر سے گزرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ تانگہ میں بیٹھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ ان کی اپنی سواری ہے اور تانگہ والا بھی جان لیتا ہے کہ آج کا دن اس سواری کے لے وقف ہے۔ منٹو صاحب شہر کے ہر تانگہ والے سے توقع رکھتے تھے کہ وہ منٹو کو جانتا ہے۔ بالعموم وہ جانتے بھی تھے۔ کوئی بدنصیب سوال پر اس نام سے لاعلمی کا اظہار کرتا تو سمجھ لو وہ منٹو صاحب کی نظروں سے گر گیا۔

مگر وہ معززین بھی تو تھے جو مال پر پیدل چلنا پسند کرتے تھے۔ جون کی تپتی دوپہر ہے۔ سورج سوا نیزے پر آیا معلوم ہوتا ہے۔ ایک بزرگ بر میں سوٹ' سر پہ سولر ہیٹ' ہاتھ میں چھڑی' آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے مال کے فٹ پاتھ پر چلتے نظر آتے ہیں۔ یہ

مولانا صلاح الدین احمد ہیں۔ ''ادبی دنیا'' نکالتے ہیں۔ اردو بولو اردو لکھو کا ورد کرتے ہیں۔ اپنے رسالہ کے دفتر سے نکلتے ہیں۔ شاید نگینہ بیکری کی طرف جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی' مولانا حامد علی خاں' بس ایسے ہی بزرگ ہوں گے جن سے ملاقات کریں گے اور ہاں ایسی ہی گرم دوپہر' بھاری جثے کا آدمی' اسی طرح سوٹ بوٹ ڈالے' سر پہ سولر ہیٹ جمائے آہستہ آہستہ چلتا نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں چھڑی نہیں ہے' اس لیے ہم دور سے دیکھ کر حکم لگا سکتے ہیں کہ یہ عبدالمجید بھٹی ہیں۔

شام ہو رہی ہے۔ پروفیسر سراج ہاتھ میں چھڑی گھماتے گورنمنٹ کالج کی طرف سے نمودار ہوتے ہیں۔ ان کے ہمراہ مسز سراج ہیں۔ اتنی دبلی کہ پھونک مارو تو اڑ جائیں' مگر کتنی تیز چلتی ہیں۔ یہ تیز قدم جوڑا سیر کی غرض سے نکلا ہے۔ لارنس باغ تک جائے گا اور واپس اسی راہ اپنے گھر جائے گا۔

اور ہاں صفدر میر' دن ڈھلے انارکلی میں اپنے ٹھکانے سے نکلے۔ ٹی ہاؤس میں جھانکا۔ مختلف میزوں پر نظر ڈالی' جس نوجوان میں اچھے سامع ہونے کے جوہر نظر آئے اسے میز سے اٹھایا۔ ''چلو میرے ساتھ ٹہلنے'' اور نکل گئے لارنس کی طرف۔

مگر ناصر وقت کی قید سے آزاد ہے۔ کبھی ٹیکا ٹیک دوپہر میں کبھی رات گئے یادوں کے ساتھ اس راہ پر بھٹکتا نظر آئے گا۔

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے

لیکن اگر وہ دوپہر کا وقت ہے اور موسم پت جھڑ کا ہے اور ناصر اکیلا سگریٹ پیتا اس راہ پہ جا رہا ہے تو سمجھ لو کہ' پتے جھڑنے کا سماں دیکھنے کے لیے لارنس جا رہا ہے۔

ذرا گھر سے نکل کر دیکھ ناصر
چمن میں کس قدر پتے جھڑے ہیں

مگر ان دنوں تو مال پر بھی اتنے پتے جھڑتے تھے کہ ساری سڑک پر پیلے پتوں کا فرش بچھا نظر آتا تھا۔ وقفے وقفے سے کوئی کار تیزی سے گزرتی تو یہ پتے منتشر ہو جاتے اور پھر جیسے دوڑتی ہوئی کار کا تعاقب کر رہے ہیں۔

مگر صاحبو' وہ زمانہ گزر گیا۔ اب زمانے کا چلن اور تھا۔ اس سڑک کا رنگ بھی اور ہوا۔ پاکستان نے ایک دہائی پوری کر لی تو پھر رنگ فلک بدلا' مارشل لا لگا' اور جرنیل ایوب خان نے کوس لمن الملکی بجایا۔ پھر زمانہ بدلا۔ نئی سواریاں نمودار ہوئیں جو تیز دوڑتی تھیں اور شور سوا کرتی تھیں۔ سکوٹر نمودار ہوا پھر رکشا کی نمود ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی پیلی ٹیکسی کا ورود ہوا۔ اور موٹروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

نئی سواریوں کی اس دوڑ میں تانگہ بہت پیچھے رہ گیا۔ بہت جلد مال پر اس کا داخلہ بند ہو گیا۔ پھر احساس ہوا کہ ٹریفک زیادہ ہے اور سڑک تنگ ہے اسے کشادہ ہونا چاہیے۔ سو دورویہ بلند و بالا درخت کٹنے لگے' سبزے کے تختے ادھڑنے لگے پھولوں کی کیاریاں اجڑنے لگیں' سڑک کو وسیع کیا جا رہا تھا' اس کے دائیں بائیں کچے پکے رستوں کو بغلی سڑکوں کی شکل دی جا رہی تھی۔

لیجیے مال روڈ چوڑی ہو گئی' مگر اہل دل پر وہ تنگ ہوتی چلی گئی۔ پہلے وہ اپنے دورویہ درختوں پر تنگ ہوئی' پھر اپنی سب سے معزز سواری تانگہ پر تنگ ہونے لگی۔ سو مولانا صلاح الدین تنگ ہوئے اور جلدی دنیا سے گزر گئے۔ منٹو صاحب کا تانگہ تو بہت پہلے ہی اس شاہراہ پر نمودار ہونا بند ہو گیا تھا اب مولانا چراغ حسن حسرت نے بھی آنکھ بند کر لی اور وہ تانگہ جو روز دن ڈھلے کافی ہاؤس کی طرف جاتا نظر آتا تھا اب اس شاہراہ پر کیوں نظر آنے لگا تھا۔

اب ہماری سنو۔ میں پہلے یہ بتا دوں کہ رفتہ رفتہ ناصر کے اثر میں آ کر میں بھی اپنی سائیکل کو تیاگ کر پیدل ہو گیا تھا۔ ناصر کے لیے تو ٹولنٹن کے نکڑ پر ایک تانگہ بہر حال منتظر کھڑا رہتا تھا۔ یہ جالندھری تھا۔ وہیں کہیں ایک تانگہ والے نے مجھے بھی پیدل دیکھ کر تاڑا اور اپنی مستقل سواری کے طور پر چن لیا۔

''میرا نام لئیق ہے'' دیر تک اپنے گھوڑے کو تکتا تکتا کر جب راہ پر لے آیا تو پھر مجھ سے مخاطب ہوا ''آپ نے کسی تانگہ والے کا ایسا نام نہیں سنا ہوگا۔ میں جی ان سب تانگہ والوں سے الگ کھڑا ہوتا ہوں۔''

''اچھا' وہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

بولا ''اجی' یہ سب کے سب تانگہ والے ہیں۔ اس کے ساتھ مل کر میں بھی تانگہ والا بن جاؤں گا۔ میں ان سے بات ہی نہیں کرتا۔ الگ کھڑا رہتا ہوں۔ یہ جو جالندھری ہے جو تمہارے ناصر صاحب کو لے جاتا ہے اس سے بھی میں کلام نہیں کرتا۔''

ویسے جالندھری تانگہ والا بھی اپنی جگہ ایک شے تھا۔ ناصر کاظمی سے ایسا مانوس ہوا تھا کہ رات کو ہم چل پھر کر کسی بھی پہر ٹولنٹن مارکیٹ کے نکڑ پہ پہنچتے' وہ موجود ملتا۔ رات کے ایک بجے کے لگ بھگ یہاں آن پہنچتا' پھر کوئی سواری نہیں لیتا' ہم جب پہنچتے تو اونگھتے اونگھتے جھرجھری لیتا اور چوکنا ہو جاتا۔ ٹولنٹن کے برآمدے میں بیٹھے بوڑھے پنواڑی سے رات کا آخری پان کھاتا' سگریٹ سلگاتا اور تانگہ میں بیٹھ جاتا۔

اصل میں اس نکڑ پر آ کر ہماری پیادہ پائی ختم ہوتی۔ ناصر کرشن نگر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ میں بھی یہاں سے اپنے لیے سواری کا بندوبست کرتا۔ لئیق نے مجھے تاڑا اور جلد ہی اپنی مستقل سواری بنا لیا۔

لئیق کا اپنا رنگ تھا۔ زبان اس کی قینچی کی طرح چلتی تھی۔ ٹولنٹن سے فروز پور روڈ پر نہر کے کنارے تک کا رستہ جہاں میں رہتا تھا اچھا خاصا لمبا رستہ تھا۔ اس پورے رستے وہ کبھی خاموش نہیں پایا گیا۔ رستے میں کوئی سواری مل جاتی تو مجھ سے پوچھتا ''اس وقت اس غریب کو سواری کہاں ملے گی۔ کہو تو بٹھالوں۔'' میں کہتا ''ضرور بٹھالو۔''

مگر پھر یہ سلسلہ اس نے خود ہی بند کر دیا۔ سواری کو دیکھ کر آگے بڑھتا چلا جاتا۔ پھر کہتا ''آپ نے تو اجازت دے رکھی ہے۔ پر میں نے سوچا کہ یہ بات غلط ہے۔ ہماری باتوں میں خلل پڑتا ہے۔

اور باتیں کون سی کوئی پورب کی کوئی پچھم کی۔ سب سے بڑھ کر اپنے معرکے ''صاب جی ایک بیر کیا ہوا کہ میرا بھتنے سے مچیٹا ہو گیا۔ میں نے اسے ٹکر ماری پر اس پہ ذرا جو اثر ہوا ہو۔ پھر میں نے اس کو کولھی بھر کے دے پٹکا۔ پر وہ نیچے گرنے کے بجائے اور اوپر اٹھ گیا۔ پھر میں سمجھ گیا۔ اے لئیق تو کس سے بھڑ گیا' یہ تو بھتنا ہے' جی رات بھر اس سے کشتم کشتا ہوتی رہی۔ مجھ میں ان دنوں کس بل بہت تھا۔ بس ڈٹا رہا۔ جب پو پھٹی تو میں نے دیکھا کہ اس کی طاقت گھٹ رہی ہے۔ بس میں اسے پٹخنی دینے لگا تھا کہ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ کہا کہ اب کل کی رہی۔ آ جائیو' میں نے کہا کہ آ جاؤں گا۔ سو دوسری رات میں وہاں پہ پہنچ گیا۔ میں بھی ڈنڈ پیل کے تیل مل کے گیا تھا' سالے کو نانی یاد آ گئی ہوگی۔ پر گرا نہیں۔ پھر جب پو پھٹنے لگی اور اس کا زور گھٹنے لگا۔ تو میں نے کہا کہ استاد آج فیصلہ ہو جائے۔ بس اس نے ہار مان لی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ وہ اس جگہ سے تیس میل دور چلا جائے۔ تو جی وہ تیس میل دور چلا گیا۔ بستی والوں نے سکھ کا سانس لیا۔ سب اس سے تنگ تھے۔''

مگر یہ کہانی یہاں ختم تھوڑا ہی ہوئی۔ لئیق نے آگے کی بات اس طرح سنائی۔ ''لو جی اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہمارے نگر سے ایک ٹولی چلی۔ لمبا سفر تھا۔ رستے میں رات ہو گئی اور بارش ہونے لگی۔ انہوں نے ایک پیڑ کے نیچے بسیرا کیا۔ لو جی اتفاق کی بات کہ وہ جگہ ہمارے نگر سے تیس میل دور تھی اور جس پیڑ کے نیچے انہوں نے بسیرا کیا اس میں اسی بھتنے نے اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ یہ بے چارے بھوکے پیاسے کہہ رہے تھے کہ یار مارے گئے آنتیں ہماری قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں' کیسے رات گزرے گی' اوپر سے آواز آئی' فکر مت کرو' کہو تو نیچے آ جاؤں۔ یہ پہلے تو ڈرے' پھر ایک جوان نے ہمت کر کے کہا آدمی کا بچہ ہے تو نیچے آ جا۔ وہ دھم سے نیچے کودا اور ساتھ ہی کھانے کی دیگ۔ کہا' لو کھاؤ۔ انہوں نے ڈٹ کر کھایا۔ جب چلنے لگا تو بولا کہ تم لئیق کو جانتے ہو۔ کہا کہ ہاں جانتے ہیں۔ اچھا تو پہلوان کو میری سلام علیکم دے دینا۔ انہوں نے آ کے مجھ سے کہا کہ لے بھئی جانے وہ کون بلا تھا' تجھے جانتا تھا۔ تجھے سلاما لیکم بھجوائی ہے۔ میں نے کہا کہ سامنے برجی پہ رکھ دو۔ بس جی فوراً ہی برجی چیخ گئی۔''

لئیق رکا۔ پھر بولا ''بس جی مجھے عقل آ گئی۔ سلا مالیکم لے لیتا تو میں چیخ جاتا۔ اسنے سلا مالیکم میں جادو لپیٹ کے بھیجا تھا۔''

پھر ایک رات اس نے اپنا ایک اور معرکہ سناڈالا ''صاب جی میں رات کو عورت کی سواری نہیں لیتا۔ عورت کا کیا اعتبار' اندر سے جانے کیا نکلے۔ ایک بیر میرے ساتھ ہو چکی ہے۔''

''کیا ہو چکی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مت پوچھو جی۔ وہ عورت تھی بھی بہت بانکی۔ میرا دل یوں یوں کرے۔ میں نے دل میں کہا لئیق آج تو اپنی قسم توڑ دے۔ تو میں اسے تانگہ میں بٹھانے لگا تھا کہ اچانک میری نظر اس کے پیروں پہ پڑ گئی۔ میں چونکا' ابے لئیق' مارے گئے' یہ تو پچھل پیری ہے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بڑھ کے جھٹ سے اس کے سر کا ایک بال توڑ لیا۔ بس جی وہ تو میرے پیروں پہ گر پڑی۔ پچھل پیری کا بال توڑ لو اور زمین میں گاڑ دو' پھر وہ تمہاری لونڈی ہے۔ میں نے یہی کیا۔ کچھ دنوں اس کے ساتھ خوب مزے کیے۔ جب دل بھر گیا اور اس نے بہت منت سماجت کی تو میں نے زمین سے کھود کے بال نکالا اور اس کے حوالے کیا۔ بس فوراً ہی رفو چکر ہو گئی۔''

اگر عورت پچھل پیری نہ ہو تو پھر اسے کیسے قابو کیا جائے۔ اس کے بھی بہت سے گر لئیق کے پاس تھے۔ ایک عورت ہی کو قابو میں لانے کا معاملہ نہیں اور کتنے معاملات میں لئیق کو کتنا درک تھا' تو اب ناصر سے زمین و آسمان کی باتیں سننے کے بعد میں لئیق سے ایران توران کی سنتا تھا اور خدا کا کرنا دیکھو کہ اب وہ سواری بھی اسے مل گئی جس پر شروع ہی سے اس کے دانت تھے۔ ایک رات جب ہم ٹولنٹن پہنچے تو دیکھا کہ ناصر کا تانگہ والا غائب ہے۔ ناصر کو پریشان دیکھ کر لئیق تانگے سے اتر کر آیا اور فاتحانہ انداز میں بولا۔ ''ناصر صاحب' آپ کا جالندھری اب نہیں آئے گا۔ اس نے تو ٹیکسی خرید لی۔ میں آپ کو پہنچائے دیتا ہوں۔''

ناصر کو گھر پہنچانے کے بعد جب میں اپنے گھر کی طرف چلا تو رستے میں لئیق کہنے لگا۔ ''جالندھری بھی سچا تھا' تانگہ کا کاروبار اب بہت مندا جا رہا ہے۔''

میں بولا۔ ''تو کیا تم بھی ٹیکسی کی سوچ رہے ہو۔''

''توبہ کرو جی۔ تانگہ چلانے کے بعد ٹیکسی چلاؤں۔ نہیں جی نہیں۔ اور میں اپنے گھوڑے کو کیسے چھوڑ دوں۔ یہ میری بات سمجھتا ہے۔ ٹیکسی تو مشین ہے' مشین تو میری بات نہیں سمجھے گی۔ پتا ہے جی ایک بیری کیا ہوا۔ دور کی سواری تھی۔ پہنچا کے پلٹا تو رستے میں رات ہو گئی۔ وہیں کہیں ایک سرا کے پاس ایک کھٹیا مل گئی۔ پڑ رہا۔ رات کو کیا ہوا کہ ایک بھینسا مجھ پر آ پڑا۔ سینگ سینے میں جا کر ایسا لگا کہ میں ٹیں ہو گیا۔ لو جی گھوڑے نے جو دیکھا تو اس نے رسہ تڑایا اور بھینسے سے بھڑ گیا۔ بھینسے کو ایسی دلتی ماری کہ بس وہ فوراً ہی

ڈھیر ہو گیا۔ پھر میرے پاس آیا۔ میں نے کہا کہ بھئی گھوڑے ہم تو جا رہے ہیں۔ اس نے سر میرے کاندھے پر رکھ دیا اور رونے لگا۔ ہمت کر کے میں تانگہ میں بیٹھا۔ گھوڑے سے کہا کہ بھئی گھوڑے ہمیں ہوش نہیں۔ اب تو خود ہی چلا چل۔ تو جی گھوڑا خود ہی چل کے تھاں پہ آ گیا۔ انتظار صاب ایمان کی کہو ایسے گھوڑے کو کیسے چھوڑ دوں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔"

"انتظار صاب گھوڑا تو گھوڑا ہوتا ہے۔ مشکل وقت میں ساتھ دیتا ہے۔ اس سالی مشین کا کیا اعتبار۔ اس سے تو دوستی نہیں ہو سکتی۔"

تو خیر ناصر بھی اب لیئق کی سواری تھا اور اب رات کو تانگہ کا سفر اس طرح سے تھا کہ لیئق پہلے ناصر کو کرشن نگر پہ چھوڑتا' پھر وہاں سے مجھے لے کر چلتا۔ اس کی داستان طرازیوں پر ناصر کی طرف سے جو ردعمل آتا اس سے اس کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی ہوئی اور وہ ہم سے روز بروز زیادہ مانوس ہوتا گیا۔

اس بیچ دو واقعے گزرے۔ ایک تو ہم نے ٹی ہاؤس سے نقل مکانی کی اور لارڈز میں جا کر اپنی محفل آراستہ کی۔ ٹی ہاؤس سے نقل مکانی کی بڑی وجہ احمد مشتاق تھا' جس کی تلخ نوائی اب ناصر پر بھاری پڑ رہی تھی۔ مارش لا کیا آیا کہ ایک عسکری صاحب کو چھوڑ کر باقی سارے ہی ادیبوں کی دیانت مشتاق کی نظروں میں مشکوک ہو گئی۔ ادیب کو اس وقت کلمہ حق کہنا چاہیے' یہ تھا مشتاق کا مطالبہ۔ اور سب سے بڑھ کر ناصر سے۔

ناصر نے اس کا وعظ بہت سنا۔ پھر کہا کہ "مشتاق' میں تو ایک مرتبہ سچ بول کر کربلا میں سر کٹا چکا' اب تیری باری ہے۔"

اس شام تو خیر مشتاق کا منہ بند ہو گیا' مگر پھر وہ ہر بہانے یار و اغیار سب پہ حملہ آور ہونے لگا۔ اور ناصر نے طے کیا کہ اب ٹی ہاؤس چھوڑ کر کہیں اور بیٹھنا چاہیے۔ میٹرو پر تو زوال آ چکا تھا۔ اس کی راتیں تو اسی وقت اجڑ گئی تھیں جب اسخیلا وہاں سے رخصت ہوئی تھی۔ پھر وہ اجڑتا ہی چلا گیا' حتیٰ کہ ہوٹل بند ہو گیا۔ اس ہوٹل کی یادگار جو وہاں رہ گئی تھی وہ صندلی بلی تھی۔ اس کھنڈر میں وہ کتنے دنوں تک منڈلاتی رہی' مگر پھر وہ عمارت ہی گرا دی گئی اور ایک نئی عمارت واپڈا کے نام پر وہاں تعمیر ہونی شروع ہوئی۔ مال روڈ پر اس زمانے میں ایک ریستوران لارڈز کے نام سے بہت شان کے ساتھ کھلا تھا۔ ناصر نے اس جگہ کو اپنے نئے ٹھکانے کے طور پر انتخاب کیا۔ ٹی ہاؤس سے دو اور ستارے ٹوٹے۔ منیر شیخ اور سجاد باقر رضوی' یوں ہم چار نے مل کر اس چائے خانے کو آباد کیا۔ یوں سمجھئے کہ ہم اس ریستوران کے جو عرصے تک شہر میں مقبول رہا اولین آبادکاروں میں تھے۔

تو اب ہم ایک بجے کے لگ بھگ یہاں سے اٹھتے۔ مگر ناصر کی روانی گھڑی کی سوئی کی پابند تو نہیں تھی۔ گھڑی کی سوئی ایک سے

آگے نکل جاتی اور بیان جاری رہتا۔ تب دروازے میں آ کر ایک چہرہ جھانکتا۔ یہ لئیق کا چہرہ ہوتا۔ گویا یہ یاد دہانی تھی کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ لئیق نے اب ہماری خاطر ٹولنٹن سے ہٹ کر ریگل چوک پر آ کر کھڑا ہونا شروع کر دیا تھا۔ مال پر تانگہ نہیں چل سکتا تھا' اس لیے وہ تانگہ لارڈز کے سامنے نہیں لا سکتا تھا۔ ریگل کے اڈے پہ کھڑا انتظار کرتا رہتا۔ جب دیر ہو جاتی تو تانگہ وہیں چھوڑ ہمیں یاد دہانی کرانے کے لیے آتا۔ ناصر اٹھ تو جاتا مگر ریگل چوک میں آ کر کہتا کہ ابھی تو ہمیں مال پہ تھوڑا چلنا ہے۔ تم پچھلی سڑک سے لوئر ٹولنٹن کے نکڑ پہ پہنچ جاؤ۔ چلئے ٹولنٹن کے نکڑ پہ لئیق پہنچ گیا۔ وہاں سے ہم تانگہ پر سوار بھی ہو لیے اور ناصر کے گھر تک بھی پہنچ گئے مگر وہاں پھر دروازے تک پہنچتے پہنچتے کوئی نئی داستان شروع ہو جاتی اور لئیق کو پھر اچھا خاصا انتظار کھینچنا پڑا۔

لئیق نے تو اپنی طرف سے بہت نباہی' دغا ہماری ہی طرف سے ہوئی۔ بس ہم نے سواری بدل لی۔ تانگہ کی سواری سے زقند لگا کر موٹر سوار بن گئے۔

تھوڑے عرصے بعد لئیق ایک شام ٹی ہاؤس آیا۔ بتایا کہ میں نے تانگہ کا کام چھوڑ دیا ہے۔ ''پھر؟'' میں نے پوچھا ''کوئی ٹیکسی مل گئی؟''

''نہی جی' میں نے کہا تھا کہ تانگہ چھوڑ بھی دوں تو بھی ٹیکسی کا کام نہیں کروں گا۔''

''پھر کیا کر رہے ہو؟''

''کباب بیچنے شروع کر دیے ہیں۔ آپ کے لیے لے کر آیا ہوں۔ کھا کر دیکھئے اور بتایئے کہ کیسے ہیں؟'' یہ کہتے کہتے اس نے ایک بڑا سا پڑا میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس میں شامی کباب لپٹے ہوئے تھے۔

تو لئیق نے تانگہ کو سلام کر لیا تھا اور مال پر تانگہ کا داخلہ ممنوع ہو چکا تھا۔ اب یہ شاہراہ نئی سواریوں کے شور سے گونج رہی تھی اور شور سا شور۔ ایک شور رکشاؤں کا' دوسرا شور سکوٹروں کا' پھر موٹر ٹیکسیاں' موٹریں' اومنی بسیں' اس ہجوم میں سائیکلیں تو خیر جیسے کیسے چلتی رہیں' لیکن زنانہ سائیکل زیادہ دیر سواریوں کے اس ہجوم سے مقابلہ کی تاب نہ لا سکی۔ ہاں رومن ہولی ڈے' کے بعد سے سائیکل والیاں بھی تو بدل گئی تھیں۔ کمر اور چوٹی کا وہ عالم اب کہاں۔ آدرے ہیپرن والا سٹائل اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ زلف دراز کی حکایت مختصر ہوتے ہوتے بس جیسے غزل تک رہ گئی ہو۔ ہاں قمیص کے دامن میں بھی تو اختصار آ گیا تھا۔

اور وہ جو مال پر خوانچے والے تھے ایسے کہ جیسے مال میں ان کی نال گڑی ہو' وہ کہاں گئے قلفیوں والا کہاں گیا۔ پانی کے بتاشوں والا کہاں گیا۔ خود ہماری اپنی دکان مال سے اب اٹھنے لگی تھی' مگر خیر اس کا تعلق مال کی نئی چال سے نہیں تھا۔ وہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کو

مارشل لا ''آفاق'' کو نہ پہلے راس آیا تھا نہ اب راس آیا۔ میں نے ڈوبتے آفاق کو بال آخر سلام کر لیا۔ کیا کرتا بس پھر چند برسوں تک فری لانسنگ ہمارا مقدر ٹھہری۔ تھوڑی انگریزی اخبار نویسی' تھوڑی اردو کالم نگاری' کبھی یہاں' کبھی وہاں' ترجمہ بازی اور ہاں ایک ادبی رسالہ کی ایڈیٹری' حلقہ کے جلسہ کے بعد ٹی ہاؤس میں چائے کا دور چل رہا تھا۔ صوفی صاحب نے یعنی کہ صوفی تبسم نے جو آج حلقہ کی صدارت کے لیے آئے تھے مجھے دیکھا' بولے ''کا کے تیرا اخبار تو بند ہو گیا' اب کیا کر رہا ہے۔''

میں نے بتایا کہ فی الحال راوی میرے لیے آزادی لکھتا ہے۔ یا کہہ لیجیے فری لانسنگ۔ بولے ''پھر کچھ ''لیل و نہار'' کے لیے لکھو۔ میں نے فوراً حامی بھر لی۔ کہا کہ کل ہمارے دفتر کی طرف آؤ۔ دوسرے دن اس طرف گیا تو دیکھا کہ صوفی صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ اصل میں اشفاق احمد یہاں سے نکل کر ترقی کے راستے پر آگے نکل گئے تھے۔ اب یہاں صوفی صاحب تھے اور ان کا حقہ تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں آگے سبط حسن پائپ پیتے نظر آیا کرتے تھے۔ ''لیل و نہار'' کیا خوب ہفت روزہ تھا۔ کس دھوم سے نکلا۔ ہفت روزہ صحافت میں کیا معیار قائم کیا۔ سید سبط حسن کے پائپ سے شروع ہوا اور صوفی صاحب کے حقے کی گڑگڑاہٹ پر جا کر ختم ہوا۔

حلقہ کا حوالہ آیا ہے تو اب مجھے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ ہم ہر پھر کر پھر حلقہ میں آن پہنچے تھے' مگر کب اور کیسے؟ مجھے ذرا یاد کر لینے دیجیے۔ ناصر کی دائری کا ایک ورق میرے سامنے کھلا ہے۔

''21 جولائی 1961ء صبح کے وقت بارش ہوئی۔ صبح نو بجے سے بارہ بجے دوپہر تک گرڈینیا ہوٹل میں رہا۔ حلقہ ارباب ذوق کی رکنیت کا فارم پر کیا کہ حلقہ کی مجلس عاملہ نے میری شرائط قبول کر لیں۔''

ہم ساتھ ساتھ نکالے گئے۔ واپسی بھی ساتھ ساتھ ہی ہوئی تھی۔ اصل میں اس دوران حلقہ میں بھی تو ایک خاصا انقلاب آ چکا تھا۔ ایک ایسی بغاوت ہوئی کہ کرسیاں چل گئیں۔ اصل میں حلقہ کے کچھ مہربان یوں سمجھ لیجیے کہ حلقہ کے گئے دنوں کے خاص الخاص آج کل بڑے سرکاری عہدوں پر متمکن تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں حلقہ کے ساتھ نیکی کی کہ اس کے لیے سرکاری گرانٹ کا اہتمام کیا۔ قیوم صاحب یہ سوچ کر خوش تھے کہ حلقہ کے دلدر دور ہوئے۔ فارغ البالی کے دن آئے' مگر حلقہ میں وہ آزاد منش روحیں بھی تو بیٹھی ہوئی تھیں جنہیں شک ہوا کہ یہ تو ادیبوں کی آزادی کا سودا ہو رہا ہے۔ انہیں وہ دن یاد آئے جب انجمن ترقی پسند مصنفین کے ختم ہو جانے کے بعد مختلف ترقی پسند ادیبوں نے حلقہ میں آنا جانا شروع کیا تو حلقہ پر اوپر سے دباؤ پڑنے لگا اور پوچھ گچھ ہونے لگی کہ یہ حلقہ میں کیا ہو رہا ہے اور حلقہ کے عہدیداروں کو پوچھ گچھ کرنے والوں کے سامنے جا جا کر یہ وضاحتیں کرنی پڑیں کہ حلقہ ایک آزاد

ادبی ادارہ ہے۔ وہ کسی ادیب پر اپنے دروازے بند نہیں کر سکتا۔ یہ اس کی روایت کے خلاف بات ہوگی۔ اب وہ سوچ رہے تھے کہ سرکاری گرانٹ سے حلقہ کے دن تو پھر جائیں گے' مگر ایک آزاد ادبی پلیٹ فارم کے طور پر جو اس کی روایت قائم ہوئی ہے وہ کیسے برقرار رہے گی۔ سو سرکاری گرانٹ کے مسئلہ پر اختلاف شروع ہوا اور اتنا بڑھا کہ جلسہ میں کرسیاں چل گئیں۔ چشم دید گواہوں نے بتایا کہ سب سے ظالم کرسی وہ تھی جو قیوم صاحب کی ہم نوائی کے جوش میں منیر نیازی نے سجاد رضوی پر کھینچ کر ماری تھی۔ وہ تو یوں کہئے کہ سجاد رضوی کو مولا کی مجلسیں پڑھنے کے لیے زندہ رہنا تھا سو نشانہ چوک گیا ورنہ حق و باطل کے اس معرکہ میں سید زادے کی شہادت لکھی گئی تھی۔ شاعر جلدی جلال میں آ جاتا تھا یا شاید جلال ہی میں رہتا تھا۔ لیکن ہمعصروں کی قسمت اچھی تھی کہ نشانہ خطا ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ جلال میں آ کر سامنے رکھا پانی سے بھرا جگ اٹھایا اور کھینچ کر صفدر کے سر پہ مارا۔ مگر پھر نشانہ خطا ہو گیا۔ جگ دیوار میں جا کر لگا۔ صفدر کا سر بال بال بچا۔

شان قلندرانہ' طبیعت جلالی' مزاج لاابالی' لاابالی پن کے ساتھ تھوڑی تعلّی ''شاعری میں میرا حال ایسا ہے جیسے جنگل میں برگد تلے سدھارت بیٹھا ہو۔'' مگر جنگل اور برگد کی بات کرتے کرتے منیر نیازی کو ایک اور خیال آیا ''سدھارت کی جگہ اور کوئی ہوتا تو جنگل کی دہشت اسے ختم کر دیتی۔ تنہائی اور خلا سے آنکھیں چار کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔''

میں نے کہا ''منیر نیازی ایک طرف تم اتنے اکل کھرے ہو کہ دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتے۔ تصور یوں کرتے ہو کہ جنگل میں برگد تلے اکیلے بیٹھے ہو۔ دوسری طرف ایک نیا شہر بسانے کا خواب دیکھتے ہو۔''

''تنہا آدمی کا یہی تو المیہ ہے کہ وہ آبادی کے لیے' رونق کے لیے روتا ہے۔ پھر وہ کسی برگد تلے' یا کسی غار میں بیٹھ کر سوچتا ہے کہ رونق کیسے پیدا کی جائے' کیسی بستی بسائی جائے؟''

''مگر بستی میں آدمی تو ہوں گے۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے سوا بہت سی مخلوق ہوگی' بہت سے آدمی۔''

''مگر کیسے آدمی' میں چنگیز خان کی طرح کے آدمی نہیں چاہتا۔ میں ایسے خدا پرست لوگ دیکھنا چاہتا ہوں جن میں احساس جمال ہو' ایسا احساس جمال کہ خبیث قوتیں اس کے رعب میں آ جائیں۔ میں اپنی شاعری سے ایسے ہی آدمی تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

گوتم بدھ سے لگاؤ' چنگیز خان سے نفرت' تشدد سے بیزاری' محبت میں ایمان۔ ''پاکستان بننے سے پہلے ہمارے درمیان کتنی محبت تھی' اس لیے کہ ہمارے درمیان مکالمہ جاری تھا' مگر اس کے بعد یہ ہوا کہ مکالمہ رک گیا۔ آپس میں جب مکالمہ رک جائے تو پھر

پستولوں سے مکالمہ ہوتا ہے۔''

مگر یہ تو اب سے بیس پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ اب تو خیر خود منیر کے ہاتھ میں پستول ہے۔ میں نے یاروں سے سنا کہ کوئی ایسا واقعہ ہوا کہ منیر کو پستول چلانا پڑا۔ میں نے اسے فون کیا' خیریت معلوم کی اور واقعہ معلوم کیا۔ کہا کہ ''یار' یہ زمانہ بہت خراب ہے' کچھ اوباش قسم کے نوجوان تھے۔ انہوں نے میرے گھر پہ پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔ میرے پاس ایک پرانا دھرانا پستول پڑا تھا' اسے اٹھایا اور ٹیرس پر آ کر ایک دو فائر کیے' وہ بدبخت بھاگ گئے۔''

''شاعر اور پستول؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''مت بھولو کہ میں پٹھان بھی ہوں۔'' پھر بتانے لگا کہ ''یار وہ پستول تو بہت پرانا ہو گیا تھا۔ ویسے بھی پستول اب آؤٹ آف ڈیٹ ہے۔ میں نے اب موزر خرید لیا ہے۔''

''یار ان نئے ہتھیاروں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ موزر کیا چیز ہوتی ہے۔ کیسا ہوتا ہے؟''

''کبھی تم میری طرف آؤ' میں تمہیں موزر دکھاؤں گا۔ چلانا بھی سکھا دوں گا۔ لائسنس بھی دلوا دوں گا۔ زمانہ خراب ہے۔ تمہارے پاس بھی موزر ہونی چاہیے۔''

''ہونی تو چاہیے مگر افسوس کہ میں پٹھان نہیں ہوں۔ اور یہ جاننے کے باوجود کہ تم پٹھان ہو' مجھے یہ بات نہیں بھولتی کہ اولاً تم شاعر ہو۔''

''یار جب میں لائسنس لینے گیا تو وہ جو وہاں ایک افسر تھا' اسی نے یہی کہا تھا کہ نیازی صاحب آپ تو شاعر ہیں۔ آپ کو موزر کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ شاعر تو میں ہوں' مگر تم لوگوں نے خیالات ایسے پیدا کر دیئے ہیں کہ مجھے موزر کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔''

موزر اب منیر نیازی کی ضرورت ہے۔ اگرچہ مزاج وقت گزرنے کے ساتھ خاصا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ جوانی میں تو جلال سر پہ سوار رہتا تھا' ایسا کہ کرسی سامنے ہوئی تو حریف پر کرسی دے ماری' جگ ہاتھ پڑا تو جگ کھینچ مارا۔

بہرحال سجاد رضوی کی ہڈی پسلی تو ٹوٹنے سے بچ گئی۔ ہاں قیوم صاحب کا زور حلقہ میں ٹوٹ گیا۔ انہوں نے حلقہ سے منہ موڑا اور خانہ نشین ہو گئے۔ بس اس کے بعد راندگان حلقہ کی واپسی کے لیے راہ ہموار ہو گئی۔ سو ہمیں کسی نہ کسی روز واپس آنا ہی تھا۔ دیر ہماری ہی طرف سے ہوئی۔ خاص طور پر ناصر کی طرف سے۔ آخر شاعر کی بھی تو کوئی اکڑ ہوتی ہے۔ ادھر یار کہہ رہے تھے کہ بہت ہو گئی' غصہ

تھوک دو اور واپس آ جاؤ۔

قیوم صاحب کے جانے سے حلقہ میں جو اقتدار اعلیٰ کا خلا پیدا ہوا اسے اعجاز حسین بٹالوی نے پر کیا۔

''مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''

بات یہ ہے کہ بعض خاص شخصیتیں بعض خاص کام انجام دینے کے لیے پیدا ہوتی ہیں اور وہ ملک ہو یا انجمن وہ اپنی تعمیر اور استحکام کے لیے کسی ایسے نابغہ کا محتاج ہوتا ہے جو انتظامی صلاحیتوں سے متصف ہو اور انتشار اور تخریب کے عناصر کا قلع قمع کرنے کا زور و اثر رکھتا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے شخص کا اقتدار بالعموم آمرانہ مزاج ساتھ لے کر آتا ہے' نہ بھی ساتھ لائے تو اقتدار کے طول پکڑ جانے کے ساتھ یہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ سو یہ تو بشری کمزوری ہے۔ آدمی ولی ہو تب ہی اس کمزوری پر قابو پا سکتا ہے۔ قیوم صاحب آخر آدمی تھے۔ شاعر ضرور تھے' ولی نہیں تھے۔ ولیوں والی صفات اگر تھیں تو میراجی میں تھیں' مگر میراجی حلقہ کو ادبی آدرشوں سے مالا مال کر سکتے تھے' منتظم نہیں بن سکتے تھے۔ حلقہ کے معمار اعظم قیوم صاحب تھے۔ ان کے چلے جانے کے نقصان کا پتا تو اس وقت چلا جب ساتھ کی دہائی کے اواخر میں حلقہ کا انتظام کمزور پڑا اور اس سے فائدہ اٹھا کر وہ مخلوق دندنانے لگی جو اس وقت کی سیاست کی پیداوار تھی۔ ادب کو انقلاب کی راہ میں حائل جانتی تھی۔ بس پھر حلقہ پنپ نہیں سکا۔

اعجاز حسین بٹالوی نے شروع میں انتظام خوب چلایا' مگر وہ حلقہ پر زیادہ عرصے تک وہ توجہ نہ دے سکے جو وہ مانگتا تھا۔ قیوم صاحب نے ایک مرتبہ واپس آنے کی ہمبی باندھی بھی تھی۔ یہ اس وقت ہوا جب اعجاز حسین بٹالوی اور یاروں نے مل کر دوبارہ مجھے سیکرٹری کے لیے نامزد کیا۔ اغیار نے جا کر قیوم صاحب کو اس تشویش ناک صورت حال سے باخبر کیا اور انہیں الیکشن کے میدان میں لا اتارا۔ خیر قیوم صاحب نے تو اپنی ہار کو اپنے روایتی قہقہہ میں اڑا دیا' مگر امجد الطاف اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ حلقہ کے بیچ سسکیاں بھر کر روئے۔ پھر اٹھ کر چلے گئے۔

بس اس کے بعد سمجھ لیجئے کہ سالوں بعد میری ملاقات قیوم صاحب سے اس وقت ہوئی جب وہ پاکستان کونسل میں ڈائریکٹر بن کر آئے۔ اس وقت تک حلقہ کی وہ ساری سیاست قصہ ماضی بن چکی تھی۔ قیوم صاحب کے لیے بھی میرے لیے بھی۔ میں نے اب اپنے اندر ان سے اپنی پرانی نیازمندی کی تجدید کر لی تھی۔ اسی حساب سے ان سے ملتا تھا۔

اب سوچتا ہوں کہ میں کسی صورت ہار جاتا یا دوست مجھے اپنا نام واپس لینے کی اجازت دے دیتے اور قیوم صاحب حلقہ میں واپس آ جاتے تو کیا عجب تھا کہ حلقہ انقلابی مخلوق کی یلغار سے محفوظ رہتا۔ یہ مخلوق بھی کچھ اس طرح آندھی دھاندی حلقہ پہ آ پڑی جیسے

قدیم زمانوں میں وحشی قبیلے مہذب پرامن بستیوں پر آ پڑتے تھے اور ساری پرامن مہذب زندگی کو تلپٹ کر دیتے تھے' مگر یہ ذکر بعد میں درمیان میں جو قصے قصے ہوئے پہلے ان کا ذکر تو کر لوں۔

◆◆◆

امریکہ، افریشیا، تھنکر زفورم

لیجئے پھر ایک ادبی پرچے کی ادارت میرے نام لکھی گئی۔ نذیر چودھری نے پہلے ناصر سے مسکوٹ کی' پھر افتخار چودھری کو لے کر ٹی ہاؤس آئے۔ کہا کہ ان دنوں تو تم اخبار سے فارغ ہو' ادب لطیف کی ادارت سنبھال لو۔

میں نے کہا کہ ''چودھری صاحب' میں تو رجعت پسند ہوں'' ''ادب لطیف'' سدا کا ترقی پسند۔ میرا اس کا کیا جوڑ۔''

مگر زمانہ ادھر بھی تو بدل گیا تھا۔ جب سویرا' ترقی پسند نہ رہا تو ادب لطیف' کتنے دن اس لکیر کا فقیر بنا رہ سکتا تھا۔ سو سمجھوتہ ہو گیا۔ مگر ادھر میری ادارت کی خبر نکلی اور ادھر ترقی پسندوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ ترقی پسندوں کا ایک ہی تو ٹھیا رہ گیا تھا۔ اس پر بھی ایک رجعت پسند کو لا کر بٹھا دیا۔

روز ڈھیر ساری ڈاک آتی اور چودھری افتخار اسے میرے سامنے ڈھیر کر دیتے۔ میں نے کہا کہ چودھری صاحب اب بھی وقت ہے' سوچ لیجئے۔ بولے' سوچ لیا ہے۔

مگر ایک حملہ غیر متوقع تھا۔ تھا ترقی پسندی ہی کے نام پر اور غالی ترقی پسند ہی کی طرف سے' مگر مجھے اس طرف سے حملہ کا سان گمان بھی نہیں تھا۔ پہلا پرچہ نکلا اور ادھر سے صفدر میر شروع ہو گئے' مگر خطا مجھ سے بھی ہوئی تھی۔ صاحب فقرہ بازی کا چسکا برا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اچھا بھلا آدمی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ خیر اچھا فقرہ اچھے دوست کا بدل بیشک نہ ہو لیکن کسی حد تک تلافی تو ہو ہی جاتی ہے۔ پچھتاوا اس صورت میں ہوتا ہے کہ احتیاط میں فقرہ بھی بیچ میں رہ جائے اور دوست بھی ہاتھ سے نکل جائے' مگر میں کرتا کیا' مقطع میں سخن گسترانہ بات آ پڑی تھی۔ وہ رائٹرز گلڈ کی گہما گہمی کا زمانہ تھا۔ شفقت تنویر مرزا نے بڑی جدوجہد کر کے گلڈ کی پنجاب شاخ میں پنجابی کی شاخ بنوائی۔ اہتمام سے اس کا افتتاحی جلسہ کیا۔ مجھے اس جلسہ میں مضمون پڑھنے کی دعوت دی۔ میں نے پہلے تو عذر کیا کہ رائٹرز کنونشن کے بعد سے گلڈ کے کسی بکھیڑے میں نہیں پڑا ہوں' نہ اس کی کسی تقریب میں مضمون پڑھنے کا شرف حاصل کیا ہے' مگر پھر سوچا کہ اس عزیز سے ایک زمانے سے وضعداری چلی آتی ہے

''انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو''

آمادہ ہو گیا۔ بس نصیب ہی برے تھے کہ ایک فقرہ اچٹتا سا صفدر کی طرف چلا گیا۔ جانے کس نے کان میں جا کر کیا پرویا اور

فقرے کو کس طرح رپورٹ کیا۔ ادھر سے تیر پہ تیر چلنے لگے۔

ارے ابھی تو میری مارکسی تعلیم شروع ہی ہوئی تھی۔ صفدر نے کتنی مشکلوں سے کتابوں کے انبار تلے سے ایک ضخیم جلد برآمد کی ''لو پہلے تم اینگلز کو پڑھ لو۔'' اور اینگلز کو ابھی پڑھا ہی تھا کہ کھیل بکھیڑا ہو گیا۔

میں ابھی کہہ رہا تھا کہ آدمی چھوٹا نہ ہو تو لڑنے میں مجھے کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ قدیم شجاعان عرب میدان میں اتر کر پہلے مقابل کا حسب نسب پوچھتے تھے۔ جب پتا چلتا کہ حریف حسب نسب والا ہے تو پھر اطمینان سے لڑتے تھے۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ اس سے آگے کی بھی ایک بات ہے۔ میں نے اپنی نانی اماں سے سنا تھا کہ آدمی لڑے تو ایک آنکھ لڑنے کی رکھے تو دوسری آنکھ ملنے کی رکھے، مگر بندہ بشر ہے۔ کبھی کبھی ملنے والی آنکھ بھی اندھی ہو جاتی ہے۔

ہاں ایک بات اور۔ ادب کو لڑائی وہ زیب دیتی ہے جو کسی نقطہ نظر کسی ادبی نظریے کے حوالے سے ہو۔ ذاتی لڑائی تو ہم سے بہتر کنجڑے قصائی لڑ لیتے ہیں۔ لڑائی بری چیز ہے مگر ادب میں آ کر اچھی چیز بن جاتی ہے۔ ادب میں لڑائیاں ہوتی رہنی چاہئیں۔ باقی پھر وہی بات کہ بندہ بشر ہے۔ ادبی لڑائی میں دیکھا گیا ہے کہ اکثر اوقات کسی نہ کسی رنگ میں ذاتیات بھی راہ پا جاتی ہے۔ چلئے یوں بھی سہی ادیب خالص عقل اور دماغ تو نہیں ہوتے۔ ہونا بھی نہیں چاہیے۔ سو ادبی جنگ میں جذبات و احساسات بھی راہ پائیں گے اور ذاتی جھگڑے کا رنگ بھی پیدا ہو گا۔ مگر یہ رنگ بقدر نمک رہے تو بہتر ہے اور اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ صفدر سے ان دنوں لڑائی میں نمک تیز ہو گیا تھا۔

قصہ مختصر میں نے ''ادب لطیف'' کی ادارت ایک اچھے خاصے ہنگامے میں شروع کی تھی۔ یعنی یہ ادارت ''خیال'' کی ادارت سے مختلف تھی۔ وہاں مقصود یہ تھا کہ ہنگامہ پیدا کیا جائے۔ یہاں یار و اغیار نے خود ہی ہنگامہ پیدا کر دیا۔ ویسے میرے حساب سے تھا یہ میری ادارت کے لیے بہت مناسب زمانہ۔ ''خیال'' کے اجرا کے وقت ہم نے نئی نسل کا سوال ضرور کھڑا کیا تھا مگر نئی اور پرانی نسل کا فرق کوئی ایسا واضح نہیں تھا۔ اب بہت واضح نظر آ رہا تھا۔ خاص طور پر افسانے میں۔ تیسری اور چوتھی دہائی میں پروان چڑھنے والی نسل کا طرہ امتیاز تو حقیقت نگاری کا اسلوب تھا۔ پانچویں دہائی کے وسط تک اس کا بول بالا رہا، مگر یہ اسلوب اب جیسے باسی ہو گیا ہو اور نئے افسانہ نگار کو جیسے کسی تازہ اسلوب کی تلاش ہو۔ ثقہ ایڈیٹروں کو شروع میں ایسے افسانے کو قبول کرنے میں تامل تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ افسانہ مبہم ہے بلکہ بے معنی ہے۔ میرے حساب سے اس وقت بے معنی لکھنے کی بھی ایک معنویت تھی۔ لکھنے والا اگر بے معنی لکھنے کا خطرہ مول نہیں لے گا تو نئے معنی تک کیسے پہنچے گا۔ باقی کیا ضروری ہے کہ اس سفر میں سب ہی سرخرو ہوں۔ جو سرخرو نہیں ہوں گے ان کا

نام قربانی دینے والوں کی فرد میں لکھا جائے گا۔ نئے افسانے کے نام پر قربانیاں بہت دی گئیں۔ ویسے نئی شاعری کے نام پر بھی قربانیاں کم نہیں دی گئیں۔ انہیں دنوں نئی لسانی تشکیلات کا شگوفہ پھوٹا۔ اس نام پر کتنے نوجوانوں نے ٹی ہاؤس کے بیچ اپنے نام کا نقارہ بجایا۔ پھر ٹی ہاؤس ہی میں کھیت ہو گئے۔ نئی شاعری کے لیے قربانیاں دینے والوں میں ان کے نام لکھے گئے۔ ہمارا افسانہ بھی اس وقت ایسے آشفتہ سروں کا طلبگار تھا۔ انہی آشفتہ سروں میں وہ جوان انور سجاد بھی تھا' مگر وہ ٹی ہاؤس سے اپنے افسانے کو بچا کر لے گیا۔ اس کے نقارے کی آواز دور تک گئی۔ جس نے سمجھا اس نے سر دھنا' جس نے نہ سمجھا اس نے اور زیادہ دھنا۔ میں نے اس عزیز کے افسانے کو ادب لطیف کی زینت جانا اور پرچے کا آغاز اسی کے افسانے سے کیا۔

خالدہ اصغر نے جو بعد میں خالدہ حسین کہلائیں' اسی زمانے میں پر پرزے نکالے تھے۔ اس بی بی کی طرف سے موصول ہونے والا پہلا ہی افسانہ ناصر کو بھا گیا۔ پھر اس کے لکھے تعارف کے ساتھ وہ افسانہ شائع ہوا۔ ادھر ہندوستان میں بھی اس نئی طرز کی بہت دھوم تھی۔ بلراج منیرا ایسے لکھنے والوں کا سرخیل بنا ہوا تھا۔ ایسا مال ادھر سے بٹورتا تھا اور ادب لطیف کے لیے بھیج دیتا تھا۔ سیندر پرکاش کا افسانہ مجھے اسی کی معرفت موصول ہوا تھا۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ ان برسوں میں امریکہ سے ادیبوں کی سوغات کچھ زیادہ ہی آئی تھی۔ پال اینگل آئے' جسی سٹوریٹ آئے' کیرولین کائزر آئیں۔ پال اینگل کو تو خیر میں نے اور ناصر نے مل کر ٹی ہاؤس جھنکایا' تانگہ میں بٹھا کر اندرون شہر کی سیر کرائی کہ دیکھو ہماری روایتی سواری یہ ہے اور روایتی گلی کوچے ایسے ہیں۔ مگر جسی سٹوریٹ کا ورود پاکستان میں عجب زمانے میں ہوا۔ اس وقت امریکہ کے خلاف ردعمل اپنے عروج پر تھا۔ جلتی پہ تیل کا کام اس خبر نے کیا کہ ہندوستان سے امریکہ کا سودا ہوا ہے جس کے تحت امریکہ ہندوستان کو ہتھیار سپلائی کرے گا۔ ادھر ٹی ہاؤس میں سی آئی اے کا بہت چرچا تھا۔ باری باری کتنے ادیبوں' دانشوروں کا چال چلن مشکوک ٹھہرا تھا۔ کتنے سی آئی اے کے ایجنٹ قرار دیئے جا چکے تھے۔ لگتا تھا کہ امریکہ اس شہر کے سارے ادیبوں کو خاص طور پر ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والوں کو خریدنے پہ تلا بیٹھا ہے۔ اور میں ایک تو میں نخالص قسم کا رجعت پسند' پھر یو ایس آئی ایس میں کئی کام کرنے والوں سے یاد اللہ۔ ایک تھے پیر احمد شجاع' شیخ صاحب اور ناصر سے ان کی گہری دوستی تھی۔ اسی واسطے سے یاد اللہ مجھ سے بھی تھی۔ یو ایس آئی ایس لائبریری کے انچارج تھے۔ کتابوں میں غرق رہتے تھے۔ سیدھی سادھی نوکری کرتے تھے۔ سیاست سے بے تعلق تھے۔ نہ شاید انہیں یہ احساس تھا کہ اس زمانے میں ادب بھی سیاست کی زد میں ہے۔ امریکہ سے جو ادیب آتے وہ ان کے ذمے پڑتے۔ اور وہ فوراً ناصر اور مجھے بلا کر ان سے ملاقات کراتے۔ اور اس وقت میں حلقہ کا سیکرٹری تھا۔ اور ایک ادبی رسالہ کا مدیر۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس شاعر کو حلقہ میں بلاؤ۔ کسی خصوصی نشست کا اہتمام کرو۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ایسی نشست تو ممکن نہیں کہ حلقہ کی ایسی کوئی روایت نہیں ہے۔ ہاں یوں ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے مہمان کو لے کر حلقہ میں آئیں۔ وہ مہمان دیکھے کہ یہاں ادبی محفل کس طرح برپا ہوتی ہے' کس طرح بحث مباحثہ ہوتا ہے۔ حلقہ کے بعد ہم ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے ہیں۔ اس چائے کو ہم ایک رسمی شکل دے دیں گے کہ وہ مہمان شاعر کے اعزاز میں چائے کی تقریب بن جائے۔ وہاں شاعر کے ساتھ تبادلہ خیال ہو۔

اس تجویز پر اتفاق رائے ہوگیا' مگر یاروں کو اس کا پتا چلا تو غل مچ گیا۔ سی آئی اے' سی آئی اے سب سے زیادہ غل حبیب جالب نے مچایا۔ میں نے حبیب جالب کو سمجھایا اور پیش کش کی کہ تم ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہو اور جو کہنا چاہتے ہو کہو۔

حبیب جالب رضامند ہوگیا۔ چائے میں شریک ہوا۔ بات کہنے اور سوال کرنے کے بہانے ایک اچھی خاصی تقریر کر ڈالی اور ظالم نے ایک ایسا فقرہ کہا کہ دوسرے دن اخباروں میں خبر کی سرخی بن گیا۔ کہا کہ امریکہ عجب ہے' ہتھیار ہندوستان کو فراہم کرتا ہے' ہماری طرف خالی شاعر بھیج دیتا ہے۔

حبیب جالب تقریر کر کے اور اپنی تقریر کو اخباروں میں نمایاں دیکھ کر مطمئن ہوگیا۔ ادھر میں مطمئن کہ حق مہمان نوازی بھی ادا ہوگیا اور کھری کھری باتیں بھی ہوگئیں۔ مگر ایک فریضہ احمد مشتاق کو بھی تو ادا کرنا تھا۔ مشتاق ہمارا دوست بھی تھا اور ہمارا محتسب بھی۔ بس یوں سمجھئے کہ نقاد اور محتسب کے لیے ہم غیروں کے محتاج نہیں تھے۔ اس معاملہ میں ہم خود کفیل تھے۔ منڈلی کے اندر ہی یہ فریضہ ادا کرنے والے موجود تھے۔ سب سے بڑھ کر مشتاق تھا جو خاص طور پر میرے اور ناصر کے چال چلن پر نظر رکھتا تھا۔ اسے مستقل فکر رہتی تھی کہ اس کے یہ دو سادہ دوست شیطانوں کے بہکاوے میں آجائیں گے اور ادارہ ہوجائیں گے۔

تو لیجیے ہفتے کے اندر اندر مشتاق نے آکر یاروں کو خبر سنائی کہ انتظار کا معاملہ طے ہوگیا۔ وہ امریکہ جا رہا ہے۔ اچھا سکوپ تھا۔ مگر ایک چوک ہوگئی۔ مشتاق نے روانگی کی تاریخ مقرر کر دی اور میعاد بھی مختصر ہی رکھی۔ یہی کوئی ایک مہینے کی۔ ایک مہینہ گزرنے میں کتنی دیر لگتی ہے' مقررہ تاریخ آئی اور گزر گئی۔

اس کے بعد میں پیر صاحب کے پاس گیا ''پیر صاحب' شاید آپ نے مشتاق سے کچھ کہا تھا جس سے اس نے اپنی خبر بنائی اور ٹی ہاؤس میں پھیلائی۔''

''پیر صاحب' آپ کمال ہیں' ہمیں امریکہ بھجوائے بغیر ہی ہماری تھڑی تھڑی کرادی۔''

''بھئی' ہم تے تو اپنی طرف سے پروگرام بنالیا تھا مگر ''مدعی سست گواہ چست'' والا مضمون ہوگیا۔''

''یعنی؟''

''بھئی جسے ہم بھجواتے ہیں اس کا بھی تو کوئی فرض ہوتا ہے۔ تم نے تو الٹا کام کیا۔ ہم شاعر کو لے گئے۔ تم نے وہاں حبیب جالب سے تقریر کرادی۔ ہمارے سارے پروگرام پر پانی پھر گیا۔''

اور لیجئے اب کیرولین کائزر کا ورود مسعود ہوتا ہے۔ یہ آنا قیامت کا آنا تھا۔ ماشاءاللہ سے دراز قامت' رنگ گورا بھبھوکا' چال جیسے کڑی کمان کا تیر' ہر چند کہ اردو بنگلہ سے ناآشنا تھیں۔ پھر بھی یہ عزم لے کر آئی تھیں کہ پاکستانی ادب پر تحقیق و تدقیق کریں گی۔ سو انہیں حلقہ میں بھی آنا تھا اور ٹی ہاؤس میں بھی صورت دکھانی تھی۔ ہم نے نسخہ وہی استعمال کیا۔ حلقہ میں عزت سے بٹھایا۔ ٹی ہاؤس میں چائے کی میز پر بیٹھ کر ملاقات کی اور کرائی۔ پرانے شہر کی ایک ایک گلی جھنکائی۔ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور تھا۔ باقی شہر میں مسافر نواز بہتیرے تھے۔ اور اگر مسافر میم ہو تو مسافر نوازی میں زیادہ خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ خیر ڈیڑھ دن کی میزبانی تو ہم نے بھی کی۔ پال اینگل کی میزبانی تو بس اتنی کی تھی کہ ٹی ہاؤس میں بٹھا کر اسے پکوڑے کھلائے' پھر تانگہ میں بٹھایا اور پرانے شہر کی طرف نکل گئے۔ میں نے بساط بھر اس شاعر کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ کل والی سواریوں کے مقابلہ میں اس سواری کی کیا معنویت ہے۔ یہ کہ کس طرح بے حس مشینی سواری کے مقابلہ میں گھوڑا جیسی زندہ مخلوق کی مدد سے چلنے والی سواری میں بیٹھنے سے سارے گردوپیش سے رشتہ ہی بدل جاتا ہے یا کہہ لیجئے کہ رشتہ زیادہ محسوس اور بامعنی بن جاتا ہے' مگر یہاں ہم اپنی مہمان عزیز کو موٹر میں لے کر پھر رہے تھے۔ پال اینگل کی آمد سے اب تک ہمارے دن بھی تو پھر گئے تھے۔ اب ہم موٹر سوار بن گئے تھے۔ تو لیجئے صاحب ہم کیرولین کائزر کو موٹر میں بٹھا کر شہر کی یاترا پر نکلتے ہیں۔ واضح ہو کہ اس مہم میں ہمارا شریک جوان عزیز اعجاز احمد تھا۔ اسے میں نے پہلی بار ایف سی کالج میں سعید محمود کی معیت میں دیکھا تھا۔ چھریرے بدن گوری رنگت والا سمارٹ نوجوان۔ انگریزی ایم اے کا طالب علم۔ ادب سے خصوصی شغف۔ پھر اسے ٹی ہاؤس پہنچنا تھا۔ ''ادب لطیف'' میں میرے ہوتے ہوئے جوائس کی کہانیوں کے ترجموں سے اس کی ادب میں مہورت ہوئی۔ میں پہلے چکنم میں تھا کہ امریکہ سے آئی ہوئی یہ بی بی نہ اردو جانتی ہے نہ بنگلہ سمجھتی ہے۔ پھر پاکستانی ادب کے بارے میں کیا اور کیسے تحقیق کرے گی' مگر اس سارے دن گھومنے پھرنے کے بعد جب میں نے اعجاز احمد کی آنکھوں میں ایک نئی چمک دیکھی تو سوچا کہ اب یہ تحقیق پروان چڑھ جائے گی اور اعجاز احمد نے جس سفر کا آغاز جوائس کے ترجموں سے کیا تھا اس کے اگلے مراحل اس نے امریکہ میں جا کر طے کیے۔

ہاں لیجئے اب ''ادب لطیف'' سے بھی تو میرا چل چلاؤ تھا۔ روزنامہ مشرق سے وابستہ ہوا تو توجہ بٹ گئی۔ بس پھر تھوڑا ہی عرصہ

ادب لطیف سے نبھا پایا۔

اب سے پہلے تو میں نے اخباروں کے دفتر میں بیٹھ کر اخبار نویسی کی تھی۔ ''مشرق'' کی اخبار نویسی دفتری اوقات سے بے نیاز تھی۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ شہر میں گھومو پھرو' سماجی ثقافتی دنیا کی خاک چھانو' ثقافتی علمی تعلیمی اداروں میں تاکو جھانکو اور کالم لکھو۔ سو وہ زمانہ ختم ہوا کہ دفتر سے نکلے اور سیدھے ٹی ہاؤس۔ اب ملا کی دوڑ خالی مسجد تک نہیں تھیں۔ مسجد ہو' مدرسہ ہو' کوئی خانقاہ ہو' میکدہ ہو' تاڑی خانہ ہو' ناچ رنگ کی کوئی محفل ہو' ٹک دیکھ لیا' دل شاد کیا اور خامہ فرسا ہو گئے۔ ویسے وہ زمانہ بھی امی جمی کا تھا۔ وہ دن بہت پیچھے رہ گئے تھے جب لٹے پٹے قافلے لگاتار آ رہے تھے اور سر چھپانے کی جگہ ٹٹولتے پھرتے تھے۔ بحالیاتی دفتروں کے سامنے بھی اب وہ بھیڑ بھڑکا نظر نہیں آتا تھا۔ حکومتوں کے تابڑ توڑ بننے ٹوٹنے کا دور بھی گزر گیا تھا۔ اس افراتفری میں ایک جرنیل نے آ کر سب کو ٹھکانے لگا دیا۔ آزادی خیال ضبط' انڈا مرغی سستا' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ایک دفعہ تو ایوب خان زندہ باد کا نعرہ لگ ہی گیا۔ یہ زمانہ دورنگا تھا۔ قومی زندگی تنزلی کا شکار تھی۔ مگر معاشی اعتبار سے ترقی کے اثر آثار تھے۔ آخر مال روڈ خواہ مخواہ تو چوڑی نہیں ہوئی تھی اور نئی سواریوں کا وفور بلا وجہ تو نہیں تھا اور جب میں حلقہ میں روتا گاتا تھا کہ بلند و بالا درخت شہید کیے جا رہے ہیں تو ترقی پسند دوست کہتے تھے کہ یہ تو صنعتی ترقی کا لازمہ ہے اور ایوب خاں نے بجا سوچا کہ اتنا کچھ چھینا ہے تو کچھ دینا بھی چاہیے۔ سو سیاسی جلسے جلوس کی رونق گئی تو ثقافتی میلوں ٹھیلوں کو بڑھاوا دیا گیا۔

ادب میں بھی میلوں ٹھیلوں کا دور شروع تھا۔ رائٹرز گلڈ اپنے ساتھ کتنی برکتیں لے کر آیا۔ سیل سپاٹے' درون ملک اور بیرون ملک کے دورے' کتابوں پر انعامات' معذور ادیبوں کے لیے وظیفے' کچھ معذور تھے کچھ اس ریلے میں معذور بن گئے۔ جسمانی معذوری اپنی جگہ' ذہنی معذوری اپنی جگہ' گلڈ کے الیکشن اپنی جگہ۔ غزل' افسانہ موقوف' اس زمانے میں بس رقعے لکھے جاتے تھے۔ ندرت بیان بس انہوں رقعوں میں نظر آتی تھی۔ مجھے جو رقعے موصول ہوئے ان میں سے چند ایک کاغذوں سے برآمد ہو گئے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے۔

''کیا میں آپ کے ووٹ' تعاون اور مژدہ جانفزا کی امید رکھوں۔''

''اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان لوگوں کی خدمت کی جائے جن کے دم سے زبان و ادب کا چمن شگفتہ ہے۔ اس مقصد کے لیے میں رائٹرز گلڈ کی علاقائی مجلس عاملہ کی رکنیت کا انتخاب لڑ رہا ہوں۔ فقط.....

پھیلی ہے اب کے گلڈ میں ایسی وبائے ووٹ

سارے امیدوار ہیں سب جتلائے ووٹ
حالت کبھی نہ اہل قلم کی سدھر سکی
پہلے گدائے رزق تھے اب ہیں گدائے ووٹ

فقط امیدوار کرم..... گدائے ووٹ

''یہ ایسی فرمائش ہے کہ آپ کے پچاس فی صد وفرانہ حقوق میں حاصل کر رہا ہوں' لیکن دنیا میں مجبوری بھی کوئی چیز ہے۔''

فقط.....

''صوبائی ریجن کی عاملہ کے لیے مجھے بھی انتخاب میں دھکیلا گیا ہے۔ بھائی یہ انتخاب آپ ہی کو لڑنا ہے۔''

آپ کا.....

''آپ کو تو علم ہی ہے کہ پشاور سے بندہ بھی گلڈ کی عروس رکنیت کا امیدوار ہے۔ براہ کرم ایک ووٹ میرے حق میں بھی استعمال کیجئے گا۔''

نیاز مند.....

گلڈ کی جدوجہد کا ایک پہلو یہ تھا کہ ادیبوں کو معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل ہونا چاہیے اور تصور یہ قائم کیا کہ اگر سرکٹ ہاؤس میں سی ایس پی افسروں کے ساتھ ساتھ ادیب بھی مہمان ہونے کا استحقاق حاصل کر لیں تو سمجھ لو کہ انہیں معاشرے میں باعزت مقام حاصل ہو گیا۔ سو جب ایک مرتبہ گلڈ کے کسی اجلاس میں شرکت کے لیے جانے والا ادبی وفد سرکٹ ہاؤس میں جا ٹھہرا تو جمیل الدین عالی نے اطمینان کا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی مساعی جمیلہ کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور پاکستانی ادیبوں کو معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل ہو گیا۔

ادھر میں کنوئیں کا مینڈک۔ اب شہر گردی کو شعار کیا تھا۔ ثقافتی اداروں محفلوں میں تاکتا جھانکتا پھرتا تھا۔ اس شہر میں ثقافتی ادارے ایسے کون سے بہت سے تھے۔ لے دے کے ایک آرٹ کونسل' فنون کے ذیل میں جو کچھ ہوتا تھا یہیں ہوتا تھا۔ یہ آرٹ کونسل کیا خوب تھی۔ وسیع و عریض سبزہ زار۔ اس کے بیچ جا بجا کھڑے ہوئے چیڑ کے بلند و بالا درخت تھے۔ ان سے پرے ایک مختصر سی عمارت۔ کمروں کے بیچ ایک مختصر سا آڈیٹوریم۔ اس میں کھیل ہوتے تھے۔ اگر ہال کی ساری نشستیں پر ہو جاتیں تو سمجھا جاتا کہ کھیل

سپرہٹ ہوگیا۔ ان دنوں یہاں تھیٹر کی سرگرمی تیز تھی۔ میرے بھی ایک کھیل کے دن پھر گئے۔ بھلے دنوں میں یاروں کی ایک منڈلی کہہ لیجئے کہ اظہار کاظمی اور حمید علوی کی فرمائش پر لکھا تھا۔ کھیل مکمل ہوتے ہوتے وہ منڈلی ہی بکھر گئی۔ کھیل دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اب کمال احمد رضوی نے مجھ سے اچکا اور اسے ''خوابوں کے مسافر'' کے نام سے سٹیج کر ڈالا۔ اسے اس کی ہدایت کاری کا کمال کہنا چاہیے کہ کھیل ہٹ ہوگیا۔ مجھے گمان ہوا کہ میں سچ مچ ڈرامہ نگار ہوں۔ اسی رو کو ایک سٹیج پلے اور لکھ ڈالا۔

انہی دنوں بانو قدسیہ نے تابڑ توڑ کئی سٹیج پلے لکھے۔ کمال احمد رضوی نے انہیں سٹیج کیا۔ بہت کامیاب گئے۔ پھر کوئی کھیل اشفاق احمد کا' کوئی کھیل اصغر بٹ کا' ہاں ایک کھیل جو بہت کامیاب گیا وہ تھا عتیق اللہ شیخ کا ''ایک لڑکی شرمیلی سی''

لگتا تھا کہ لاہور کا سٹیج مستعار کھیلوں کے مرحلہ سے گزر کر طبعزاد کھیلوں کے مرحلہ میں داخل ہوگیا ہے اور اب تھیٹر کے پھلنے پھولنے کا وقت آ گیا ہے۔ تھیٹر کے رسیاؤں کو اس وقت کیا پتا تھ کہ جب یہاں نئی عمارت کھڑی ہو جائے گی اور شاندار آڈیٹوریم بن جائیں گے تو کیا گل کھلے گا اور سٹیج کن ہاتھوں میں چلا جائے گا۔

اچھا لیجئے' لاہور میں ایک نیا ادارہ قائم ہونے لگا ہے اور یہ لاہور تک نہیں رہے گا۔ اس کی کل پاکستان حیثیت ہوگی۔ مغربی پاکستان سے لے کر مشرقی پاکستان تک کتنے شہروں میں اس کی شاخیں ہوں گی۔ مقصود ہوگا قومی یکجہتی۔ نام ہوگا پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی۔

پاکستان کونسل کا افتتاح جسٹس کارنیلیس کے ہاتھوں ہوا۔ فرخ نگار عزیز اس کی ڈائریکٹر بنیں۔ افتتاح کے بعد جو اس کا پہلا جلسہ ہوا وہ ادبی نوعیت کا تھا۔ یعنی پاکستان کونسل نے بسم اللہ ادب سے کی۔ بارش کا پہلا قطرہ یوسف ظفر بنے۔ وہ ایک مقالہ لکھ کر لائے تھے ''ہمارے ادب کے سرچشمے'' اے لو یہ تو وہی بحث شروع ہوگئی جس پر ہم پچھلے کم وبیش دس سال سے حلقہ میں اور حلقہ سے باہر سر پھٹول کر رہے تھے کہ ہماری تاریخ اور ثقافت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ موہنجوداڑو سے یا مسلمانوں کی آمد کے وقت سے اور یوسف ظفر نے کمال دکھایا۔ پہلے یہ کہا کہ اردو ادب کی روایت کی تشکیل عرب وعجم کی روایت اور قرآن حکیم کی حکایات کے اثر میں ہوئی ہے اور افسوس کیا کہ اقبال کے بعد سے لکھنے والے اس روایت کو بھولتے جا رہے ہیں۔ پھر انہوں نے ایک زقند لگائی اور اس کے الٹ ایک افسوس کیا' کہا کہ ادب کی جڑیں زمین میں ہونی چاہئیں۔ پاکستان کے لکھنے والوں کی تحریروں میں پاکستان کے دریا اور پہاڑ کیوں نظر نہیں آتے۔

سجاد باقر رضوی نے دہائی دی کہ آپ نے تو اردو ادب کی روایت سے زمین ہی کو خارج کر دیا۔ پھر اس میں زمین کیوں تلاش کر

رہے ہیں۔

ایک زندہ دل کو ادرک کی مثال کی سوجھی۔ کہا کہ کنجڑے کی دکان پر ادرک کی وہ گانٹھیں سجی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہیں جن پر تھوڑی تھوڑی مٹی لگی ہو۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ادرک تازہ ہے اور ابھی کھیت سے آیا ہے۔ افسوس کہ پاکستان کا ادب ادرک کی سوکھی گانٹھ بن کر رہ گیا ہے۔ وہ ادب اور وہ ادرک کہاں ہے جس پر تھوڑی تھوڑی پاکستان کی مٹی لگی ہو۔

یہ دسمبر 1964ء کا ذکر ہے۔ مگر اس کے بعد پاکستان کونسل کو جلدی ہی احساس ہو گیا کہ اگر اس نے یہی روش قائم رکھی تو وہ دوسرا حلقہ ارباب ذوق بن کر رہ جائے گا۔ سو جلدی ہی محفل کا رنگ بدلا۔ بہر حال اس کا ایک فائدہ تو ہوا کہ اب وقتاً فوقتاً ہمیں بنگالی صورت بھی دیکھنے کو مل جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان سے کبھی کوئی مصور، کبھی کوئی مغنی، کبھی کوئی ادیب، کوئی دانشور وارد ہوتا اور اسے دیکھ کر ہم سمجھ لیتے کہ قومی یکجہتی پروان چڑھ رہی ہے۔

بس ثقافت کی حد تک اس شہر کا اتنا ہی مقدور تھا۔ رہا باہر کی ثقافتی دنیا سے رابطہ تو وہ بس چین کی حد تک تھا اور عجب ہے کہ تب سے اب تک چین ہی کی حد تک ہے۔ بس یہی کہ ادھر سے کوئی ثقافتی طائفہ یہاں آن وارد ہوا۔ یہاں سے کوئی ثقافتی طائفہ ادھر چلا گیا۔ چار ادیب ادھر سے آئے اور ہمیں صورت دکھا گئے۔ یہاں سے ادیبوں کی کوئی ٹولی اٹھی اور علم کی تلاش کے نام پر چین جا پہنچی۔ خیر چین کوئی ایسا ویسا ملک تو نہیں ہے۔ ایک قدیم تہذیب کا وارث ہے، مگر ہمارا تو جتنا بھی رابطہ ہوا انقلابی چین کی ثقافت سے ہوا اور یہ ہم آپ جانتے ہی ہیں کہ انقلاب لانے والے ادب اور ثقافت کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔

ہاں حیات احمد خاں کی پاکستان موسیقی کانفرنس نے یہ طور اپنایا تھا کہ موسیقی کا سالانہ جشن دھوم سے منایا جاتا اور اس کے لیے کلاسیکی موسیقی کے دوڑھائی تنگ ہندوستان سے بھی منگا لیے جاتے، مگر یہ سلسلہ بھی 1965ء میں جا کر ختم ہو گیا۔ مگر ٹھہریے 1965ء اب شروع تو ہونے لگا ہے، لیکن یہ جو امی جمی کے گنے چنے دن ہیں میں انہیں تو نبٹا دوں۔

اسی 1964ء کے بیچ ادب اور کلچر کے نام پر ایک اور شگوفہ بھی تو اس شہر میں پھوٹا تھا۔ کراچی میں ادب کے نام پر جو گل کھلا تھا اس کی خوشبو تو اب خیر سے ملک میں پھیل چکی تھی اور پشاور سے لے کر ڈھاکہ تک سارے ادیب متحرک تھے۔ حرکت میں برکت ہے۔ ادیب پہلی مرتبہ اس ملک میں حرکت میں آئے تھے۔ راوی ان کے لیے برکت لکھتا ہے، مگر جواب میں لاہور کو بھی تو کوئی گل کھلانا تھا۔ واضح ہو کہ کہنے والوں نے ان دنوں ایک اعلان یہ کیا تھا کہ ایوب خان پاکستان کے جنرل ڈیگال ہیں۔ تو پھر ان کا آندرے مالرو کسی کو ہونا تھا۔ شروع کے برسوں میں قدرت اللہ شہاب صاحب بھی بہت زوروں میں تھے۔ ساتھ میں گلڈ بھی زوروں میں تھا، مگر

اب ہوا کسی قدر بدل گئی تھی۔ اب کراچی بھی پیچھے رہ گیا تھا اور شہاب صاحب بھی تھوڑا پیچھے کھسک گئے تھے۔ اب ملک کا صدر مقام اسلام آباد تھا اور آندرے مالرو والا مقام الطاف گوہر صاحب نے حاصل کر لیا تھا۔ وہ اس وقت سیکرٹری اطلاعات تھے۔ خیر سیکرٹری اطلاعات تو آتے جاتے رہتے ہی ہیں مگر الطاف گوہر جس دھوم کے سیکرٹری اطلاعات گزرے ہیں ویسی دھوم کا سیکرٹری اطلاعات ہم نے تو پھر دیکھا نہیں۔ تجمل حسین ان کے بھائی اور یاروں کے یار' خیر یار تو وہ ایک وقت میں جمیل الدین عالی کے بھی تھے' مگر کنونشن کے ہنگام انہوں نے اپنا زور دکھایا اور اس شان سے دکھایا کہ جمیل الدین عالی پہلے برہم ہوئے' پھر ان کی آواز بھرائی' پھر وہ سٹیج پر تقریر کرتے کرتے بے ہوش ہو گئے۔

اب تجمل حسین لاہور میں آ کر براجے تھے۔ یہاں وہ انکم ٹیکس کمشنر بن کر وارد ہوئے تھے' مگر وارد ہوتے ہی ادب اور ثقافت کی سطح پر بھی متحرک ہو گئے۔ اب میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ اس شہر میں آ کر کس طرح شروع ہوئے تھے۔ اے لو اس زمانے کا لکھا ہوا ایک کالم یعنی وہ جو لاہور نامہ کے عنوان سے میں لکھا کرتا تھا کاغذوں میں سے برآمد ہو گیا ہے۔ میں اسے پڑھنا شروع کرتا ہوں اور یاد کرتا ہوں کہ ہوا کیا تھا۔ یہ 14 جون 1964ء کا کالم ہے۔

''چند دانشور خاموشی سے جمع ہوئے۔ مرنجاں مرنج طریق پر سوچ بچار کیا۔ ایک نے تجویز پیش کی' دوسرے نے تائید کی۔ یوں ادارہ بھی بن گیا اور کمیٹیاں بھی قائم ہو گئیں' مگر جب یہ سوال آیا کہ ادارے کا نام کیا ہو تو لڑائی شروع ہو گئی۔

''نام پر لڑائی ہمارے یہاں نئی بات نہیں' ہمارے معاشرے میں بعض گھرانوں کی ہیت ترکیبی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ خالہ جان سنی ہیں تو پھوپھی اماں شیعہ ہیں۔ ایسے گھرانے میں بچہ پیدا ہو تو یوں ڈھولک بھی بجتی ہے اور مبارک سلامت کا شور بھی ہوتا ہے۔ مگر جہاں یہ سوال آیا کہ بچہ کا نام کیا ہو تو گھر پانی پت کا میدان بن جاتا ہے۔ پھر زچہ و بچہ بیک گراؤنڈ میں چلے جاتے ہیں اور نظریات و عقائد آپس میں ٹکراتے ہیں۔

''اعجاز حسین بٹالوی اس روایت کا شاندار تجربہ رکھتے ہیں' اس لیے وہ شعور سے لڑے۔ مگر اے ڈی اظہر صاحب اور ڈاکٹر باقر اندھا دھند ایک دوسرے سے ٹکرائے اور لہولہان ہو گئے۔

''اس جلسہ میں کچھ جانے پہچانے ادیب موجود تھے' کچھ جانے پہچانے ادیب موجود نہیں تھے۔ اور کچھ کو جنہیں ادیب کی حیثیت سے پہچانا نہ جا سکا' انہیں ہم نے دانشوروں میں شمار کیا۔ صدارت کی کرسی پر صوفی تبسم بیٹھے تھے اور جلسہ کی روح رواں تجمل حسین صاحب تھے' جنہوں نے شہر میں داخل ہوتے ہی اپنے وجود کا ثبوت دے دیا تھا۔ جب اوپن ایئر تھیٹر میں مشاعرہ ہوا تو اسی

وقت ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ تو محض ابتدا ہے۔

''تجمل حسین صاحب کی یہ تجویز تھی کہ لاہور میں افریشیائی پیمانے پر ایک تہذیبی تقریب منعقد کی جائے۔ اس کے ذیل میں ملک ملک سے ادیب آئیں۔ ادبی اجتماعات ہوں۔ مصوری کی نمائش سجے۔ ڈرامے کھیلے جائیں۔

''سب نے سنا اور اتفاق کیا اور میں حیران تھا کہ یا اللہ اتنے گئو لوگ یہاں جمع ہیں کہ کسی مسئلہ پر سرے سے اختلاف ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تب تجمل صاحب نے اطمینان کا سانس لیا اور بولے اس ادارے کا نام بھی رکھ لیں۔ میں نے اس کا نام ''تھنکر زفورم'' سوچا ہے۔ ''تھنکر زفورم؟'' اے ڈی اظہر صاحب نے فوراً ایک پھریری لی۔ اے ڈی اظہر صاحب بہت سادہ نکلے۔ انہوں نے قومی زبان میں نام رکھنے کے حق میں اس اعتماد سے تقریر کی جیسے سب ان کے قائل ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر باقر کی قوت کا انہیں آخر وقت تک اندازہ نہیں ہوا۔

''شہر میں پہلے اونٹ بدنام ہوتا تھا' اب بنگالی بدنام ہیں۔ اردو کی جہاں کسی نے بات کی' یاروں نے منہ پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا ''بنگالی خفا ہو جائیں گے' یہ تمام فیصلے ہو گئے اور کسی نے نہیں کہا کہ آپ کل پاکستانی بنیادوں پر جب ایک قصہ شروع کر رہے ہیں تو کسی بنگالی کو بھی مشورے میں شامل کر لیں مگر اب اردو میں نام رکھنے کا سوال آیا تو مختلف حضرات کو بنگالیوں کی یاد آئی۔

''اس کے علاوہ بھی چند دلچسپ دلائل پیش ہوئے۔ ایک دلچسپ دلیل اعجاز حسین بٹالوی نے دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر پاکستان کے اندر کا معاملہ ہوتا تو اس کا نام اردو میں رکھنا مناسب تھا۔ مگر چونکہ اس ادارے کو بین الاقوامی سطح پر سرگرم ہونا چاہیے' اس لیے اس کا نام انگریزی میں ہونا چاہیے۔ واضح رہے کہ اعجاز حسین بٹالوی پچھلے بارہ سال سے بین الاقوامی سطح پر سرگرم ہیں اور ان کا ایک قدم لندن میں اور ایک قدم نیویارک میں ہوتا ہے۔ مگر ابھی تک انہوں نے اپنا کوئی انگریزی نام نہیں رکھا ہے۔ بحث کے دوران اے ڈی اظہر صاحب کو طیش آیا اور انہوں نے اعلان کیا کہ ہم نے اپنی مادری زبان اردو لکھوائی تھی اس کا خضر تمیمی صاحب نے خوب جواب دیا کہ وہ تو پاکستان سے پہلے لکھوائی تھی۔

''احمد ندیم قاسمی نے چین کی مثال پیش کی اور بتایا کہ وہاں قومی زبان میں اداروں کا نام رکھتے ہیں' مگر ایک نام انگریزی میں بھی رکھ لیتے ہیں۔ ویسے اس بحث میں یہ منزل کئی بار آئی کہ تجمل حسین نے کہا کہ اچھا نام انگریزی میں اور دوسرا نام اردو میں۔ اے ڈی اظہر صاحب کو اصرار ہوا کہ پہلا نام اردو میں اور دوسرا نام انگریزی میں۔ جب وہ ذرا چپ ہوئے اور تجمل حسین نے موقع غنیمت جان کر جھٹ پٹ اس فیصلہ کو قلم بند کرنا چاہا تو صوفی صاحب نے ٹوکا کہ ٹھہریئے کیا یہ فیصلہ ہو گیا ہے۔ پس کرسی صدارت کے ایما پر یہ

تنازعہ دوبارہ شروع ہوا اور طول کھنچتا چلا گیا۔ کسی نے کہا کہ اچھا اردو کو چھوڑو فارسی میں نام رکھتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر باقر کو فارسی میں سے اردو کی خوشبو آنے لگی۔ پھر کسی نے کہا کہ اچھا عربی میں نام رکھ لیتے ہیں۔ یہ نام اے ڈی اظہر صاحب کو نامانوس نظر آیا۔

''تو نہ یار لوگ عربی پر متفق ہوئے نہ فارسی پر نہ اردو پر اتفاق انگریزی پر ہی ہوا۔ بس اے ڈی اظہر اور عجائب گھر والے شمس لیجیو دوڑیو کرتے رہ گئے۔ اتفاق ہم ہر پھر کر انگریزی ہی پر کرتے ہیں۔

''اس بحث میں سب سے کام کی بات جمیلہ ہاشمی نے کہی۔ انہوں نے گردن سے بہت سارا پسینہ پونچھا اور بولیں ہائے اللہ خود تو پنکھے کے سامنے بیٹھے ہیں اور ہمیں گرمی میں بھون ڈالا۔''

تو لیجیے تھنکرز فورم منصہ شہود پر آ گیا۔ رائٹرز گلڈ تو ملک گیر سطح پر متحرک ہوا تھا تھنکرز فورم اونچا اڑا۔ پہلی ہی اڑان میں افریشیائی بلندیوں کی خبر لایا۔ افریشیائی جشن کی تیاریاں کس شان سے ہوئیں۔ اتفاق سے اس تقریب سے بھی لکھا ہوا ایک لاہور نامہ مجھے مل گیا ہے۔ یہ 31 جنوری 1965ء کا لکھا ہوا ہے۔ اچھا ذرا پڑھ کر دیکھتا ہوں کہ اس وقت ہوا کیا تھا۔

''تھنکرز فورم میں جس افریشیائی جشن کا وعدہ کیا تھا وہ سچ مچ منعقد ہو رہا ہے۔ اب اس جشن کو ہوا سمجھو کہ فورم کے سیکرٹری جنرل تجمل حسین صاحب پاکستان کونسل میں آ کر اس جشن کی تفصیل بھی بتا گئے اور تیاریوں کی خبر بھی دے گئے۔

''تیاریوں میں ایک تیاری تو یہی ہے کہ مہمان ادیب ٹھہریں گے کہاں اور کھائیں گے کیا؟ یہ تیاری بہت اہم ہے۔ کیونکہ ہمیں یہ بات یاد ہے کہ یہ تیاری نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان میں ژاں پال سارتر کی آمد ملتوی ہو گئی تھی۔ ہوا یوں کہ پاکستان رائٹرز گلڈ نے ایک برس یہ اعلان کیا کہ ہم اپنے سالانہ اجلاس میں ایزرا پاؤنڈ اور ژاں پال سارتر کو بلائیں گے۔

''یہ اعلان ہونے کے بعد جب گلڈ کی انتظامیہ کمیٹی کا جلسہ ہوا تو یورپ میں گھومے پھرے ایک ادیب نے یہ سوال اٹھایا کہ آپ ان بزرگوں کو ٹھہرائیں گے کہاں؟

''یہ سوال بہت پریشان کن ثابت ہوا۔ تب منیر نیازی نے کہا کہ ''سارتر کو تو میں اپنے ہاں ٹھہرا لوں گا۔''

''یعنی کہاں؟'' کسی نے سوال کیا۔

''اس پر شاعر نے کہا کہ میں نے اچھرہ موڑ پر ایک کمرہ کرائے پر لیا ہے۔ ایک چارپائی تو ہے ایک چارپائی کا انتظام اور کر لوں گا۔ سارتر بھی ادیب ہے، میں بھی ادیب ہوں، زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں، ہم دونوں مزے سے رہیں گے۔

''شاعر کی اس پیشکش پر اعجاز حسین بٹالوی نے تیوری پر بہت بل ڈالے اور کہا کہ ''دیکھئے منیر نیازی صاحب بات یہ ہے کہ

یورپین ادیب رہائش کے معاملے میں باتھ روم کو بہت اہمیت دیتے ہیں' آپ کا باتھ روم کیسا ہے۔ اس سوال نے منیر نیازی کو بہت گڑبڑایا۔ اعجاز حسین بٹالوی بھی اس مسئلہ کا مناسب حل پیش نہ کر سکے اور یورپین ادیبوں کی آمد کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

''اعجاز حسین بٹالوی تھنکرز فورم کی انتظامی کمیٹی میں شامل ہیں اور اس کمیٹی نے رہائش کے مسئلہ پر مناسب توجہ دی ہے۔ جشن کے دنوں میں پورا پارک لگژری ہوٹل فورم کے تصرف میں ہوگا پھر بہت سے کمرے نوزائیدہ انٹرنیشنل ہوٹل کے اور کچھ کمرے ایمبیسیڈر کے اس کے پاس ہوں گے۔

''کھانے کی تفصیلات بہت ہیں۔ ایک تفصیل یہ ہے کہ پرانے شہر کی ایک حویلی میں ایک دسترخوان بچھے گا اور افریشیائی ادیب پاکستانی کھانے تناول کریں گے۔

''یہ تفصیل جان کر ہمیں وہ خاتون افسانہ نگار یاد آئیں جنہوں نے شہزادہ تھائی لینڈ کی دعوت میں بیٹھے بیٹھے یہ کہا تھا کہ غیر ملکی مہمانوں کو ہم یورپین طرز پر کھانا کیوں کھلاتے ہیں۔ کیوں نہیں ہم دسترخوان بچھاتے اور انہیں دیسی کھانے کھلاتے ہیں' مگر پھر ہم نے ''مشرق'' میں نعیم طاہر صاحب کا ایک خط پڑھا اور یہ پڑھ کر حیران ہوئے کہ نعیم طاہر صاحب تو غیر ملکی مہمانوں کی ہم راہی میں ان کے گھر بہت دعوتیں کھا چکے ہیں اور یہ سب دعوتیں ڈائننگ ٹیبل پر چھری کانٹے کے ساتھ ہوئی تھیں بلکہ غیر ملکی مہمان نہ ہوتے تو بھی چھری کانٹوں کا استعمال بڑے اہتمام سے کیا جاتا تھا۔

''خیر یہ کھانے والے جانیں اور کھلانے والے جانیں ہمیں کیا۔ اور پھر یہ کہ ادیب کے قول و فعل میں ہم آہنگی کوئی ایسی لازم بھی نہیں۔ بہرحال تھنکرز فورم ایک دسترخوان پرانے شہر کی ایک حویلی میں بچھائے گا اور افسانہ نگار موصوف کو جو دیسی کھانے پسند ہیں وہ سب وہاں موجود ہوں گے۔ ویسے ہمارا یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ اس دسترخوان پر کیا بھارت کے ادیب بھی موجود ہوں گے اور کیا انہیں الگ بھوجن پروسا جائے گا۔ کہتے ہیں کہ چینی بھی کھانے کے معاملہ میں سخت متعصب واقع ہوئے ہیں۔ خیر ایک دسترخوان پر افریشیائی حضرات کو بٹھا کر دیکھ لیجئے پھر کھلے گا کہ افریقہ اور ایشیا میں تہذیبی یگانگت کتنی ہے۔

''یہ لوگ ڈائننگ ٹیبل پر چھری کانٹے کے ساتھ متحد ہو سکتے ہیں۔ دسترخوان کو درمیان میں لائیں گے تو پھر سب یاروں کا اپنا اپنا دسترخوان ہوگا اور اپنے اپنے کھانے۔

''ویسے کچھ ایسے تہذیبی مشاغل بھی ہیں جو اس جشن کے پروگرام میں شامل نہیں۔ مگر جن پر کسی ایشیائی یا افریقی ادیب کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ڈرامہ بھی جائز اور محفل موسیقی اور مشاعرہ بھی جائز' مگر کیا مضائقہ تھا کہ پتنگ بازی اور کبوتر بازی ایسے ثقافتی مشاغل کو

بھی پروگرام میں شامل کرلیا جاتا۔ پتنگ پاکستان اور بھارت میں تو خیر اڑتی ہی ہے چین سے بھی اس فن عزیز کا بڑا گہرا تعلق ہے۔

''تجمل حسین صاحب نے بتایا کہ اس تقریب کے ذیل میں کچھ عام اجلاس ہوں گے اور کچھ نشستیں ایسی ہوں گی جن کے دروازے پبلک اور پریس پر وا نہیں ہوں گے۔

اس پر عبداللہ ملک کو بہت طیش آیا۔ اور انہوں نے بہت سوال کیے۔ مگر تجمل حسین کا استدلال یہ تھا کہ بین الاقوامی اجتماعات میں مختلف نشستوں کے بارے میں اس قسم کی احتیاط کا دستور چلا آرہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ادیب بعض اوقات ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو ان کے ملک کی خارجہ پالیسی سے ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔ اور اس لیے اگر یہ کاروائی پریس میں آئے تو اس سے سیاسی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اصل میں جب ادیبوں کے بین الاقوامی اجتماعات کا رواج بڑھا تب انہیں پتا چلا کہ وہ اتنے آزاد نہیں ہیں جتنا آپ کو وہ سمجھتے چلے آئے ہیں۔ بیسویں صدی کا ادیب چلا تھا اس مقام سے کہ وہ اللہ میاں سے گلوخلاصی حاصل کرے گا اور پہنچا اس مقام پر کہ جو ادیب جس ملک کا ہے وہ اس ملک کی خارجہ پالیسی کا پابند ہے۔''

ویسے تو میں نے اس جشن کی ساری تفصیلات ہی اپنے کالموں میں قلمبند کی تھیں' مگر ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گیا۔ ان میں سے کوئی کالم دستیاب نہیں ہوا۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ دسترخوان واقعی ویسا ہی بچھا تھا جیسا وعدہ کیا گیا تھا۔ افریشیائی مہمانوں کے طفیل میں نے بھی اس دسترخوان پر مزے مزے کے کھانے کھائے تھے۔ میں ان میں سے نہیں ہوں کہ کھا کر بھول جاؤں۔ میں نے تھنکرز فورم کا نمک کھایا ہے۔ ہاں ان اجلاسوں کی بس دو باتیں مجھے یاد آرہی ہیں۔ ایک تو قراردادوں والے سیشن میں فیض صاحب بہت سرگرم تھے۔ مختلف افریشیائی مندوبین کو مناتے پھر رہے تھے کہ کسی متنازع فیہ سیاسی مسئلہ پر قرارداد پیش کرنے پر اصرار مت کرو۔ دوسری بات مجھے یہ یاد ہے کہ اختتامی اجلاس میں ملک راج آنند نے بہت زوردار تقریر کی تھی۔

جب اجلاس ختم ہوا تو میں نے ابن انشا سے مل کر ایک سازش کی۔ میں نے کہا کہ یار' یہ اتوار کی شام ہے۔ حلقہ کا جلسہ اب شروع ہونے کو ہوگا۔ کوئی ایسی ترکیب کرو کہ ہم ملک راج آنند کو یہاں سے نکال کر حلقہ میں لے چلیں۔ ابن انشا فوراً ہی ان کی طرف دوڑا۔ میرا تعارف کرایا کہ ''یہ انتظار حسین ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری ہیں۔ آپ کو حلقہ کے جلسہ میں شرکت کی دعوت دینا چاہتے ہیں۔''

میں نے فوراً ٹکڑا لگایا ''دیکھیے اس شہر کے نوجوان ادیبوں کو اگر آپ نوازنا چاہتے ہیں تو وہ تو اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ وہ تو آپ کو حلقہ میں ملیں گے۔''

ملک راج آنند چلنے کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ ہم انہیں حلقہ میں لے کر آئے۔ جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ جیلانی کامران صدرات کر رہے تھے۔ میں نے جوائنٹ سکیرٹری عزیز الدین احمد کی معرفت جیلانی کامران کو پیغام دیا کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم مہمان کا استقبال کرتے ہوئے صدارت کی کرسی پر اسے بٹھا دو۔ جیلانی کامران نے صاف کہہ دیا کہ میں صدارت کی کرسی پر بیٹھ چکا ہوں۔ اب میں کسی کی خاطر اس کرسی سے نہیں اٹھوں گا۔ جیلانی کامران نے پاکستان کی روایات کے عین مطابق کیا۔ یہاں کرسی پر جو بھی بیٹھ جاتا ہے پھر اسے خدا ہی اٹھائے تو اٹھتا ہے۔ میں نے پھر وہی امریکی مہمانوں والا نسخہ استعمال کیا کہ یہاں عزت سے بٹھاؤ' باقی عزت افزائی ٹی ہاؤس میں چل کر کرو۔

ہم ایسے وقت میں جلسہ میں پہنچے تھے جب نظم پڑھی جا چکی تھی۔ اب اس پر بحث ہو رہی تھی۔ نظم کی ایک نقل ملک راج آنند کو پیش کی گئی۔ انہیں کیا خبر کہ شاعر کون ہے۔ نظم پڑھ کر گویا ہوئے کہ یہ نظم بتا رہی ہے کہ اس کا لکھنے والا بیس اکیس کی عمر کا کوئی نوجوان ہے۔

اس پر جلسہ میں ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ یہ تبسم کاشمیری کی نظم تھی۔ اس وقت اس عزیز کی یہی عمر تھی۔ میں ملک راج آنند کی تقریر سے پہلے ہی متاثر تھا' اب اور قائل ہو گیا کہ کمال صاحب نظر ہے۔ شعر پڑھ کر شاعر کی عمر بتا دیتا ہے۔

◆◆◆

حکیم جی کا مطب ہماری بیٹھک

''مشرق'' کے دفتر کے عین سامنے کی گلی میں ایک چھوٹا سا مطب تھا جو یاروں کی بیٹھک بھی تھا۔ مگر پہلے تو مجھے خود ''مشرق'' کا ذکر کرنا چاہیے جس نے مجھے کالم نگار بنایا ورنہ صحافت تو بہت پہلے سے میرا پیشہ چلی آ رہی تھی۔ ویسے کالم نگاری کا آغاز ''آفاق'' ہی سے ہو گیا تھا' مگر وہاں میں اس حیثیت میں بدنام نہیں ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ اپنے نام سے نہیں لکھتا تھا' پھر کالم نے بھی کچھ ایسی شہرت حاصل نہیں کی۔

آفاق کے ذکر کے ساتھ مجھے کچھ شخصیتیں یاد آ رہی ہیں۔ سب سے پہلے پروفیسر سرور کا ذکر کرنا چاہیے جو آفاق کے دور اول میں آفاق کے ایڈیٹر تھے۔ آدمی شریف تھے۔ اور اخباروں میں جو سیاست ہوتی ہے شریف آدمی اس کا مقابلہ کم ہی کر پاتا ہے۔ سو انہیں جلدی ہی اس اخبار سے نکلنا پڑا۔ بہر حال میرا ان سے ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ابھی میں کہہ رہا تھا کہ سرور صاحب شریف آدمی تھے' اس لیے میں نے انہیں پریشان حال ہی پایا۔ پریشاں حالی نہ ہوتی تو بھی انہیں پریشان ہی رہنا تھا۔ سرور صاحب جامعی تھے۔ اور ان کا المیہ یہ تھا کہ جامعہ ملیہ کو وہ کبھی بھول نہیں پائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی بصیرت پر ایمان کامل رکھتے تھے اور ان کے کہے کو حرف آخر جانتے تھے۔ سو ان کے سوچنے کا انداز اور' اردگرد یار و اغیار کے سوچنے کا انداز اور۔ میں جب حاضر خدمت ہوتا تو کھل اٹھتے اور بس شروع ہو جاتے۔ لگتا کہ بہت دنوں سے کوئی ایسا نہیں ملا جس سے وہ اپنی جامعی فکر کے ساتھ بے تکلف بات کر سکیں۔

''آفاق'' بند ہو کر جب دوبارہ شروع ہوا تو اب اس کے ایڈیٹر مولانا غلام عباس مہر تھے اور مینجنگ ایڈیٹر میر نور احمد' یہ دونوں شخصیتیں ظاہر میں تو ایک دوسرے کی ضد تھیں' اور ہر اعتبار سے۔ میر نور احمد دبلے پتلے لمبے لگ لگ۔ مولانا غلام رسول مہر چوڑے چکلے۔ میر صاحب بات اتنی آہستہ کرتے کہ لگتا کہ بس منمنا رہے ہیں۔ مہر صاحب بات اتنے اونچے لہجہ میں کرتے کہ سارا کمرہ گونج جاتا۔ پھر میر صاحب تو پنجاب کے محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر رہے تھے اور پنجاب کی سیاست میں پیرے ہوئے تھے۔ مہر صاحب مرد محقق' اپنی تصنیف و تالیف کے کاموں میں غرق۔ کسی وقت میں سرگرم اخبار نویس رہے ہوں گے۔ آخر اخبار انقلاب کے واسطے سے سالک و مہر کی جوڑی بلاوجہ تو مشہور نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب تو ان کی اخبار نویسی اور ساتھ میں ایڈیٹری بس اتنی تھی کہ آتے' اداریہ لکھتے اور فوراً ہی چلے جاتے اور کب آتے تھے اور کب جاتے تھے اس کا دفتر میں شاید ہی کسی کو پتا چلتا ہو۔

تو سیاہ وسفید کے مالک میر صاحب تھے۔ ایک روز انہوں نے مجھے یاد کیا اور اطلاع دی ''انتظار صاحب'' آپ تو سرپلس ہو گئے۔''

میں کچھ نہ سمجھا۔ تب انہوں نے وضاحت کی ''آپ کے ذمے تو خصوصی ایڈیشن تھا اخراجات زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ہم اسے بند کر رہے ہیں تو آپ سرپلس ہو گئے۔ رکے۔ پھر بولے ''مگر ہم آپ کو چھوڑنا نہیں چاہتے' یہ بتایئے اس اخبار میں آپ اور کیا کام کر سکتے ہیں۔ ڈیسک پر تو آپ نہیں جانا چاہیں گے۔''

''جی نہیں۔''

پھر سوچئے' بتایئے آپ کے سپرد کون سا کام کیا جا سکتا ہے؟

مجھے اچانک خیال آیا۔ ''آفاق'' میں ایک مستقل کالم ''افکار و حوادث'' کے عنوان سے چھپتا چلا آیا تھا جو مولانا عبدالمجید سالک لکھا کرتے تھے' مگر اب آفاق سے ان کا تعلق منقطع تھا۔ چند دن یہ کالم شوکت تھانوی نے لکھا۔ مگر شاید ان کی ریڈیو کی مصروفیات کے ساتھ یہ کالم چل نہیں سکا۔ سو انہوں نے معذرت کر لی۔

''آپ پسند کریں تو افکار و حوادث کا کالم مجھ سے لکھوایئے۔''

میر صاحب نے تامل کیا۔ پھر بولے ''آپ کو معلوم ہے یہ کالم سالک صاحب لکھا کرتے تھے؟''

''جی معلوم ہے۔''

سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے ''اچھا ایسا کیجئے' آپ تو مہر صاحب کے گھر قریب ہی کہیں رہتے ہیں تو ایسا کیجئے کہ صبح یہاں آنے سے پہلے کالم لکھ کر مہر صاحب کے پاس لے جایا کریں۔ وہ فیصلہ کریں گے۔''

اگلی صبح کالم لکھ کر میں گھر سے نکلا اور مہر صاحب کی طرف چلا۔ میں نے گیٹ میں قدم رکھا تو احساس ہوا کہ مہر صاحب زور زور سے بول رہے ہیں۔ کمرے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مہر صاحب آنکھیں موندے اونچی آواز میں بول رہے ہیں اور قریب بیٹھے ایک بزرگ جو بعد میں پتا چلا کہ نشتر جالندھری ہیں تیزی سے لکھ رہے ہیں۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھ کر اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ پھر آنکھیں موند لیں اور بولنا شروع کر دیا۔

پتا چلا کہ یہ ان کا معمول ہے۔ وہ بولتے ہیں اور نشتر جالندھری لکھتے ہیں۔ جب ڈکٹیشن سے فارغ ہوئے تو میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے بتایا کہ آپ کو میرا کالم دیکھنا ہے۔

''ہاں ہاں میر صاحب نے ذکر کیا تھا' آپ کالم میرے پاس چھوڑ جائیں۔''

تین چار دن تک میں باقاعدگی سے مہر صاحب کے یہاں جاتا رہا اور یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر مہر صاحب نے مجھے مطلع کیا' عزیز' اب آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے' میر صاحب کو میں نے بتا دیا ہے۔''

میر صاحب سے جا کر ملا تو پتا چلا کہ مہر صاحب نے تو مجھے پاس کر دیا ہے۔ اب میر صاحب نے میری ٹریننگ شروع کی۔ ''دیکھئے یہ آپ کا ادبی کالم' محفلیں' نہیں ہے اس میں ملکی سیاست پر بات ہوتی ہے۔ تو بات ایسے کہی جانی چاہیے کہ بات بھی ہو جائے اور آپ پکڑ میں بھی نہ آئیں۔''

میر صاحب بہت رکھ رکھاؤ سے بات کرتے تھے۔ کسی فقرے کسی بیان پر اعتراض ہوتا تو کہتے ''انتظار صاحب' یہ جو آپ نے فقرہ لکھا ہے'' چپ ہو جاتے' رکتے' آں ان کرتے رہتے' پھر کہتے ''یہ فقرہ تو کھلا ڈلا بیان ہے اس پر تو اخبار کو نوٹس بھی آ سکتا ہے'' یا پھر اس قسم کی بات کہ ''انتظار صاحب' یہ دو جو فقرے آپ نے آخر میں لکھے ہیں۔'' پھر چپ' پھر جیسے بات کہنے کے لیے مناسب لفظ تلاش کر رہے ہیں ''کیا خیال ہے آپ کا' یہ فقرے زائد نہیں ہیں' بات تو آپ کی پچھلے فقرے میں مکمل ہو گئی ہے۔''

میں سمجھتا تھا کہ میر صاحب بس افسر قسم کی شخصیت ہیں۔ ریٹائر ہو کر اخبار سنبھال لیا' مگر نہیں صاحب' وہ تو زبان و بیان کی باریکیوں میں جاتے تھے' فقرہ ذرا ابودا ہو یا فالتو ہو تو فوراً انگلی رکھتے تھے۔ انہوں نے آگے چل کر جو کتاب لکھی ''مارشل لا سے مارشل لا تک'' اس میں بھی آپ یہ دیکھیں گے کہ بات نپی تلی' بیان حشو و زائد سے پاک۔

جب اخبار ڈوبنے لگا تو سہگل والوں نے اس سے اپنا دامن چھڑایا اور مشرق کے عملہ کو بخش دیا کہ اخبار اب تمہارا ہے' تم جانو' تمہارا کام جانے' حکیم محمد حسن قرشی سے معاملہ کر لیا۔ حکیم صاحب شریف النفس' مانے ہوئے حکیم' مگر شفا اب اس اخبار کی تقدیر میں نہیں تھی۔

حکیم محمد حسن قرشی تو آفاق کے دفتر میں کبھی نہیں آئے' مگر ان کے چھوٹے صاحبزادے حکیم ریاض قرشی دفتر میں آ کر بیٹھے تھے ان کی حکمت کا میں فوراً ہی قائل ہو گیا تھا۔ میں ان دنوں گردے کے مرض میں مبتلا تھا اور سخت تکلیف میں تھا۔ چار پڑیاں دے کر انہوں نے تکلیف کو تو فوراً ہی رفع کر دیا۔ پھر کہا کہ ایسی معجون بنا کر دوں گا کہ پتھری ریزہ ریزہ ہو کر نکل جائے گی۔ بس آپ دو کالے بچھو مجھے عنایت کر دیں۔''

''میں کالے بچھو آپ کے کے لیے کہاں سے لاؤں۔''

''پنجاب میں کالا بچھو نہیں ہوتا۔ سرحد میں ہوتا ہے۔ پشاور میں جو ''آفاق'' کا نمائندہ ہے اس سے کہیں۔ وہ فراہم کرے گا۔''

میں نے پشاور کے نمائندے سے بات کی۔ لیجیے دو کالے بچھو آ گئے اور حکیم ریاض نے معجون بنانی شروع کر دی' مگر وہ معجون میری تقدیر میں نہیں تھی۔ اخبار زوال کرتا چلا جا رہا تھا۔ اتنا زوال کیا کہ میں اس کا ایڈیٹر بن گیا' مگر اس کے فوراً بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ میں نے مختصراً استعفیٰ لکھا اور گھر بیٹھ رہا۔ پھر حکیم ریاض سے فون پر بات ہوئی۔ کہہ رہے تھے کہ ''ایک مرتبہ دفتر تو آئیں۔ وہ معجون آپ کا انتظار کر رہی ہے۔'' میں نے کہا کہ وہ معجون آپ کسی دوسرے مریض کو چٹائیں۔''

''مگر کالے بچھو تو آپ نے دیئے تھے۔''

''وہ کالے بچھو میں نے آپ کو بخشے۔ آپ مجھے بخش دیجیے۔''

لو بات میری کالم نگاری سے چلی تھی اور بچھوؤں تک پہنچی۔ کالم نگاری کا واقعی بکھیڑا مشرق سے شروع ہوا۔ میں اسی گمان میں تھا کہ مروجہ صحافتی روایت کے مطابق کوئی اچھا سا قلمی نام رکھوں گا اور کالم لکھا کروں گا۔ ''مشرق'' کے بانی اور مینجنگ ایڈیٹر عنایت اللہ صاحب نے کہا ''جی نہیں' کالم آپ کے نام سے چھپے گا اور ساتھ ہی آپ کی تصویر بھی چھپا کرے گی۔''

میں نے انہیں اردو صحافت کی روایت کا احساس دلانے کی کوشش کی اور صحافت میں قلمی نام کی معنویت پر روشنی ڈالی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔

شام کو ناصر سے ملاقات ہوئی تو میں نے اسے بتایا کہ مشرق سے میرا معاملہ طے ہو گیا' مگر انہوں نے عجب شرط رکھی ہے کہ کالم نام سے چھپے گا اور ساتھ میں تصویر بھی چھپا کرے گی۔

''بس پھر تم دوسرے احسان بی اے بن جاؤ گے۔ ادب سے تو گئے۔''

میرا منہ پہلے ہی لٹکا ہوا تھا۔ اب اور لٹک گیا۔ ناصر نے میری کیفیت دیکھی تو دھیرے دھیرے پینترا بدلا۔ سمجھانے لگا کہ لکھنے والوں کی زندگی میں ایسے فرمائشی مرحلے بھی آتے ہیں جب انہیں اور قسم کا کام کرنا پڑتا ہے اور خطرہ ہوتا ہے کہ ان کا اصل کام اور نام اس کام کے نیچے دب جائے گا۔ اصل امتحان ادیب کا ایسے ہی وقت میں ہوتا ہے۔ تمہارے لیے بھی یہ امتحان ہے کہ تم اپنے افسانہ نگار کی شناخت کو کالم نگاری سے الگ کس طرح برقرار رکھتے ہو۔

اب چونکہ مجھے اپنے اصل نام سے کالم لکھنا تھا اس لیے اپنے حال پر غور کر کے ایک فیصلہ کرنا لازم آیا کہ استاد تینوں کھونٹ جانا۔ چوتھے کھونٹ میں کبھی قدم مت رکھنا' مبادا تم انسان سے حیوان بن جاؤ' بندر یا سور یا ہرن۔ پاکستانی سیاست میرے لیے چوتھا کھونٹ

ٹھہری۔ اب اگر اس کوچے سے کوئی مخلوق نکل کر میرے پالے میں آ جائے' یعنی اولوالعزم ادیبوں کی تصانیف کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے سپیچ رائٹروں کی مدد سے ادیبوں کو سمجھانے لگے کہ انہیں کیسا ادب لکھنا چاہیے تو پھر تو مجبوری ہے۔ ایسے بھاشن سے تو کما حقہ انصاف کرنا ہی ہوگا۔ باقی خود ان کے کوچے میں کبھی مت جاؤ۔

اس فیصلہ کی افادیت کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب ''مشرق'' پریس ٹرسٹ کے سایہ عاطفت میں چلا گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں پہنچتے پہنچتے عجب صورت حال پیدا ہوئی۔ ان کے مقرر کردہ محبوب ایڈیٹر ضیاء السلام انصاری نے سوچا کہ ''مشرق'' میں ایسا کالم بھی تو ہونا چاہیے جس میں اس مرد آہن کے کارنامے بیان کیے جائیں۔ یہ کام انہوں نے اپنے ذمے لیا اور ایسا کالم لکھنا شروع کیا جو روز صفحہ اول پر شائع ہوتا۔ اب مشرق کا اصلی تے وڈا کالم یہ تھا اور یہیں سے مشرق نے پٹخی کھائی اور ڈوبتا چلا گیا۔

''مشرق'' کی ابتدا کیا تھی اور انتہا کیا ہوئی۔ اس اخبار کی تقریب سے اردو صحافت میں شاید پہلی مرتبہ عورت کا قدم آیا۔ خواتین کا صفحہ شروع ہوا جس کے متعلق کہا گیا کہ اسے مرد بھی پڑھ سکتے ہیں۔ ''بھی'' کیا معنی مسرت جبیں کا کالم تو مردوں ہی میں زیادہ مقبول تھا۔ عورتوں کے معاملات کچھ اس طرح یہاں زیر بحث آئے کہ مشرق نے باورچی خانے سے لے کر گرلز کالج تک میں مقبولیت پائی۔ ریاض بٹالوی نے جس فیچر نگاری کی طرح ڈالی' اس کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

فقیروں کے بھیس پر موقوف نہیں۔ ایک مرتبہ مریض کا بھیس بھرا اور ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ وہاں جو ڈاکٹروں کا احوال دیکھا وہ وہاں سے نکل کر اپنے فیچر میں بیان کیا۔ اے لو ڈاکٹر بگڑ گئے۔ مشرق کے دفتر پر ہلہ بول دیا۔ ایک دفعہ اپنے گم ہو جانے کا شگوفہ چھوڑا۔ بھیس بدل بدل کر کبھی اس تھانے میں۔ مقصود یہ تھا کہ تھانوں کا احوال معلوم کیا جائے اور فیچر میں اسے بیان کیا جائے۔

کیا خوب اخبار تھا۔ جب حکومت کے خلاف تحریک چلتی تھی تو اس کے دفتر پر اینٹیں برستی تھیں۔ جب تحریک کا زمانہ گزر جاتا تو پھر داد کے ڈونگرے برستے تھے۔ اشاعت جو گر جاتی تھی پھر بحال ہو جاتی۔

اچھا میرے کالم کے بارے میں ڈیڑھ بات سن لیجئے۔ عنایت اللہ صاحب نے مجھے ایک نوٹس اور دیا تھا' دیکھئے آپ کا کالم ادبی حلقوں میں پڑھا جاتا ہے یا نہیں' اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں' ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ''مشرق'' کا یہ کالم بھاٹی دروازے کے تھڑوں پر پڑھا جانا چاہیے۔''

اس قسم کا کالم کیسے لکھ پاؤں گا' سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ قلم ہر پھر کر کسی ادبی یا تہذیبی مسئلہ کی طرف مڑ جاتا اور روز طعنہ ملتا کہ بھائی دروازے کے دکانداروں کو تو پتا ہی نہیں چل رہا کہ مشرق میں کوئی کالم لاہور نامہ کے عنوان سے بھی چھپتا ہے۔ اس مشکل صورت حال سے فلمی اداکارہ نیلو نے مجھے نجات دلائی۔ افواہ اڑی کہ نیلو شادی کر رہی ہے۔ نیلو نے لارڈز میں ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔ میں اپنی چائے کی میز سے اٹھا اور پریس کانفرنس میں جا بیٹھا۔ نیلو اپنی اینگلو انڈین قسم کی اردو میں اپنی صفائی پیش کر رہی تھی کہ دوسری شادی کی اس کی کوئی نیت نہیں ہے۔ میں نے نیلو کے اس منفرد طرز بیان کو احتیاط سے گرہ میں باندھا اور اپنے کالم میں پرو دیا۔

دوسرے دن جب میں دفتر پہنچا تو عنایت صاحب جیسے میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فوراً دبوچ لیا۔ کہا کہ ''آپ پر جرمانہ ہو گیا' دس روپے دیجئے' مٹھائی آئے گی۔''

میں ہکا بکا۔ کیسا جرمانہ' مٹھائی کس خوشی میں۔ جب مٹھائی آ گئی تو عنایت صاحب نے اعلان کیا کہ لاہور نامہ آج بھائی دروازے کے تھڑوں میں پہنچ گیا۔ انتظار صاحب کالم نگار پکے ہو گئے۔

بھائی دروازے کے دکاندار سمجھدار نکلے کہ اس کالم کو کالم سمجھ کر ہی پڑھا۔ گرلز کالجوں کی استانیوں اور لڑکیوں سے مجھے دادیوں ملی جیسے میں ادبی شہ پارے لکھ رہا ہوں۔ جب بھی کسی ان کی تقریب میں جانا ہوا میں نے صفائی پیش کی کہ یہ ادب نہیں صحافت ہے۔ اب اگر آگے چل کر یاروں نے کالم نگاری کو ایک ادبی صنف قرار دے دیا تو یہ ان کا اپنا کارنامہ ہے۔

''مشرق'' نے بعد میں تو خیر اپنی شاندار عمارت کھڑی کر لی اور پھر یہی عمارت اس کا مدفن بنی۔ مگر جن دنوں مشرق سچ مچ ایک اخبار تھا' ان دنوں نسبت روڈ پر کرائے کی ایک مختصر عمارت میں شاد آباد تھا' جہاں جگہ تنگ ہونے کی وجہ سے ہم کھچ کھچ ہو کے بیٹھتے تھے۔ اسی دفتر کے عین سامنے ایک پتلی گلی تھی جہاں ایک چھوٹا سا مطب تھا کہ مطب بھی تھا اور یاروں کی بیٹھک بھی۔

یہ حکیم حبیب اشعر کا مطب تھا۔ ''مشرق'' کے دفتر میں کسی کو بھول چوک میں چھینک بھی آ جاتی تو دوڑا ہوا مطب جاتا اور چائے پی کر اور دوا لے کر واپس آتا۔ چھینک نہ بھی آتی بس خبروں سے نبٹتے ہوئے طبیعت بور ہو جاتی تو قلم رکھا اور سیدھا مطب کی طرف۔ حکیم صاحب کی جمنا میں دھلی ہوئی اردو سنی' چائے پی اور ہشاش بشاش واپس آ کر پھر کام میں جت گئے۔ میرا وقت ''مشرق'' کے دفتر میں کم اور مطب میں زیادہ گزرتا۔ مطب میں یاروں اور بیماروں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ بیمار تو آٹے میں نمک ہی کی نسبت سے ہوتے تھے۔ مگر یاروں میں اتنے گڈمڈ ہو جاتے کہ ان کی الگ شناخت مشکل ہو جاتی۔ یار وہ بیمار تھے جو شفایاب ہو چکے تھے' مگر اب یہ بھول گئے تھے کہ وہ یہاں بیمار کی حیثیت سے آئے تھے۔ جو نیا مریض آتا وہ سخت پریشان ہوتا کہ یہاں تو حالات حاضرہ پہ بحث ہو

رہی ہے' وہ حکیم صاحب کو نبض کیسے دکھائے اور حال اپنا کیسے سنائے۔ چند دنوں میں وہ اس فضا سے مانوس ہو جاتا۔ آتے ہی بحث میں کود پڑتا' چائے پیتا' دیر بعد اسے یاد آتا کہ اسے حکیم صاحب کو اپنا حال بتانا ہے اور نئی دوا لینی ہے۔

حکیم صاحب مریض کو چار دن مریض سمجھتے۔ پانچویں دن وہ ان کا یار عزیز ہوتا۔ پھر دوا کی قیمت لینی بند کر دیتے۔ سارا علاج مفت۔ چائے کی دور مستزاد۔ بھلا ایسے مطب چلا کرتے ہیں۔ سو حکیم حبیب اشعر کو میں نے آسودہ حال کبھی نہیں دیکھا۔ مگر مالی حالات جو بھی ہوں مجال ہے کہ وضع میں فرق آ جائے اور یاروں کو خمیروں جوارشوں سے نوازنے میں کوئی کمی آ جائے۔ وقتاً فوقتاً علماء و محققین بھی اس مطب میں آتے جاتے دیکھے جاتے تھے۔ آخر اس شعبہ سے بھی تو حکیم صاحب کا ایک رشتہ چلا آتا تھا۔ غالب کے جشن سو سالہ کا جب چرچا ہوا تو اس تقریب سے بعض محققین کو میں نے اس مطب کے پھیرے لگاتے دیکھا۔ پروفسر وزیر الحسن عابدی جب یہاں پہلی مرتبہ نمودار ہوئے تو میں سمجھا تھا کہ طبیعت ناساز ہوگی' دوا لینے آئے ہیں مگر پھر میں نے یہ نقشہ دیکھا کہ روز صبح وارد ہوتے ہیں۔ اعلان تاشقند' ایوب خان' اسلامی سوشلزم' شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکات' موضوع کوئی بھی ہوتا' بحث کتنی بھی گرم ہوتی' عابدی صاحب بے تعلق گم متھان بیٹھے ہیں۔ موقع ملنے پر اشعر صاحب سے کھسر پھسر کرتے اور چلے جاتے۔ مجھے کرید ہوئی کہ عابدی صاحب کیا لینے آتے ہیں۔ نبض تو دکھاتے نہیں نہ دوا لے کر جاتے ہیں۔ میں نے اشعر صاحب سے پوچھا۔ پتا چلا کہ انہیں کہیں سے سن گن ملی ہے کہ غالب کا کوئی مخطوطہ اس شہر میں کسی دلی والے کے پاس موجود ہے۔ اب گلی محلوں میں اس دلی والے کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ اشعر صاحب سے اس شہر میں آ کر آباد ہونے والے اہل دلی کا اتا پتا معلوم کرتے ہیں اور پھر ان کے کھوج میں نکل جاتے ہیں اور ہاں اس کھوج کے بیچ انہوں نے لگے ہاتھوں غالب کی ٹوپی پر بھی تحقیق کر ڈالی۔

عابدی صاحب تحقیق کے مراحل سے ساری کٹھنائیوں کے باوصف آسان گزر گئے۔ مشکل انہیں اس وقت پیش آئی جب انہیں بحالت روزہ غالب پر گفتگو کرنی پڑی۔ غالب صدی کی تقاریب رمضان کے عین بیچ شروع ہوئیں۔ ایک تقریب میں میں نے دیکھا کہ عابدی صاحب غالب پر تقریر کر رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں مختلف شعروں کے مضمون کا حوالہ دیتے ہیں مگر شعر نہیں پڑھتے۔ کیا انہیں غالب کے شعر یاد نہیں تھے۔ نہیں' آخر انہوں نے معذرت کی اور کہا کہ افسوس ہے کہ میں اس وقت غالب کے شعر پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میں روزے سے ہوں۔

یاروں کو یہ عذر عجب لگا۔ بہر حال میں نے بوجھ لیا۔ مجھے اپنے والد صاحب یاد آ گئے جو رمضان میں شاعری سے گریز کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ روزے میں شعر پڑھا جائے تو روزہ مکروہ ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ بتاتے تھے کہ شعر میں مبالغہ ہوتا ہے اور مبالغہ

بھی بمنزلہ جھوٹ کے ہے۔

عابدی صاحب دین دار پرہیز گار آدمی' ساتھ میں رند شاہد باز غالب کے پرستار۔ مگر کیا توازن قائم کیا تھا کہ نہ اپنی دینداری' پرہیز گاری پہ آنچ آنے دی نہ غالب پر تحقیق میں کوتاہی کی۔

غالب کے سوسالہ جشن کا حوالہ آیا ہے تو مجھے پروفیسر حمید احمد خاں یاد آ رہے ہیں۔ کیا خوب بزرگ تھے۔ وقت کے ایسے پابند کہ جو وقت مقرر ہے اس پر آئیں گے اور اس سے ایک منٹ پہلے نہ ایک منٹ بعد۔ تقریب میں صدارت کرنے یا مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو ہوتے تو منتظمین کے لیے مسئلہ بن جاتے۔ باون تولے پاؤ رتی صحیح وقت پر ہال میں قدم رکھتے۔ بیٹھتے ہی گھڑی دیکھتے۔ جلسہ شروع ہونے میں ایک ڈیڑھ منٹ کی بھی تاخیر ہوتی تو واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ حلقہ ارباب ذوق کے ایک ہفتہ وار جلسہ میں صدارت ے لیے مدعو تھے۔ ٹھیک چار بجے جو جلسہ کا اعلان کردہ وقت تھا بورڈ روم میں داخل ہوئے۔ بورڈ روم خالی تھا۔ جوائنٹ سیکرٹری صاحب کرسیاں درست کر رہے تھے' میز کی صفائی کر رہے تھے۔ خاں صاحب نے خالی کرسیوں پر نظر ڈالی۔ برہمی سے بولے "جلسہ کا وقت تو ہو گیا ہے اور یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔" جوائنٹ سیکرٹری نے ان سے اجازت لی۔ دوڑا ہوائی ہاؤس گیا اور قیوم نظر کو ان کی آمد کی اطلاع دی۔ چائے پیتے ادیبوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ قیوم صاحب سرپٹ دوڑے اور ہانپتے ہانپتے بورڈ روم میں داخل ہوئے۔ خاں صاحب نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی' خشمگیں نظروں سے قیوم نظر کو دیکھا۔ بولے "قیوم صاحب' اب چار بج کر تین منٹ ہو رہے ہیں۔ یہاں جلسہ شروع ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ مجھے اجازت دیجئے۔"

قیوم صاحب نے تو تھمبو کر کے انہیں صدارت کی کرسی پر بٹھایا۔ جلسہ فوراً ہی شروع کر دیا۔ حاضرین بعد میں آتے رہے۔

خاں صاحب سخت اصول پرست۔ ضابطہ سے ذرا سا انحراف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ زود حسی اس پر مستزاد۔ مزاج کے خلاف ذرا کوئی بات ہو جائے بکھر جاتے تھے۔ پاکستان کے محب ایسے کہ پاکستان کے حالات پر کوئی تنقید کر دے تو اسے پاکستان دشمنی پر محمول کرتے تھے۔ میں نے حلقہ میں اپنا افسانہ بن لکھی رزمیہ' انہی کی صدارت میں پڑھا تھا۔ سن کر ایسے برہم ہوئے کہ افسانے کی ہندی کی چندی کر دی۔ بعد میں ایک دوست سے پوچھا کہ یہ نوجوان انتظار حسین کیا کمیونسٹ ہے۔ اس نے کہا کہ اینٹی کیونسٹ ہے' مگر انہوں نے اس بیان پر اعتبار نہیں کیا۔

پھر میرا ایک کالم ان کی ناراضگی کا سبب بنا۔ انہی دنوں لندن سے واپس آئے تھے۔ حلقہ میں ایک مقالہ پڑھا جس میں "بانگ درا" کی بعض نظموں پر بحث تھی۔ بتایا تھا کہ کون سی نظم انگلستان کے کس شاعر سے ماخوذ ہے۔ میں "آفاق" میں کالم لکھا کرتا تھا۔

ڈرتے ڈرتے لکھا کہ یہ تحقیق تو لاہور میں بیٹھ کر بھی ہو سکتی تھی۔ لندن جانا کیا ضرور تھا۔

یہ کالم شاید آیا گیا ہو جاتا' مگر ہوا یوں کہ حسرت صاحب کی نظروں سے کہیں یہ کالم گزرا۔ حسرت صاحب پہلے ہی کتنے ترقی پسند شاعروں سے محض اس بنا پر کدر کھتے تھے کہ وہ اقبال کا خاطر خواہ احترام نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے حمید احمد خاں پر بھی طنز و تعریض کر ڈالی۔ اس پر لے دے شروع ہو گئی۔ ''چٹان'' میں کہیں یہ فقرہ لکھا گیا کہ مولانا کو دیکھو بزرگ ہو کر ایک لڑکے کے بھرے میں آ گئے اور پروفیسر حمید احمد خاں کے خلاف کالم باندھ دیا۔ یہ فقرہ حسرت صاحب پر بھاری پڑا۔ اس شام ان کا تانگہ کافی ہاؤس جاتے جاتے ٹی ہاؤس کی طرف مڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ حسرت صاحب ٹی ہاؤس میں داخل ہوئے ہیں۔ دروازے ہی سے رعب دار آواز میں مجھے پکارا ''مولانا ذرا یہاں آیئے۔''

میں دوڑ کر پہنچا۔ مولانا غصے میں تھے۔

''مولانا' میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ شورش کہتا ہے کہ میں نے تمہارے کالم سے متاثر ہو کر حمید احمد خاں کے خلاف کالم لکھا ہے۔''

میں نے شورش کاشمیری کے خلاف جو کہہ سکتا تھا کہہ ڈالا۔ مولانا خوش ہو گئے۔ پھر میں کافی ہاؤس تک ان کے ساتھ گیا۔ ہاں ''آفاق'' دوبارہ انہی دنوں شروع ہوا تھا۔ اب مولانا غلام رسول مہر اس کے ایڈیٹر تھے اور میر نور احمد مینجنگ ایڈیٹر۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا ''مولانا' یہ سنا جا رہا ہے کہ آپ ''آفاق'' میں آ رہے ہیں۔''

پھر برہم ہو گئے۔ ''مولانا کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ جو غلام رسول ہے' میں اس کے ساتھ کام کروں گا اور وہ نور احمد' اسے صحافت کا کیا پتا۔''

خیر ذکر حمید احمد خاں صاحب کا تھا۔ انہیں اب مجھ سے ناراض ہونا ہی تھا۔ آفتاب احمد خاں نے مجھے بہت شرم دلائی کہ تمہیں خاں صاحب کے علمی مرتبے کا احساس نہیں۔ اور پھر وہ ہمارے بزرگ ہیں۔ تم نے انہیں ناراض کر دیا۔ ان کے ساتھ جا کر میں نے ان کی خدمت میں مناسب لفظوں میں معذرت بھی کر لی۔ وقتی طور پر شاید تھوڑا نرم بھی پڑ گئے تھے' مگر دل میں جو گرہ پڑ گئی تھی وہ نہیں نکلی۔ جب بھی کسی محفل میں مڈھ بھیڑ ہوئی یہی دیکھا کہ تیوری چڑھی ہوئی ہے۔ بات کی تو روکھے پن سے۔ آدمی کم دماغ تھے۔ میں نے بھی ان سے دور دور رہنے ہی میں عافیت جانی۔

پھر جب خوش ہونے پر آئے تو ایسے خوش ہوئے کہ حلقہ کے جلسہ سے شروع ہوئے اور پھر ٹی ہاؤس میں چائے کی میز تک مجھے شاباسی دیتے چلے گئے۔ بس ایک مضمون سے میں نے ان کا دل جیت لیا۔ یوم میراجی کا جلسہ تھا۔ خاں صاحب صدارت کر رہے

تھے۔ مضامین پڑھنے والوں میں میں بھی تھا۔ میرے مضمون پر انہوں نے جی کھول کر داد دی۔ اسی حلقہ میں انہوں نے میرے افسانے کی ہندی کی چندی کی تھی۔ اسی حلقہ میں انہوں نے داد دے دے کر مجھے نہال کر دیا۔ پھر یہ سلسلہ آگے بھی چلا۔

تو اب حمید احمد خاں مجھ سے خوش تھے۔ پچھلے سارے گناہ معاف ہو چکے تھے۔ تو جب شہر میں موجود منتخب ماہرین غالب کو انہوں نے اپنے دفتر میں چائے پر مدعو کیا تھا تو ساتھ میں مجھے بھی یاد کر لیا۔ اس وقت خاں صاحب پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے عہدے پر فائز تھے۔ بھرے بیٹھے تھے۔ غالب کے سلسلہ میں حکومت سے اپنی خط و کتابت کا احوال سنایا۔ بتانے لگے کہ میں نے حکومت پاکستان کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ غالب کا صد سالہ جشن قومی سطح پر منانے کا اہتمام کیا جائے۔ وزارت تعلیم کی طرف سے استفسار کیا گیا کہ جس شاعر کے سلسلہ میں آپ نے یہ تجویز پیش کی ہے اس کے متعلق بتایا جائے کہ اس نے کتنا کام کیا ہے اور اس کی کتنی تصانیف ہیں۔ میں نے یہ فریضہ بھی ادا کر دیا۔ ادھر سے جواب آیا کہ اس شاعر کا اتنا کام تو نظر نہیں آتا کہ اس کا جشن قومی سطح پر منایا جائے۔

شہر میں غالب کی آبرو کا یہ احوال سنانے کے بعد کہا کہ میں نے سوچا ہے کہ یونیورسٹی کے محدود وسائل جس حد تک اجازت دیتے ہیں اس حد تک ہم ہی اس جشن کا اہتمام کریں۔ سو ایک مجلس یادگار غالب وجود میں آ گئی۔ طے ہوا کہ غالب کی ساری نظم و نثر نئے سرے سے مرتب کر کے اس موقع پر شائع کی جائے۔ محققوں کی طرف سے پیش کش ہوئی کہ یونیورسٹی کے محدود ذرائع کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ اس کام کا معاوضہ طلب نہیں کریں گے۔

لیجیے محقق حضرات اپنے کام میں جت گئے۔ اور عابدی صاحب گمشدہ مخطوطہ کی تلاش میں لاہور کے گلی محلوں کی خاک چھاننے لگے۔ منصوبے نے خوش اسلوبی سے مراحل طے کیے۔ تحقیق و ترتیب اور تدوین کے مرحلوں سے گزر کر منصوبہ کتابت اور طباعت کے مراحل میں داخل ہوا، مگر عین وقت پر کریال میں غلہ لگا۔ طباعت کے عین بیچ رنگ فلک بدلا۔ ملک میں ایوب خاں کے خلاف تحریک زور پکڑ گئی۔ یونیورسٹی ہنگاموں اور ہڑتالوں کی زد میں آ گئی۔ حمید احمد خاں حکومت کے معتوب ٹھہرے۔ پنجاب کے گورنر سابق جنرل موسیٰ خاں نے گورنری سے فراغت حاصل کرتے کرتے اپنی جرنیلی دکھائی اور خاں صاحب کو اچانک وائس چانسلری سے فارغ کر دیا۔ مجلس یادگار غالب یتیم ہو گئی۔ نئے وائس چانسلر علامہ علاء الدین صدیقی کے لیے تو وہ سوتیلی تھی۔ انہوں نے غالب کے طرف داروں کے استفسار پر کورا جواب دے دیا کہ یونیورسٹی کے حالات جشن غالب کے لیے سازگار نہیں۔ سو اس خیال سے منہ دھولو۔

اور اب مجلس کی آخری میٹنگ یاد آ رہی ہے۔ رجسٹرار صاحب زیب محفل تھے اور بتا رہے تھے کہ مجلس کی مرتبہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ فرمانے لگے کہ اہل مجلس اپنا کام کر چکے ہیں باقی ہمارا کام ہے۔ ہم سوچیں گے کہ مرتبین و محققین کو ان کی ترتیب دی ہوئی کتاب

کی کتنی جلدی عطا کی جائیں۔

اراکین مجلس نے رجسٹرار صاحب کے تیور دیکھے اور سوچا کہ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی بھلی۔ اس وقت جو ملتا ہے وہ لے لو۔ سو مطبوعات غالب کا ایک ایک سیٹ بغل میں دابا اور باہر نکل آئے۔ مجلس یادگار غالب کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ کیسا جشن غالب، کیسی غالب مطبوعات کی افتتاحی تقریب، یہ سارا نبار یونیورسٹی کے گودام میں پہنچا دیا گیا۔

◆◆◆

تاشقند سے پہلے، تاشقند کے بعد

''اگر افریقہ کے کسی کونے میں کسی حبشی پر کوئی ظلم ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر آتی ہے۔'' یہ بات کسی بھلی گھڑی میں سارتر نے لکھی تھی اور ٹی ہاؤس کی میز پر اس وقت سارتر زیر بحث تھا۔ ہمارے بیچ بیٹھے ایک دوست نے ٹکرا لگایا ''تو پھر کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری سے سارتر کیسے بچ سکتا ہے؟''

دوسرے دوست نے اس سے شہ پائی اور بولا ''اگر پاکستان کے ادیب یوم الجزائر منا سکتے ہیں تو یوم کشمیر کیوں نہیں منا سکتے۔''

اور یہ 1965ء کے دن تھے۔ مئی کا بیچ تھا۔ موسم گرم ہو چلا تھا اور برصغیر کی فضا میں ایک درہمی تھی۔ اس فضا میں اس گفتگو نے اپنا اثر دکھایا۔ دوسرے تیسرے دن ہی ٹی ہاؤس کی بالائی منزل میں چند ادیب سر جوڑ کر بیٹھے۔ ان بزرگوں کا دھیان آیا' جنہوں نے یوم الجزائر میں سرگرمی دکھائی تھی۔ خیر فیض صاحب تو شہر ہی میں نہیں تھے۔ اب وہ کراچی جا بسے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ سید امتیاز علی تاج کو یاد کیا گیا۔ وہ آن موجود ہوئے۔ ان کی سرکردگی میں ایک چھوٹی سی مشاورتی کمیٹی بن گئی جو بعد میں پھیلتی چلی گئی۔ نعیم طاہر نے جو ان دنوں آرٹ کونسل کے سیکرٹری تھے' پیشکش ہوئی کہ ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر آپ کیا کریں گے' اس کام کے لیے آرٹ کونسل حاضر ہے۔ آرٹ کونسل میں جو میٹنگ ہوئی' اس میں اعجاز حسین بٹالوی' تجمل حسین اور خالد حسن نے بھی شرکت کی اور اب تجمل حسین نے پیش کش کی کہ ٹی ہاؤس ہی کی بغل میں تھنکرز فورم کا دفتر ہے۔ وہ جگہ اس کام کے لیے حاضر ہے۔ بس پھر تھنکرز فورم کا دفتر ہی اس کمیٹی کا دفتر بن گیا۔

آرٹ کونسل کی میٹنگ کی تصویر اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں اعجاز بٹالوی' تجمل حسین' خالد حسن' سعید محمود اور انجم رومانی کے چہرے مجھے نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ ایک چہرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تاج صاحب اور نعیم طاہر تو تھے ہی' مگر اس تصویر میں نظر آ رہے۔ شاید کئی ایک اور بھی تھے۔ وہ بھی کیمرے کی زد سے باہر رہے۔ اس کمیٹی نے آگے کیا کیا' اس کی کچھ تفصیل جو مجھے یاد نہیں تھی اپنے ایک کالم میں نظر آ رہی ہے جو 13 جون 1965ء کے مشرق میں شائع ہوا۔

''اور اس سے دو دن پہلے کچھ ادیب سر جوڑ کر بیٹھے۔ یہ کوئی بڑا اجتماع نہیں تھا' مگر ادیبوں کی نسل اور ہر مکتبہ فکر کے ایک ایک دو آدمی موجود تھے۔ یہاں ڈاکٹر سید عبداللہ اور سید امتیاز علی تاج تھے۔ میاں بشیر احمد کراچی جاتے جاتے یہاں زیر بحث آنے والی

تجویز کو اشیر واد دے گئے تھے۔ احمد ندیم قاسمی تھے۔ قتیل شفائی تھے۔ پھر ایک نسل ناصر کاظمی کی اور ایک نئی نسل افتخار جالب کی۔

''طے ہوا کہ لاہور کے ادیبوں' فنکاروں اور دانشوروں کو جمع کرو اور کشمیر کے نام پر افریقہ اور ایشیا کے ضمیر کو خطاب کرو۔ یورپ کے ضمیر کو پکارو۔ اور پاکستان کے دوسرے شہروں کے ادیبوں سے کہو کہ وہ بھی اکٹھے ہوں اور بے زبان کشمیر کی زبان بنیں۔

''ایک خط سارتر کو' ایک خط برٹرنڈ رسل کو' ایک اپیل بھارت کے ادیبوں سے' ایک محضر نامہ افریقہ اور ایشیا کے ادیبوں کی خدمت میں' اور ایک محضر نامہ الجزائر میں افریشیائی کانفرنس کرنے والوں کی خدمت میں۔''

مجھے دو خط یاد ہیں۔ ایک سارتر اور رسل کے نام' دوسرا کرشن چندر کے نام۔ اکیلے کرشن چند کے نام یہ سوچ کر کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ ایک کرشن چندر کو خطاب کیا۔ تو گویا ہندوستان کے سارے ادیبوں سے کلام ہو گیا۔ اس جلسے میں نہ نعرے لگے' نہ جذباتی تقریریں ہوئیں' معاملہ کی باتیں سنجیدگی کے ساتھ ہوئیں۔ مذکورہ خط پڑھ کر سنائے گئے۔ مگر ان خطوط کے ساتھ ہوا کیا۔ جلسہ تو بہت اہتمام سے ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی کا سینٹ ہال بھرا ہوا تھا۔ شہر کے کم و بیش سارے ہی ادیب اور دانشور اکٹھے تھے۔ صدارت کی کرسیوں پر تین شخصیتیں رونق افروز تھیں۔ سید امتیاز علی تاج' ڈاکٹر سید عبداللہ' احمد ندیم قاسمی' خطوں پر' محضر نامے پر سب نے دستخط کئے۔ سارے مراحل طے ہو گئے۔ مگر بعد میں جب ٹٹولا تو اصلیں غائب۔ ہاں میری حیثیت سیکرٹری کی تھی۔ میں نے بہت پوچھ گچھ کی۔ تھنکرز فورم کے دفتر والوں کو ٹٹولا۔ بھید نہ کھلا کہ ہوا کیا۔ اعجاز بٹالوی کے مشورے سے پھر یہی ٹھہری کہ نقلوں پر گزارہ کیا جائے اور جنہیں بھیجنا ہے وہی بذریعہ ڈاک روانہ کر دی جائیں۔

اس تجربے سے میں نے یہ جانا کہ جس کا کام اسی کو ساجھے۔ اگر ادیب جلسے جلوس کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو پھر اسے اس دنیا کے بھید بھاؤ کا پتا ہونا چاہیے۔ نہیں تو اپنی کھال میں رہے اور بس لکھنے لکھانے سے غرض رکھے۔ جو سوچا سمجھا ہے اس کا حق حساب قلم ہی سے کرے۔

اے لو یہ تو فضا اور کشیدہ ہو گئی۔ اور پھر کشیدہ ہوتی ہی چلی گئی۔ ستمبر کے آتے آتے سچ مچ جنگ کے بادل سر پہ منڈلانے لگے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیچ تناتنی کب نہیں ہوئی تھی' مگر ہر بار یہی ہوا کہ کچھ ادھر سے دھمکیاں کچھ ادھر سے۔ ادھر سے بندوقیں سیدھی ہو گئیں۔ ادھر سے مکا دکھایا گیا۔ سر سے پانی اونچا ہونے لگتا تو تھوڑی عقل آ جاتی اور بیچ بچاؤ ہو جاتا۔ مجھ جیسے سادہ دل سمجھ رہے تھے کہ اب کے بھی ایسا ہی ہو گا' مگر اب کے تو پانی واقعی سر سے اونچا ہو گیا۔

وہ 6 ستمبر کی صبح تھی۔ روز کی طرح چڑھی تھی۔ روز کی طرح میں گھر سے نکلا۔ آرام سے دفتر پہنچا' مگر اندر قدم رکھا اور ادھر ایسی بجلی

کڑکی کہ دفتر کے در و دیوار ہل گئے۔ یا اللہ یہ کون سی قیامت آئی۔ بس فوراً ہی کریڈ پہ خبر آئی کہ جنگ شروع ہوگئی۔ ہندوستان کی فوجیں لاہور شہر کے در پہ دستک دے رہی ہیں۔ یا الٰہی خیر۔ اخبار کا دفتر ویسے ہی حساس ہوتا ہے' کھلبلی مچ گئی۔ ٹیلی فون کھڑکھڑانے لگے۔ کریڈ کی مشین تیز تیز چلنے لگی۔

مجھے دفتر میں اپنا مصرف نظر نہ آیا تو نکل کھڑا ہوا کہ باہر چل کر دیکھیں کہ کیا احوال ہے۔ سیدھا ٹی ہاؤس پہنچا۔ ٹی ہاؤس خالی پڑا تھا یا یہ بجلی سی جو کڑکی تھی اس کی دہشت سے خالی ہوگیا۔ ہاں بجلی کی یہ کڑک پاکستان کے اس جنگی جہاز کا کرشمہ تھا جو ساؤنڈ بیریئر توڑ کر میدان جنگ کی طرف لپکا تھا۔

میں ٹی ہاؤس کے باہر کھڑا سراسیمہ مخلوق کو دیکھ رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے شیخ صلاح الدین دفتر سے نکل سائیکل پہ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ کتنے برسوں بعد مجھے آج کی تاریخی صبح شیخ صاحب کی صورت دکھائی دی تھی۔ میں نے پکار کر کہا کہ ''شیخ صاحب' جنگ شروع ہو چکی ہے' آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

سائیکل کو آہستہ کیا' کہا کہ ''گھر جا رہا ہوں۔''

میں نے کہا کہ ''شیخ صاحب' آپ کمال کرتے ہیں' آپ ایسے وقت میں گھر جا رہے ہیں۔''

شیخ صاحب سائیکل سے اترے۔ قریب آئے ''پھر کیا کریں؟''

میں نے کہا کہ ایسا کیجئے کہ سائیکل یہاں ٹی ہاؤس کے سٹینڈ پر کھڑی کیجئے۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھئے' چل کے ناصر کو ریڈیو سے نکالتے ہیں۔ پھر کہیں بیٹھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ کیا ہوا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔''

شیخ صاحب نے یہی کیا۔ لو آج ہم بھلا ریڈیو سٹیشن کے اندر قدم رکھ سکتے تھے۔ گیٹ بند تھا۔ مسلح پہریدار مستعد کھڑے تھے۔ اب کیا کریں۔ میں نے گیٹ کے برابر بیٹھے پنواڑی سے پوچھا کہ ناصر صاحب کا پھیرا ہوگیا۔''

''نہیں جی ابھی پھیرا نہیں ہوا۔ ان کا وقت ہوگیا ہے۔ آتے ہی ہوں گے۔''

اس نے ٹھیک کہا تھا۔ اسی آن ناصر اندر سے نمودار ہوا۔ میں نے کہا کہ ''ریڈیو میں بیٹھے کیا کر رہے ہو' نکلو شیخ صاحب گاڑی میں بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

''مگر آج تو ریڈیو میں بہت کام ہے۔''

''ہاں آج تو بہت کام ہونا چاہیے' مگر تم اس کام میں کیا ہاتھ بٹاؤ گے۔''

سوچ کر بولا۔ ''اچھا ابھی آتا ہوں۔''

ناصر گیا اور آیا۔ پھر ہم نے چل کر اپنے پرانے اڈے لارڈز میں جا کر چھاؤنی چھائی۔ ادھر چائے کے آتے آتے شیخ صاحب نے جانے کیا پینترا بدلا کہ جنگ کے ذکر سے فلسفہ کی بحث پر آ گئے۔ کمال سادگی سے وقت کے فلسفہ کی بحث کو وہیں سے پکڑا جہاں انہوں نے اب سے کئی برس پہلے سویرا کے دفتر میں اگلے دن کے لیے ملتوی کیا تھا اور جاری ہو گئے۔ میں بھی آج کتنے برس کے بعد ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ سو میں تازہ دم تھا۔ یکسو ہو بیٹھا۔ بیچ بیچ میں ہمارا کوئی شناسا بیرا آ کر تھوڑی کھنڈت ڈالتا۔ بتاتا کہ سائرن ہو گیا ہے۔ ہوائی حملہ ہونے والا ہے۔ شیخ صاحب طوعاً و کرہاً دم بھر کے لیے چپ ہوتے۔ ادھر وہ رخصت ہوا اور ادھر یہ پھر جاری۔ چائے پی' کھانا کھایا' پھر شور پڑا کہ ایوب خاں کی تقریر ہونے لگی ہے۔ شیخ صاحب ایوب خاں کے یوں بھی بہت قائل تھے اور اس وقت تو ہم سب ہی منتظر تھے کہ دیکھیں کہ جنرل اس نازک گھڑی میں کیا اعلان کرتا ہے۔ سو سب کی طرح ہم تینوں نے بھی یہ تاریخی تقریر پوری توجہ سے سنی۔ میں سمجھا کہ شیخ صاحب بس اب تھم گئے ہیں۔ مگر انہوں نے تقریر پہ مختصر سا تبصرہ کیا۔ یعنی اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور پھر اپنے موضوع پر آ گئے۔

شام ہوتے ہوتے بیرے نے لپک جھپک بل پیش کیا۔ کہا کہ ''جلدی کرو جی' آج بلیک آؤٹ ہے۔ ہوٹل بند ہونے لگا ہے۔''

میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''شیخ صاحب میری گاڑی بہت بے اعتباری ہے۔ رستے میں رک کر کھڑی ہو گئی تو میں کیا کروں گا۔''

''نہیں کھڑی ہو گی۔'' شیخ صاحب نے پہنچے ہوئے فقیروں والی شان سے کہا۔

خیر میں نے پہلے شیخ صاحب کو ٹی ہاؤس پہ چھوڑا۔ پھر ناصر کو ٹولنٹن کے نکڑ پہ۔ وہاں سے پلٹا۔ اب اندھیرا ہو چلا تھا اور اعلان ہو رہا تھا کہ کوئی گاڑی والا لائٹ نہ جلائے۔ کوئی لائٹ جلاتا تو پولیس والے بعد میں ٹوکتے' پہلے دائیں بائیں آگے پیچھے تیز تیز چلنے والے لعنت ملامت کرتے۔ شور مچاتے کہ ''کیا ہمیں مروانا ہے۔''

دوسرے دن کی سنو۔ دفتر میں قدم رکھا تو پتا چلا کہ جنگ کا فوری اثر یہ ہوا ہے کہ کاغذ کمیاب ہے۔ سو اب اخبار کے صفحات کم ہو گئے ہیں۔ ادھر جنگ کی خبروں کا وفور ہیں سو ''لاہور نامہ'' کے لیے فی الحال صفحوں میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

''گویا اب اخبار میں میرا کوئی کام نہیں ہے۔''

''کام کیسے نہیں ہے۔'' ہمارے منیجنگ اڈیٹر عنایت اللہ بولے ''جنگ میں لکھنا بعد میں ہوتا ہے پہلے تو دیکھنا اور مشاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ تو دفتر سے نکلو۔ گھومو پھرو دیکھو کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ دو بیبیاں تمہارے سپرد ہیں۔ انہیں بھی ساتھ لے جاؤ۔ یہ بھی تو دیکھیں

کہ یہ شہر جنگ کو کیسے بھگت رہا ہے۔"

یہ دو بیبیاں تھیں، مسرت جبیں اور فریدہ حفیظ۔ ہاں مجھے یہ بھی تو بتانا چاہیے کہ "مشرق" کی معرفت عورت کو پہلی مرتبہ اردو صحافت میں داخلہ ملا تھا اور بڑی دھوم کے ساتھ داخلہ ملا تھا۔ مسرت جبیں کا کالم تھا تو عورتوں کے لیے مگر مردوں کی دنیا میں سو پر ہٹ جا رہا تھا۔ ویسے عورتیں پہلے تو اخبار واجبی واجبی پڑھتی تھیں۔ "مشرق" گھریلو عورتوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے کالجوں میں بھی بے تحاشا مقبول تھا۔ اس کے مختلف فیچروں اور کالموں کو دیکھتے دیکھتے قبول عام کی سند مل گئی۔ ریاض بٹالوی نے اپنے فیچروں میں ایک نیا طور نکالا تھا۔ بھیس بدل کر مختلف اداروں میں پہنچتے، کبھی مریض بن کر ہسپتال میں، کبھی ملزم بن کر تھانے میں اور ان اداروں کا کچا چٹھا فیچر میں پیش کرتے۔ ایک مرتبہ یہ حضرت اپنی دانست میں گم ہو گئے۔ مشرق میں اعلان ہو گیا کہ جو ان کا پتا لگائے گا انعام پائے گا۔ ادھر سینٹ ہال میں یوم محمد حسین آزاد منایا جا رہا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد تقریر کر رہے تھے۔ انہیں اس جلسہ میں نبیرہ آزاد محمد باقر کی کمی محسوس ہو رہی تھی جو ابھی پچھلے دنوں اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ کہنے لگے "یہاں ایک شخص نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ آج ہمارے بیچ میں سے گم ہے۔"

اخلاق احمد دہلوی کی بغل میں بیٹھا ہوا ان کا ننھا صاحبزادہ برجستہ بولا "ریاض بٹالوی۔" اور محفل زعفران زار بن گئی۔

ہاں تو ایک تھیں مسرت جبیں اور دوسری فریدہ حفیظ جو انہی دنوں پنجاب یونیورسٹی سے نکل کر مشرق میں پہنچی تھیں۔ مجھے ویسے بھی اپنے کالم کے واسطے سے شہر میں خاک پھانکنے کا چسکا لگ چکا تھا۔ جنگ اس پر مستزاد۔ پھر اس وقت ساتھی بھی اچھے مل گئے تھے۔ بس فوراً ہی انہیں ساتھ لے کر میں نکل کھڑا ہوا، مگر سر منڈاتے ہی اولے پڑے اور پھر پڑتے ہی چلے گئے۔ تھوڑا چلے اور ہوائی حملے کا سائرن بجنے لگا۔ پھر چار قدم چلے اور پھر سائرن۔ اس عمل میں یہ ہی طے کرنا بھول گئے کہ جانا کدھر ہے۔

"ارے انتظار صاحب، ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"جہاں اللہ لے جائے گا۔"

"ایسا کرو کہ ماڈل ٹاؤن چلتے ہیں۔" یہ مسرت جبیں کی تجویز تھی۔ ماڈل ٹاؤن میں فرہاد زیدی رہتے تھے۔ ان کے اور مسرت جبیں کے بیچ تعلق خاص تھا۔ میں نے اس تعلق کے احترام میں فوراً ہی گاڑی کا رخ موڑا اور ماڈل ٹاؤن کی راہ پر پڑ لیے۔ اس راہ میں کچھ زیادہ ہی سائرن بجے اور یہ کہ اس سڑک پر دو طرف خندقیں بھی کل اور آج میں کھد گئی تھیں۔ پولیس والے ہدایت کرتے کہ فوراً خندق میں اتر جاؤ۔ ایک خندق میں بیٹھے بیٹھے مسرت جبیں پر عجب کیفیت طاری ہوئی کہ اس نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا۔ ہم

دونوں حیران۔

''ارے یہ تمہیں کیا ہوا۔ بمباری کے خوف سے رو رہی ہو۔''

''اصل میں مجھے اپنے ابو یاد آ رہے ہیں۔ پتا نہیں اس وقت وہ کس حال میں ہوں گے۔''

''مگر ہم تو دفتر میں جا کر یہی بتائیں گے کہ تم بمباری کے خوف سے رونے لگی تھیں۔''

اس بی بی نے اس بدنامی کے خوف سے فوراً ہی آنسو پونچھ لیے۔

خیر تو ماڈل ٹاؤن گئے۔ فرہاد زیدی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ انہیں ساتھ لیا۔ پلٹ کے دفتر آئے۔ ابھی سانس ہی لیا تھا کہ پاکستان کونسل سے طلبی کا فون آ گیا۔ نصیر انور بول رہے تھے' مگر پہلے صفدر میر کا ایک بیان سن لیجئے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ ''تصورات'' میرے سامنے ہے۔ ایک انٹرویو میں بیان دیتے ہیں۔

''لاہور میں ایک بڑا ادبی جلسہ 6 ستمبر 1965ء کو ہو رہا تھا۔ پنجابی مجلس نے بلھے شاہ کی شاعری پر تقریب کی۔ میں صدارت کر رہا تھا۔ تین سو ادیبوں نے شرکت کی۔ انتظار حسین بھی تھا۔ نئی صورت حال میں بلھے شاہ کی شاعری کے بجائے پاک بھارت کی ممکنہ جنگ پر گفتگو ہوئی۔''

غلط۔ ممکنہ کیا' جنگ تو شروع ہو چکی تھی۔ 6 ستمبر کو ایسا کوئی جلسہ نہیں ہوا۔ ہاں اب سنئے کہ ہوا کیا تھا۔ یہ اصل میں 7 ستمبر کی بات ہے۔ تو نصیر انور فون پر بول رہے تھے۔ کہہ رہے تھے ''یار ویسے تو آج بلھے شاہ کے سلسلہ میں تقریب ہوئی تھی' مگر جنگ سے سارے پروگرام ہی بدل گئے۔ اب اس جلسہ کا پروگرام یہ ہے کہ جنگ کے ہنگام ادیبوں کو کیا کرنا چاہیے۔ اس پر گفتگو ہو۔ مگر ہوائی حملہ کا سائرن بار بار بج رہا ہے۔ شہر میں افراتفری ہے۔ ادیب ہاتھ نہیں آ رہے۔ جو دور ہیں وہ تو پہنچ ہی نہیں سکیں گے۔ تم تو قریب ہو۔ تم آ سکتے ہو۔

''بھائی میں تو دور بھی ہوتا تو آ جاتا۔ میں تو صبح سے حرکت میں ہوں۔''

''اگر صفدر میر صدارت کرے اور تم سے بولنے کو کہا جائے تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

''بالکل نہیں۔'' اور لیجئے جنگ کے صدقے ایک دوسرا روٹھا ہوا دوست من گیا۔

اس جلسہ میں گنتی کے لوگ تھے۔ یہی شفقت تنویر مرزا' راجہ رسالو اور چند ایک اور۔ ادیب اصل میں اگلے جلسہ میں جمع ہوئے جو 9 ستمبر کو منعقد ہوا تھا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ گنتی میں نہیں بتا سکتا۔ یہ جلسہ ہنگامہ خیز تھا۔ بہت ہنگامہ اس وقت ہوا جب صفدر میر نے یہ

تجویز پیش کی کہ ایک قرارداد ایوب خاں پر اظہار اعتماد کی منظور کی جائے۔ ایسی قرارداد منظور نہیں ہو سکی۔ اصل میں صفدر میر ایوب خاں کے پہلے ہی بہت مداح چلے آ رہے تھے۔ جنگی حالات میں یہ مداحی دو آتشہ ہو گئی۔ اسی ہنگام انہوں نے جو پہلی جنگی نظم لکھی اس میں بھی اس کا عکس آ گیا

''صدر ایوب کی آنکھ میں خون اتر آیا ہے''

اصل میں تو خون صفدر میر کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔ اس کی نکاسی شاعری کے واسطے سے ہوئی۔ کس تیزی سے اترا اور کس تیزی سے اس کی نکاسی ہوئی۔ جنگ چھڑنے کے بعد جو پہلا اتوار آیا اور حلقہ کا جلسہ ہوا اس میں صفدر میر پہنچے اور اپنی پہلی جنگی نظم ''لاہور کو سلام'' پیش کی۔ اگلی اتوار تک دوسری نظم تیار تھی۔ ''سیالکوٹ کی فصیل'' اور یہ دونوں طویل نظمیں تھیں اور ایسی نظمیں جو خالی جنگی نعرہ نہیں تھیں، شاعری کی مثالیں بھی تھیں۔ اور ان نظموں کے واسطے سے صفدر کا ایک دیرینہ خواب بھی پورا ہو گیا۔ کب سے یہ عزیز یہ تمنا پال رہا تھا کہ اپنی شاعری کے واسطے سے عوام تک پہنچے۔ اپنی انقلابی نظموں کے واسطے سے تو یہ تمنا پوری نہیں ہوئی۔ اب ان نظموں کے واسطے سے پوری ہو گئی۔ نسبت روڈ سے ایک جلوس گزر رہا تھا۔ لاؤڈ سپیکر پر صفدر میر کی آواز گونج رہی تھی۔ میں نے دفتر میں بیٹھے بیٹھے ہی آواز سنی اور لپک کر باہر گیا۔ جلوس کے بیچ ایک ٹرک چل رہا تھا۔ صفدر میر ٹرک پر کھڑا گرج رہا تھا۔

''چلو واہگے کی سرحد پر

وطن پر وقت آیا ہے

وطن پر کٹ کے مر جانے کا یارو وقت آیا ہے''

صفدر کی شاعری کی ہانڈی میں زبردست ابال آیا تھا۔ جنگ کے پہلے ہفتے میں ایک نظم، دوسرے ہفتے میں دوسری نظم۔ اور دونوں جنگی کارناموں کی ٹکر پر شعری کارنامے، مگر پھر جنگ ہی تھم گئی۔ جتنی اس جنگ کی عمر تھی اتنی ہی اس شعری ابال کی عمر نکلی۔

پہلے سیز فائر، پھر اعلان تاشقند۔ صفدر میر کا پھر ایک بیان ''پھر معاہدہ تاشقند کے بعد بھی مسئلہ ہوا۔ اس کی مذمت کے لیے نیا عہد نامہ لکھا گیا۔ وہاں موجود سب ادیبوں نے دستخط کیے۔ انتظار حسین اور جیلانی کامران نے بھی کیے۔ دونوں ٹی ہاؤس میں آئے۔ گھبرا گئے اور اپنا نام کٹوا دیا۔''

پھر غلط۔ میں نے تو کسی ایسے بیان پر دستخط ہی نہیں کیے تھے۔ انکار کر دیا تھا۔ پھر نام کٹوانے کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا۔ ویسے یہ کون سا جلسہ ہے۔ کہاں ہوا تھا۔ اس میں خیر سے کتنے ادیب جمع ہوئے تھے۔ صفدر کی یادداشت بہت گھپلے کرتی ہے۔ اب

میں کہاں تک اس عزیز کی تصحیح کروں۔

ویسے ہمارے ادب میں اعلان تاشقند کے بعد کا زمانہ اخباری بیانات کا زمانہ ہے۔ شاعروں نے غزلیں کم لکھیں' بیانات پر دستخط زیادہ کیے اور افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کے حوالے سے کم اور اپنے بیانات کے ذریعے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ اس زمانے میں شہرت عام اور بقائے دوام کا یہ نسخہ نیا نیا دریافت ہوا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اخباری بیان کی یہ صنف پروان چڑھی اور شعر اور افسانے پر اس نے برتری حاصل کر لی۔ لگتا تھا کہ یہ زمانہ اعلان تاشقند ہی کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ جنگ ستمبر کے ہنگام ہم اپنی فوجی طاقت کے کچھ اس طرح قائل ہوئے تھے کہ اعلان تاشقند دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا عمل نظر آتا تھا۔ بس اس کے ساتھ ہی ایوب خاں کا رعاب شعاب ختم ہو گیا۔ آمریت میں یہی ہوتا ہے کہ جب تک دبدبہ ہے آدمی دم نہیں مار سکتا۔ دبدبہ گیا تو پھر زبانیں ایسی کھلتی ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ تو اب ایوب آمریت ''غازی صدر ایوب کی آنکھ میں خون اتر آیا ہے'' والے پرشکوہ دور سے گزر کر ''ایوب کتا ہائے ہائے'' والے دور میں داخل ہو گئی تھی۔ شیر اب بکری نظر آ رہا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو وزارت سے مستعفی ہو کر سیاست کے میدان میں کود پڑے تھے اور اعلان تاشقند کے راز سے پردہ اٹھانے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ویسے تو سب ہی سیاسی جماعتوں نے حسب توفیق تاشقند سے شہہ پائی اور طاقت پکڑی' مگر سچی بات ہے کہ اس کا سب سے کامیاب استعمال بھٹو صاحب نے کیا۔ یوں ان کی بارہ مسالوں والی سیاست میں ہر مسالے کا اپنا ذائقہ تھا۔ اسلام' سوشلزم' جمہوریت' مگر غالباً سب سے چٹ پٹا مسالہ یہی تھا۔ ان کا ہر جلسہ اس دھمکی پر ختم ہوتا تھا کہ اگلے جلسہ میں اعلان تاشقند کے پیچھے جو سازش ہے اس سے پردہ اٹھاؤں گا اور ہر جلسہ کے اعلان پر ادیبوں کا ٹولہ ٹی ہاؤس سے یہ توقع باندھ کر جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوتا تھا کہ آج راز سے پردہ اٹھے گا' مگر پردہ نہ اب اٹھتا ہے نہ تب اٹھتا ہے۔

اس عمل میں جلسے جلوس تیزی پکڑتے چلے گئے' نعروں نے زور باندھا اور اس کے ساتھ ہی نظریاتی تقسیم ہوتی چلی گئی۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح میں ایک نئی توانائی پیدا ہوئی۔ نئے پرانے اشتراکیوں نے سوچا کہ اسلامی مملکت میں رہنا ہے تو پھر اسلام تو ہو گا' تو چلو اشراکیت کی خاطر تھوڑا اسلام بھی سہی۔ بھلے مسلمانوں نے سوچا کہ خالص اشتراکیت تو تیز دارو تھی۔ اسلام سے اس کا کچھ دف مر جائے گا' کچھ اس کی کڑواہٹ جاتی رہے گی۔ شاید اب یہ دارو مفید رہے گی' تو مختلف گروہوں نے اس نعرے کو مفید جانا اور وہ قبولیت کا درجہ حاصل کرتا چلا گیا' مگر اسلامی جماعت ایسی اڑن گھائیوں میں آنے والی نہیں تھی۔ ان کا موقف تھا کہ اسلام ہو تو خالص ہو۔ بس اس عمل میں ایک نئی اصطلاح ''اسلام پسند'' کی وجود میں آئی۔ تو اسلام پسند ایک طرف' سوشلسٹ دوسری طرف۔ اسلام

پسندوں کے لیے تو سوشلسٹ بھی سوشلسٹ تھے اور اسلامی سوشلسٹ بھی سوشلسٹ ہی تھے۔

بھٹو صاحب کی کرشمہ ساز شخصیت نے ادیبوں' دانشوروں کو لوٹ لیا۔ سو ایسے ادیب بھی جنہوں نے سوشلزم سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رکھا تھا اب اسلامی سوشلزم کا دم بھرتے نظر آ رہے تھے۔ لیکن ادیب اپنی تربیت سے مجبور تھے۔ جلسوں میں جا کر نعرے نہیں لگا سکتے تھے۔ اخباری بیان جلوسوں کی نعرہ بازی کا انہیں بدل نظر آیا۔ بس پھر یہ صنف دنیائے ادب میں فروغ پاتی چلی گئی۔ ہر دوسری تیسری شام کوئی رضا کار دانشور ایک کاغذ اور پنسل لیے ٹی ہاؤس میں نمودار ہوتا۔ ہر میز پر جاتا' وہاں بیٹھے ادیبوں سے تقاضا کرتا کہ بیان پہ دستخط کرو۔ متفق الخیال ادیب جوش ایمانی میں دستخط کرتے' باقی ادیب رعب میں آ کر بے پڑھے کہ کیا بیان ہے دستخط کرتے۔ ادھر میں نے قسم کھا رکھی تھی کہ کسی بیان پہ دستخط نہیں کرنا۔ یاروں کی نظر عنایت سے رجعت پسند تو میں پہلے سے چلا آتا تھا' اب میری رجعت پسندی لاعلاج ہوتی چلی گئی۔ نذیر ناجی نے مساوات میں کالم لکھ لکھ کر میری رجعت پسندی کو اور عالم آشکارا کر دیا۔

بیانات کی اس ریل پیل میں ایک بیان خاص طور پر مجھے یاد آ رہا ہے جو کراچی سے ترپین دانشوروں کی طرف سے جاری ہوا اور لاہور تک پہنچتے پہنچتے کتنے بیانات کو جنم دیتا چلا گیا۔ اس کا تعلق مولانا بھاشانی کی ذات سے تھا۔ مگر اس سے پہلے مجھے ایک اور واقعہ کا بھی تو ذکر کرنا چاہیے۔ اس ہنگامہ دار و گیر میں سوشلسٹ دو فرقوں میں بٹ چکے تھے۔ ترمیم پسند اور انقلابی۔ اور پلہ اس وقت انقلابیوں کا بھاری تھا۔ ترمیم پسندوں کا سلسلہ نسب تو سوویت روس سے ملتا تھا۔ سوویت روس پاکستان میں پہلے ہی کون سا نیک نام تھا۔ اب اعلان تاشقند کے وقت سے مزید رسوا ہو چکا تھا۔ پھر ایشین سیکورٹی پلان اور پاک ہند کنفیڈریشن کے شوشے بھی اسی سے منسوب تھے۔ سو ترمیم پسند سوشلزم تو ہمیں وارا نہیں کھاتا تھا۔ سو یہ گروہ سکڑتا چلا جا رہا تھا اور سید سبط حسن پرانے وقتوں کی یادگار نظر آتے تھے۔ اب انقلابیوں کی ایک نئی نسل پیدا ہو چکی تھی جنہیں سجاد ظہیر سے لے کر حمید اختر تک سب ترقی پسند موقع پرست اور انقلاب دشمن نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چینی برانڈ سوشلزم کا علم تھا۔ اسے وہ سچا اور کھرا سوشلزم جانتے تھے۔ مخالص انقلاب۔ پچھلے ترقی پسندوں کو تو اپنے نظریے کے اعلان اور تبلیغ میں بہت دشواریاں پیش آئی تھیں۔ غدار' اسلام دشمن لادین' روسی ایجنٹ' کیسے کیسے خطابات سے نوازے گئے' مگر نو ترقی پسندوں کو چین سے رشتہ داری کے باعث بہت سہولت حاصل تھی۔ چین ہمارا دوست اور ہندوستان کا دشمن۔ سو اس کا لادین انقلاب بھی ہمیں بھلا نظر آتا تھا۔ بلکہ نیک دل مسلمان چین کا دورہ کر کے واپس آتے تھے تو اہل وطن کو خوشخبری سناتے تھے کہ ہم چین میں اسلام کا جلوہ دیکھ کر آئے ہیں۔ مغرب کی بے حیائی سے پریشان مسلمان چین سے یہ ایمان افروز اطلاع لے کر آتے کہ عورت وہاں عورت نظر نہیں آتی۔ ایک جلسہ میں چین کے ایک نیک دل زائر سے جو اس

مشاہدے سے مسحور نظر آ رہا تھا' میں نے تقریر کے بعد پوچھا کہ ''عورت اگر چین میں عورت نظر نہیں آتی تو پھر کیا نظر آتی ہے؟''

''جیسے اور سب نظر آتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ عورت ہے۔''

اور سب یعنی مرد۔ اور میں حیران کہ یا اللہ' کیا یہ اسلام کا تقاضا ہے کہ عورت اپنی صنفی شناخت کو گم کر دے۔

اس پس منظر میں نو ترقی پسندوں کو اپنی دعوت انقلاب میں بہت سہولت حاصل ہو گئی تھی۔ آخر وہ بھی تو ایک ثقافتی انقلاب برپا کرنے کے درپے نظر آ رہے تھے۔ ان کا پہلا ہدف حلقہ ارباب ذوق تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حلقہ اگر مشرف بہ انقلاب ہو جائے تو پھر پاکستان میں انقلاب کا رستہ کون روک سکتا ہے۔

اور اب مولانا بھاشانی کی طرف آیئے۔ شیخ مجیب الرحمن تو ہمارے لیے یکسر ناقابل قبول تھے۔ ایک تو وہ بھٹو صاحب کے حریف تھے۔ پھر ان کے چھ نکات نے انہیں بہت رسوا کر رکھا تھا۔ مولانا بھاشانی مولانا بھی تھے اور انقلابی بھی تھے۔ ان کا سکہ مغربی پاکستان میں چل گیا' مگر اسلام پسندوں نے ان کو مولانا نہیں مانا۔ بس انقلابی جانا اور ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ اسی چکر میں یہیں کہیں ان پر حملہ ہو گیا۔ باقی حلقوں میں اس واقعہ کی جو مذمت ہوئی وہ تو ہوئی' مگر ادیبوں اور دانشوروں نے بھی اس واقعہ پر بڑی شدت سے اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔

اب میں اپنے اس وقت کے ایک کالم کی مدد سے یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس ردعمل نے لاہور کے ادبی حلقوں میں کیا شکل اختیار کی۔ تیئیس ادیبوں اور دانشوروں نے حملہ کی مذمت میں ایک بیان جاری کیا۔ اس کے جواب میں دوسری طرف سے چھبیس ادیبوں دانشوروں صحافیوں نے ایک بیان داغ دیا۔ پھر یوں ہوا کہ اتوار کی شام جب حلقہ کے جلسہ کے بعد بہت سے ادیب ٹی ہاؤس میں اکٹھے تھے تو ایک دانشور ایک بیان کا مسودہ لے کر ٹی ہاؤس میں داخل ہوا۔ دستور کے مطابق میز میز گیا' دستخط کرانے لگا۔ ایک میز پر یاروں نے سوال کھڑا کر دیا کہ مولانا بھاشانی پر حملہ کی مذمت برحق مگر ہم جماعتی سیاست میں کیوں پھنسیں اور کسی جماعت کا نام لے کر کیوں مذمت کریں۔ آگے کیا ہوا۔ کالم (مورخہ 22 مارچ 1969ء) کی کہانی یوں سناتا ہے۔

''تب ایک ادیب نے مفاہمت کی صورت نکالی اور یہ تجویز پیش کی کہ کراچی کے ادیبوں کے اس بیان کو پڑھو جس میں ملکی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے تشدد کی بہر رنگ مذمت کی گئی ہے اور کچھ مطالبات کیے گئے ہیں۔ اعجاز حسین بٹالوی نے کہا کہ اس مقصد سے ادیبوں کا ایک جلسہ کر لو۔ میرزا ادیب بولے کہ جلسہ کے لیے گلڈ کا دفتر حاضر ہے۔ کسی نے کہا کہ قصہ زمین برسر زمین۔ ٹی ہاؤس ہی میں کیوں جمع نہیں ہوتے۔ عابد حسن منٹو نے انقلابی دانشوروں کو سمجھایا کہ بالکل بجا تجویز ہے۔

''اگلے دن شام کو احمد ندیم قاسمی کی صدارت میں کچھ ادیب' کچھ صحافی' کچھ رنگا رنگ داشور جمع ہوئے اور ایک بیان کے خاکے پر غور و فکر شروع ہوا۔ مگر ٹی ہاؤس کی ادیب پارٹی دو تین ہفتے پہلے اپنے رنگ کا ایک بیان جاری کر چکی تھی جس طرح ایک شاعر کو اپنی شاعری باقی سب شاعری سے افضل نظر آتی ہے اسی طرح اس پارٹی کو اپنا یہ بیان سب بیانوں سے افضل نظر آیا۔ واضح ہو کہ یہ وہی بیان ہے جس میں ادب اور کلچر کے احتساب کے لیے حکومت سے ایک ٹربیونل بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ قاسمی صاحب نے اس شق پر تو فوراً ہی خط تنسیخ پھیر دیا اور کہا کہ اب باقی بیان پر غور کر لو۔''

بہت بحث مباحثہ ہوا۔ آخر زیر بحث بیان کو فراموش کر کے ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں ہر قسم کے تشدد' ہر رنگ کے سامراج' اور ہر طرز کی فسطائیت کی مذمت کرتے ہوئے مولانا بھاشانی پر حملہ کی مذمت کی گئی۔

اخباری بیانوں کے اس طوفان بے تمیزی سے ایک روز ناصر کاظمی جھنجھلایا۔ چائے پیتے بولا ''میں بھی ایک بیان جاری کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم بھی؟''

''ہاں میں بھی۔ میں یہ بیان جاری کرنا چاہتا ہوں کہ آج میں اداس ہوں۔''

''یہ بیان تو نہیں چھپ سکتا۔''

''کیوں؟''

''اس میں خبریت نہیں ہے۔''

''مولانا بھاشانی پر حملہ کا واقعہ خبر بن سکتا ہے تو میرے اداس ہونے کا واقعہ کیوں خبر نہیں بن سکتا۔ کم از کم لاہور نامہ میں تو یہ بیان چھپ سکتا ہے۔''

اور اب میں اس زمانے میں جاری ہونے والے بیانات کو یاد کرتا ہوں۔ ان سارے بیانات کو جن پر معروف غیر معروف ادیبوں کے بے حساب دستخط ہوا کرتے تھے تو مجھے احساس ہو رہا ہے کہ بامعنی بیان تو یہی ایک تھا۔ ناصر کاظمی کا یہ بیان کہ آج میں اداس ہوں۔

◆◆◆

انقلاب کی سواری حلقہ ارباب ذوق تک تو آئی

شائستگی چو کتینکہ پیش مرداں می آید۔ بیان بازیاں' نعرے' گالم گلوچ' تو تو میں میں' لپاڈگی' میرا ہاتھ تیرا گریبان' تیرا ہاتھ میرا گریبان' وقت کا دستور اب یہی تھا۔ وائی ایم سی اے کے سامنے سے گزرتے گزرتے میں ٹھٹکا۔ کتنے زمانے سے میں اس عمارت سے مانوس چلا آتا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں کی تقریب سے کیسے کیسے وضعدار بزرگ کو' ثقہ نقادوں کو' فقیر منش شاعروں افسانہ نگاروں کو' متین و سنجیدہ دانشوروں کو یہاں آتے جاتے دیکھا تھا' آج نیا منظر دیکھا' کیا دیکھا کہ بیچ سڑک پہ دو پارٹیاں لپاڈگی کر رہی ہیں' غصے میں بھرے نوجوان لپک لپک کر عمارت سے باہر آ رہے ہیں' نعرے لگاتے ہیں' پھر لپاڈگی کے مظاہرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ پھر دیکھا کہ ظہیر کاشمیری نمودار ہوئے' ہاتھا پائی میں مصروف ہجوم کے بیچ جا کر دونوں ہاتھ بلند کیے اور با آواز بلند اپیل کرنی شروع کی۔ دوستو امن' امن۔

عجب ثم العجب۔ ایں چہ می بینم۔ پتا چلا کہ اندر انجمن شبان المسلمین کا جلسہ ہو رہا تھا' جہاں سی آر اسلم بھی تھے' میاں محمد طفیل محمد بھی۔ وہ سوشلسٹوں کی کمک کے ساتھ۔ یہ اسلام پسندوں کے لشکر جرار کی معیت میں۔ پہلے دونوں طرف سے نعرے لگنے شروع ہوئے' پھر تو تکار' پھر بات گالم گلوچ تک پہنچی اور ہاتھ گریبانوں تک گئے۔

انجمن شبان المسلمین پر موقوف نہیں۔ جلسوں کا یہ نقشہ اب عام دیکھنے میں آتا تھا۔ جلسہ ہونا بھی ضروری نہیں تھا۔ شورش کاشمیری اور مولانا کوثر نیازی کی مڈھ بھیڑ کہیں ٹولنٹن مارکیٹ میں ہو گئی۔ پہلے آوازے کسے گئے۔ پھر گالیاں' پھر جوتی لات۔

ایسے موسم میں غلام عباس کراچی سے وارد ہوئے۔ نیا افسانہ بغل میں داب کر لائے۔ افسانہ حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا۔ عنوان تھا ''دھنک'' ایک قسم کی فینٹاسی

کچھ اس طرح کی کہ پاکستان سائنسی اعتبار سے ترقی کرتے کرتے اس مقام پر ہے کہ چاند پر آدمی اتارنے کا اہتمام کر رہا ہے۔ ہوٹل موہنجوداڑو میں دنیا کے ممالک کے نمائندے جمع ہیں اور اس سائنسی مہم کے نتیجہ کا انتظار کر رہے ہیں جو کامیاب ہوتی ہے' مگر ملاؤں نے اس مہم کو غیر اسلامی قرار دیا۔ تحریک چلائی' حکومت کو مستعفی ہونا پڑا' ملاؤں کی حکومت قائم ہو جاتی ہے' انجام کیا ہوا۔ برسوں بعد ایک منظر' پورا ملک صحرا بن چکا ہے' کچھ غیر ملکی سیاح اونٹوں پر یہاں پہنچتے ہیں' ہوٹل موہنجوداڑو کے آثار دریافت کرتے ہیں۔ پتا

چلتا ہے کہ یہ وہ مقام ہے جہاں سے آدمی چاند پر بھیجا گیا تھا۔

افسانہ ختم ہوا۔ حلقہ میں قیامت اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج کل حلقہ کے جلسوں میں اسلام پسند بھی دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے تو قیامت برپا کردی۔ ایک آواز اب تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس شور میں یہ سب سے اونچی اور سب سے غصیلی آواز تھی۔ یہ آواز تھی عبدالقادر حسن کی۔ ہمیں فکر ہوئی کہ کہیں اسلام پسند عباس صاحب پہ نہ ٹوٹ پڑیں۔ بس یہ نوبت آیا ہی چاہتی تھی۔ چند دوست رضا کارانہ آگے بڑھے۔ عباس صاحب کو اپنے حلقہ میں لیا۔ بس ہم انہیں وہاں سے کسی طرح لے کر باہر سٹک لیے اور ٹی ہاؤس میں آ کر دم لیا۔

حلقہ میں اسلام پسندوں کی طاقت کا یہ آخری مظاہرہ تھا۔ اب حلقہ کے بیچ ایک نئی طاقت تیزی سے ابھر رہی تھی۔ ایک پستہ قد دانشور کتنے برسوں سے یہاں آ رہا تھا۔ بات ادب کی کم فلسفہ کی زیادہ کرتا تھا۔ جان ڈوئی کے حوالے کے بغیر نوالہ نہیں توڑتا تھا' مگر اب روپ دوسرا تھا۔ یاروں کے دیکھتے دیکھتے وہ ایک چھوٹا سا ماؤزے تنگ بن گیا۔ حلقہ میں اب تک ہم نے گرما گرم بحثیں سنی تھیں' مگر یہ انقلابی بحث سے گزرا۔ گفتگو فوراً ہی تقریر کا رنگ پکڑ لیتی' شدت جذبات سے جسم کانپنے لگتا۔ منہ سے پہلے انگارے برستے' پھر آواز بھرا جاتی اور رقت طاری ہو جاتی۔ اس طریقہ واردات نے بہت جلد اپنا کرشمہ دکھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گرد شوق بغاوت رکھنے والے نوخیز دانشور اچھی خاصی تعداد میں اکٹھے ہو گئے اور اس طرح اکٹھے ہوئے کہ اپنے مرشد کے فدائی بن گئے۔ جہاں اس کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون بہانے کے لیے تیار۔ مرشد اپنے فدائیوں کے جلو میں حلقہ کے جلسہ میں نزول اجلال کرتا۔ فدائی کیل کانٹے سے لیس' انقلاب دشمنوں سے نبٹنے کے لیے مستعد' شست باندھ کر بیٹھ جاتے' جب کوئی نظم' کوئی غزل' کوئی افسانہ پیش کیا جاتا اور پیش کرنے والا اگر انقلاب کے اس پیغام سے بے بہرہ ہوتا جو ان دنوں حلقہ سے ٹی ہاؤس تک کی فضاؤں میں گونج رہا تھا تو پھر وہ ان فدائیوں کے نرغے میں آ جاتا۔ جب یہ فدائی تنقید کا ابتدائی فریضہ انجام دے چکتے تو پھر مرشد کی تنقید حرف آخر کے طور پر آتی۔ یہ ایک پورا خطبہ ہوتا کہ کس طرح سے ادب اب تک سامراج کے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال ہوا ہے اور کس طرح پاکستان کے ادیب اس وقت سامراج کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ رجعت پسند ادیب تو خیر ہوئے مگر ترقی پسند ادیب بھی اس کے حساب سے ترمیم پسند ہو چکے تھے اور روسی سامراج کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔

حلقہ میں بحث کا یہ نقشہ انور سجاد کی سیکرٹری شپ کے زمانے میں پوری طرح قائم ہوا اور پھر اس نے متوقع نتائج پیدا کیے۔ انور سجاد کا سیکرٹری بننا حلقہ کی تاریخ میں ایک موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد حلقہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے اور پھر کبھی وہ اپنی پچھلی

ڈگر پر واپس نہ آ سکا۔ اس عزیز کے سیکرٹری ہونے میں تو کوئی مضائقہ نہیں تھا' مگر خرابی اس باعث پیدا ہوئی کہ انور سجاد نے خالی اپنی ادبی حیثیت کی وجہ سے سیکرٹری کے الیکشن میں کامیابی حاصل نہیں کی تھی۔ اس سیاست زدہ عہد میں جب ہر ادارے اور ہر شعبہ میں نظریاتی تفرقہ پڑا ہوا تھا حلقہ میں انقلابیوں کی اس طاقت پکڑتی ٹولی نے حلقہ پر قبضہ کرنے اور اسے رجعت پسندوں اور انقلاب دشمنوں سے پاک کرنے کی ٹھانی۔ انہیں اس کام کے لیے ایک عدد ادیب کی ضرورت تھی' ایسا جوان کے فلسفہ میں ایمان رکھتا ہو۔ اور حلقہ میں اور حلقہ سے باہر ادیب کی حیثیت سے بھی پہچانا جاتا ہو۔ قرعہ فال انور سجاد کے نام نکلا۔

تو اب حلقہ میں فضا یہ تھی کہ ادب کا ذکر بھی تحقیر کے لہجہ میں کیا جاتا۔ دیسی ماؤزے تنگ نے جس کا نام عزیز الحق تھا' اپنے زور خطابت سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ شاعری اور افسانہ بنفسہ انقلاب دشمن سرگرمیاں ہیں اور ایسے وقت میں جب انقلاب کی جدوجہد اپنے فیصلہ کن مرحلہ میں ہو' کتابوں سے شغف کا مطلب ہے انقلاب کی جدوجہد سے فرار۔ تو اب حلقہ اور ٹی ہاؤس میں امنڈتے ہوئے نو خیز انقلابی ادیب بھی ایک احساس جرم کا شکار نظر آتے کہ انہوں نے کتابیں پڑھنے میں' شعر اور افسانہ لکھنے میں نئی لسانی تشکیلات اور وجودیت جیسے فلسفوں میں وقت ہی ضائع کیا۔ یہ وقت انقلاب کی جدوجہد میں صرف کیا جاتا تو اب تک پاکستان میں انقلاب آ چکا ہوتا۔

اس فضا میں جو شاعر جوافانہ نگار اپنی تازہ تخلیقی کاوش لے کر حلقہ میں پہنچا خوار و خستہ ہو کر واپس آیا۔ منیر نیازی نے اپنی باری آنے پر تھوڑی آنکھیں دکھائی تھیں۔

جب منیر نیازی اپنی نظم پڑھ چکا تو پہلے سعادت سعید نے پنی انقلابی تنقید کے جوہر دکھائے اور منیر نیازی کو ایک فراریت پسند انقلاب دشمن شاعر ثابت کیا۔ پھر اس فدائی نے جس جوش بغاوت میں اپنے والدین کے رکھے ہوئے نام کو رد کر کے اپنا نام لڈو رکھا تھا' منیر نیازی کی شاعری کو انقلاب کی کسوٹی پر کسا اور کھوٹا ثابت کیا۔

منیر نیازی نے غصیلی نظروں سے لڈو کو دیکھا اور کہا کہ لڈو میں تجھے ہڑپ کر جاؤں گا۔ مگر منیر نیازی کی یہ خوش فہمی تھی۔ یہ لڈو موتی چور کا نہیں تھا' بور کا تھا۔ اسے نگلا جا سکتا تھا نہ اگلا جا سکتا تھا۔

پھر جلسہ کے ختم کے بعد منیر نیازی نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور گرج کر کہا کہ وہ مگر وہ آدمی سعادت سعید کہاں ہے۔

مگر سعادت سعید نے عاقبت اندیشی دکھائی۔ اپنا محاکمہ دینے کے فوراً ہی حلقہ کے جلسہ سے سٹک لیا تھا۔

ویسے تو افتخار جالب بھی ان دنوں گرو بنے بیٹھے تھے ان کے گرد بھی چیلوں کا ہجوم تھا' مگر اب حلقہ ارباب ذوق میں عزیز الحق کے

سامنے ان کے چراغ کی لو مدھم رہتی تھی۔ بہر حال حلقہ سے باہر وہ خوب زور دکھا رہے تھے۔ چندے انہوں نے میرے کالم کی بھی رونق بڑھائی۔ جدید نفسیات کی کوئی بحث چل رہی تھی۔ اس میں دھم سے کود پڑے۔ پہلے تو یونگ کے پرستاروں کے لتے لیے اور سہیل احمد خاں سے بھڑ گئے۔ پھر یونگ کے ساتھ ساتھ انہوں نے کلاسیکی موسیقی کی بھی خبر لے ڈالی۔ جو خط انہوں نے میرے کالم کے نام بھیجا اس میں لکھا کہ۔

''ہمارے منیر احمد شیخ اور آپ کے حیات احمد خاں ہزار کوشش کریں۔ پہلے کی طرح آج بھی درباری دھری کی دھری رہ جائے گی۔ قوالی ہی چلے گی۔ کلاسیکی ٹھیٹھ کلاسیکی موسیقی اپنے طبقاتی تناظر سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔ کلاسیکی موسیقی کو زندہ کرنا درباروں اور راجوڑوں کو زندہ کرنا ہے۔ ان کے جانشینوں کو بقا بخشنا ہے۔ یہ کام طبقاتی سیاق کو فراموش کر کے ہی کیا جاسکتا ہے' از خود نہیں ہوسکتا۔''

حیات احمد خاں کہاں چونکنے والے تھے' فوراً ہی خط لکھا اور افتخار جالب کے استدلال کی چندی چندی کر دی۔

''نہ جانے افتخار صاحب نے درباری کے ختم ہونے اور قوالی کے جاری رہنے کی پیش گوئی کیسے کر دی۔ غالباً انہوں نے راگ درباری کو اس کے مروجہ نام کی وجہ گردن زدنی قرار دیا ہے۔ ان سے عرض کر دیجئے کہ درباری کا اصل اور پرانا نام کاہنڑہ ہے۔ میاں تان سین نے ایک دفعہ یہ راگ اکبر کے دربار میں گایا تھا اور اکبر نے خوش ہو کر اسے درباری کا لقب دیا تھا۔

''درباروں اور رجواڑوں کا زمانہ تو اب بیت چکا ہے۔ سلطانی جمہور کے زمانے میں آپ اس کا نام درباری رہنے دیں یا پھر اسے کاہنڑہ کر دیں' اس راگ کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس راگ کی بنیاد بہت قدیم زمانے میں رکھی گئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے پہلے کاہنڑہ کے کسی قبیلے کا لوک گیت تھا۔ فنکاروں کی محنت سے یہ عوامی گیت کلاسیکی موسیقی کا حصہ بنا۔ آج یہ راگ بے شمار گیتوں' غزلوں اور گانوں کی بنیاد ہے' حتیٰ کہ قوال بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے حسن و جمال پر عوام ہمیشہ سے فریفتہ رہے ہیں اور جب تک لوگ سنتے سناتے رہیں گے یہ راگ اپنی ٹھیٹھ کلاسیکل شکل میں زندہ رہے گا۔ میری کوشش سے نہ تو درباری اور نہ ہی کلاسیکی موسیقی فروغ پاسکتی ہے اور نہ ہی افتخار جالب صاحب کے تجزیے سے ختم ہوسکتی ہے۔ کلاسیکی موسیقی ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم جیسے فنکاروں کے ریاض اور عوام کے ذوق و شوق کی وجہ سے زندہ رہے گی۔ موسیقی کانفرنس کے سالانہ جشن ہمارے فنکاروں کے کمال فن اور عوام کے ذوق و شوق کی زندہ شہادت ہیں۔

رہا قوالی کا معاملہ تو جالب صاحب اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ قوالی کا اصل مقام خانقاہ ہے۔ اگر افتخار جالب کی مراد بر آئی تو خانقاہوں کی رونق کے ساتھ قوالی کا بستر بوریا بھی گول ہو جائے گا۔

اور آپ نے یہ جو کہا ہے کہ میں جماعت اسلامی سے شاکی ہوں' یہ درست نہیں۔ مولانا مودودی ہمارے کالج میں دینیات کے استاد تھے۔ میں نے ان سے تعلیم حاصل کی ہے اور ان کے علم کا معترف ہوں۔ لیکن موسیقی مولانا کا مضمون نہیں۔ تھوڑے ہی عرصے کی بات ہے کہ مغربی پاکستان میں موسیقی کو دفنانے کا حکم ہوا تھا۔ یہ حکم اسلام کے نام پر جاری کیا گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ مولانا مودودی عالم دین ہیں' اس معاملہ میں ان کی رائے معلوم کی جائے۔

''چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ دف کے ساتھ گانا جائز ہے۔ میرے استفسار پر کہ اگر طبلے کے ساتھ گایا جائے تو اس صورت میں کیا احکام ہوں گے۔ مولانا نے کہا کہ طبلے کی سنگت میں گانا جائز نہیں۔ میں نے وضاحت چاہی تو انہوں نے فرمایا کہ دف ایک طرف سے بند اور دوسری طرف سے کھلی ہوتی ہے۔ طبلہ چونکہ دونوں طرف سے بند ہوتا ہے' اس لیے اس کے ساتھ گانا جائز نہیں۔

''اب آپ آتشیں شیشے سے مولانا کے اس استدلال اور افتخار جالب کے درباری قوالی اور طبقاتی تناظر والی بحث میں دلیل ڈھونڈنا شروع کریں تو آپ کا وہی حال ہوگا جو استاد امام دین کے کلام میں مطلب ڈھونڈنے والوں کا ہوا کرتا ہے۔

مخلص .....حیات احمد خاں

تو گویا حیات احمد خاں کو اس وقت دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ اسلام پسند تو پہلے ہی کلاسیکی موسیقی کو خلاف اسلام جان کر پاکستان سے نکال باہر کرنے پر تلے تھے۔ اب انقلابیوں کو راگ درباری سے دربار کی بو آنے لگی اور ساری کلاسیکی موسیقی انقلاب کی دشمن دکھائی دینے لگی۔ تو یک نہ شد دو شد۔ کلاسیکی موسیقی پاکستان میں دو پاٹوں کے بیچ میں آ گئی۔

ادھر یہ بحثیں چل رہی تھیں' ادھر مشرقی پاکستان میں حالات ابتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان سے تناؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جنگ جیسے سر پہ کھڑی ہو۔ بھٹو صاحب کے دیئے ہوئے نعرے Confrontation with India نے جنگی بخار اور تیز کر دیا تھا۔ نئے انقلابیوں کو یہ نعرہ وارا کھاتا تھا۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ چین سے وفاداری کا بھی حق ادا ہو رہا تھا اور حب الوطنی کے تقاضے بھی پورے ہو رہے تھے۔ لیجئے حلقہ ارباب ذوق کا ایک ہنگامہ خیز جلسہ یاد آ گیا۔ نخالص چینی انقلابی اور پیپلز پارٹی برانڈ والے انقلابی دونوں اکٹھے تھے اور آگ کے انگارے اگل رہے تھے۔ دیسی ماؤزے تنگ کے منہ سے کف جاری تھا اور جسم تھرا رہا تھا۔ مقدمہ یہ پیش تھا کہ بمبئی کے السٹریٹڈ ویکلی نے اپنا ایک پاکستان نمبر شائع کیا ہے۔ سازش' سازش' سازش۔ ارے یہ تو وہی پاک ہند کنفیڈریشن والا چکر ہے اور اس پرچہ میں پی ٹی وی کے آرٹسٹوں کو اتنا کیوں اچھالا گیا ہے۔ کس دھوم سے ان کی تصویریں شائع کی

گئی ہیں۔ پی ٹی وی کے سارے آرٹسٹ ایک دم سے مشکوک ہو گئے۔ ابھی ان پر لے دے ہو رہی تھی کہ کسی آفت کے پرکالہ نے توجہ دلائی کہ اس نمبر میں انتظار حسین کا بھی ایک افسانہ ترجمہ ہو کر چھپا ہے۔ دم کے دم میں توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔ باقی مجرم تو غائب تھے ایک مجرم پکڑا گیا۔ شہزاد میرے برابر بیٹھا تھا۔ مجھے ٹہوکا ''یار چپکے کیوں بیٹھے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟''

''کیا بولوں؟''

''اپنی صفائی پیش کرو۔''

''کیسی صفائی۔''

''کہو کہ انہوں نے اپنے طور پر یہ کہانی چھاپی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

شہزاد نے میری ہمدردی ہی میں یہ بات کہی تھی' مگر اس کی منطق میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اگر السٹریٹڈ ویکلی کو میری ایک کہانی بھا گئی تھی اور قرۃ العین حیدر نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا تو اس میں میرے لیے خوش ہونے کا پہلو تو تھا۔ اپنی صفائی پیش کروں' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر کہانی بھی اس نوعیت کی نہیں تھی کہ ہندوستان پاکستان سیاست کے پس منظر میں کسی کے لیے اس سے اپنے مطلب کے معنی نکالنے کی گنجائش ہو۔ یہ کہانی تھی ''ٹانگیں'' مگر یہ کمبخت نمبر بھی تو بہت غلط موقعہ پر آیا تھا۔ ابھی تو پیپلز پارٹی کے جیالوں نے خبردار کیا تھا کہ ہم ہندوستان کی ہاکی ٹیم کو لاہور میں میچ نہیں کھیلنے دیں گے۔ اوپر سے السٹریٹڈ ویکلی کا پاکستان نمبر دھم سے آ پڑا۔ خیر مگر آگے چل کر جب انقلابیوں کی کمان اتر گئی تو ایسی ساری ذمہ داریاں جماعت اسلامی والوں نے اپنے سر لے لیں۔

ملا کی دوڑ مسجد تک۔ ان دنوں ہماری مسجد شاکر علی کا گھر تھا۔ ٹی ہاؤس میں تو زیادہ وقت نہیں گزارا جا سکتا تھا۔ کہاں کی رباعی کہاں کی غزل۔ بلکہ اب تو نئی لسانی تشکیلات کی بحث بھی موقوف تھی۔ انقلاب کا وظیفہ پڑھا جا رہا تھا اور ہر ادیب چینی انقلابی اور بھٹو صاحب کا جیالا بنا نظر آتا تھا۔ میں اور زاہد ڈار یہاں سے نکلتے اور شاکر صاحب کی طرف ہو لیتے۔ شاکر صاحب بالعموم منہ لپیٹے پڑے نظر آتے۔ آدھے سوتے آدھے جاگتے۔ قدموں کی آہٹ پر کمبل سے منہ نکال کر دیکھتے۔ ''آ گئے۔'' اور پھر منہ لپیٹ لیتے اور فوراً ہی خراٹوں کی آواز آنے لگتی اور زاہد ڈار کو یکا یک یاد آتا کہ اس نے دوپہر کا کھانا تو کھایا ہی نہیں ہے۔ فخر الدین سے جا کر بات کرتا ''کچھ کھانے کو ہے۔''

''نہیں جی۔''

''انڈا تو ہوگا۔ آملیٹ بنالو۔''

''انڈا بھی نہیں ہے۔''

''پھر لے آؤ۔''

وہ شاکر صاحب کے قریب جاتا ''انڈا گھر میں نہیں ہے انڈا لے آؤں۔''

شاکر صاحب فوراً منہ کھولتے ''کیوں' کس لیے۔''

''ڈار صاحب آملیٹ کو کہہ رہے ہیں۔''

جھنجھلا کر زاہد ڈار کو دیکھتے ''یار تمہیں یہیں آ کر بھوک لگتی ہے' نہیں آئے گا انڈا۔'' اور فوراً منہ لپیٹ لیتے' مگر پھر اسی طرح منہ لپیٹے لپیٹے کہتے ''اچھا آج تو لے آؤ۔''

جب خوب اینڈ لیتے تب اٹھ کر بیٹھتے۔ فخر الدین سے چائے بنانے کو کہتے۔ پھر ہم سے مخاطب ہوتے ''ہاں یار کچھ سناؤ۔''

میں 1965ء کے ہنگامی دنوں کو یاد کرتا ہوں۔ ان دنوں میری شاکر صاحب سے ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ مڈھ بھیڑ ہوئی تو میں نے پوچھا ''شاکر صاحب آپ ان دنوں کیا کر رہے ہیں؟''

انہوں نے میرے لہجہ کو سونگھا اور فوراً اپنے اور میرے درمیان ایک شریفانہ فاصلہ پیدا کر کے بولے ''انتظار صاحب' میں تو ان دنوں رکے پڑھتا رہتا ہوں اور چاند پینٹ کرتا ہوں جو سرحد کے اس طرف بھی چمکتا ہے ور اس طرف بھی چمکتا ہے۔''

اس ہنگام مجھے ان کی اپنے اردگرد سے یہ بے تعلقی بھلی نہیں لگی تھی۔ مگر اب بھلی لگتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ ان دنوں وہ رکے پڑھ رہے تھے (سرہانے ضرور رکھا رہتا تھا) نور نہ چاند پینٹ کر رہے تھے۔ جب بھی ان کے کمرے میں قدم رکھا' یہی دیکھا کہ لیٹے ہیں' آدھے سو رہے ہیں' آدھے جاگ رہے ہیں۔ جنگ کی بات کرتے تھے نہ سنتے تھے۔ ہاں ہر پھر کر اپنے بنگالی ہم عصروں کو یاد کرتے تھے۔ خاص طور پر زین العابدین کو ''یار پتا نہیں وہ لوگ کس حال میں ہوں گے۔''

شاکر صاحب ان دنوں تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مطلب یہ کہ ان کی زندگی میں جو رونق آئی تھی وہ چار دن کی چاندنی نکلی۔ وہ جو ایک میم ان کی ہم سفر بنی تھی وہ انہیں چھوڑ کر جا چکی تھی۔ شاکر صاحب پھر اکیلے تھے۔ کہنے کو اس بھائیں بھائیں کرتے گھر میں دو افراد اور بھی تھے۔ ایک بوڑھا فخر الدین جو شاکر صاحب کے پکارنے پر صورت دکھاتا اور فوراً ہی واپس چلا جاتا۔ دوسرا سیزر تھا' جو کبھی بھونکتے نہیں دیکھا گیا۔ صرف دم ہلاتا تھا۔ آنے والے دوستوں کا دم ہلا کر استقبال کرتا' شاکر صاحب کے بیڈ روم تک ساتھ

ساتھ آتا' امانت کو شاکر صاحب کے سپرد کرتا اور واپس چلا جاتا۔ مگر وہ بھی ایک دن شاکر صاحب کو داغ مفارقت دے گیا۔ شاید اکیلے گھر میں اسے خفقان ہوا اور کیا عجب ہے کہ اسے احساس ہو گیا ہو کہ اس گھر پر تو تنہائی کی زندگی کا سایہ ہے۔ تجرد کی زندگی سے پریشان ہو کر یہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ جوئندہ یابندہ' جلد ہی ایک رفیقہ اسے میسر آ گئی۔

''شاکر صاحب' آپ کا سیزر کہاں غائب ہو گیا۔''

بولے ''ایک مرتبہ وہ آیا تھا۔ ایک کتیا اس کے ساتھ تھی۔ بہت اس نے دم ہلائی' مگر میں نے اسے منہ نہیں لگایا۔ چلا گیا۔ پھر نہیں آیا۔''

مجھے یقین ہے کہ اس گھر سے نکل کر سیزر نے بھونکنا بھی شروع کر دیا ہوگا۔ گم سم شاکر علی کی صحبت میں رہ کر تو وہ بھونکنا ہی بھول گیا تھا۔ شاکر صاحب بولتے بھی تھے تو شارٹ ہینڈ میں۔ فقرہ بالعموم ادھورا رہتا تھا۔ مطلب کو آپ سمجھیں اور فقرے کو مکمل خود کر لیں۔ بولنے کی خواہش سے ویسے تو بے نیاز ہی تھے۔ وہ سنا کریں اور کہا کرے کوئی' مگر وقتاً فوقتاً بولنے کی خواہش بھی زور مارتی تھی۔ اس کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا۔ ایک واقعہ تو مجھے ذاتی حوالے سے یاد ہے۔ میرے ایک افسانوی مجموعے کی افتتاحی تقریب تھی۔ کس شوق سے دوستوں نے اس تقریب کا انہیں صدر بنایا۔ خود شاکر صاحب نے ایک لمبی صدارتی تقریر کا عزم باندھا تھا مگر جب مائیک کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے تو جلدی جلدی ڈھائی تین فقرے ایسے بولے کہ کوئی آدھا کوئی پونا اور سٹپٹا کر بیٹھ گئے۔

مکمل فقرے تو میں نے ان کی زبان سے ادا ہوتے ایک ہی موقعہ پر دیکھے تھے جب انہیں زاہد ڈار کی ایک بات پر غصہ آیا تھا۔ زاہد ڈار جب پیروں فقیروں کو نہیں بخشتا تو ادیب اور دانشور کس گنتی میں ہیں۔ سو ایک دن رو میں سبط حسن کی شان میں بھی اس نے کچھ کہہ ڈالا۔ شاکر صاحب بھڑک اٹھے۔ ''تمہیں پتا ہے کہ سبطے میرا دوست ہے۔ تم نے کیسے کہی یہ بات اس کے بارے میں۔ نکل جاؤ یہاں سے۔'' اور اس رو میں کتنے ہی مربوط فقرے ایک تسلسل میں بولتے چلے گئے' مگر زاہد ڈار ایک ڈھیٹ۔ اطمینان سے اپنی جگہ جما بیٹھا رہا اور جب فخر الدین آملیٹ اور توس لے کر آیا تو اطمینان سے کھانے میں مصروف ہو گیا۔ شاکر صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ کیا کریں۔ بس منہ لپیٹ کر پڑ گئے۔

شاکر صاحب کو سبط حسن سے واقعی بہت لگاؤ تھا۔ بہت پکی دوستی تھی۔ ایسی پکی کہ ایک مرتبہ ان کی خاطر وہ اچھے خاصے مولائی بن گئے تھے۔ وہ عاشور کی دوپہر تھی۔ میں' ناصر اور مشتاق ٹی ہاؤس میں بیٹھے تھے انیس کی ایک جلد ہمارے بیچ رکھی تھی۔ مظفر کی فراہم کردہ اس جلد کو مشتاق نے ان تاریخوں میں کس خضوع و خشوع سے پڑھا تھا۔ اچانک شاکر صاحب وارد ہوئے۔ نہ دعا نہ سلام ''اٹھو اٹھو یار' ہمارے گھر چلو مجلس کرنی ہے۔''

''مجلس؟'' ہم تینوں نے شاکر صاحب کو تعجب سے دیکھا۔

''ہاں یار سبطے میرے گھر بیٹھا ہے۔ کہتا ہے آج عاشور کا دن ہے۔ کچھ ماتم مرثیہ ہونا چاہیے۔ یار تم لوگوں کو کوئی مرثیہ ورثیہ یاد ہے۔ کوئی سوز' کوئی نوحہ۔''

مشتاق بولا ''انیس جو موجود ہے۔''

شاکر صاحب نے انیس کی جلد کو دیکھا ''بس بس کام بن گیا۔ اٹھو چلو جلدی سے۔''

سو ہم شاکر صاحب کے یہاں پہنچے۔ سبط حسن وہاں سچ مچ محرمی صورت لیے بیٹھے تھے۔ مراثی انیس کی جلد اس وقت انہیں بہت بڑی نعمت نظر آئی۔ کس رقت بھری کیفیت میں انہوں نے سوز خوانی شروع کی۔ بازو کے طور پر دائیں احمد مشتاق اور بائیں خورشید شاہد۔

بعد میں ایک گفتگو میں سبط صاحب نے مجھے بتایا کہ شروع عمر میں انہوں نے بہت سوز خوانی کی ہے اور یہ کہ وہ بہت اچھے سوز خواں تھے۔ یہ سن کر مجھے افسوس ہی ہونا تھا۔ اتنا اچھا سوز خواں مفت میں انقلاب کی نذر ہو گیا۔ کچھ ایسا ہی افسوس مجھے اس وقت ہوا تھا جب علی سردار جعفری کے مرثیوں کے کچھ اقتباسات میری نظر سے گزرے تھے۔ قدرت نے انہیں مرثیہ گو پیدا کیا تھا۔ انہوں نے ساری صلاحیت کو انقلابی نظموں کی راہ ضائع کر دیا اور لیجیے مجھے ایک اور انقلابی دوست یاد آ گیا' جس نے ایک پورا موسم عزا مولائی بن کر گزارا۔ یہ تھے اپنے صفدر میر۔ انہی دنوں جن دنوں مظفر علی سید کی فراہم کردہ مراثی انیس کی چار جلدیں ہم دوستوں کے درمیان گردش کر رہی تھیں صفدر کے ہاتھ میں ایک کتاب بہت نظر آتی تھی ''A Hero With A Thousand Faces'' ان دنوں جوزف کیمبل زیر مطالعہ تھا اور جب چائے کی میز پر مل کر بیٹھے تو صفدر کی طرف سے ایک سوال اٹھتا۔ اسلامی روایت کے پاس کوئی متھ (MYTH) نہیں ہے۔ کیوں نہیں ہے۔

میں نے ایک روز جل کر کہا کہ ''صفدر صاحب' آپ نے بہت شاعری پڑھی ہے' ذرا کبھی انیس کو بھی پڑھ کر دیکھیے' پھر بات ہو گئی کہ اسلامی روایت کے دامن میں کوئی متھ ہے یا نہیں ہے۔''

جواب میں صفدر صاحب نے مشتاق کے ہاتھ سے انیس کی جلد کو اچکا۔ فوراً ہی اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ ''یہ مجھ سے کل لے لینا۔''

اس کے بعد دوسری جلد۔ پھر تیسری جلد۔ پھر چوتھی جلد اور اب محرم کا بیچ تھا۔ شاید صفدر صاحب نے ان دنوں ایک دو مجلسوں میں بھی شرکت کی تھی۔ بہر حال شب عاشور ہماری پوری ٹولی ٹی ہاؤس سے نکلی اور موچی دروازے پہنچی۔ وہ ساری رات ہم نے اسی کوچہ

عزا میں گزاری۔ ہر عزاخانے میں جھانکا' ہر سبیل پر شربت پیا۔ حویلی قزلباس سے جب جلوس ذوالجناح برآمد ہوا تو ماتمیوں میں رلے ملے ہم بھی چل رہے تھے۔ صبح کی اذان ہونے لگی تو جلوس تھم گیا۔ نوحہ ماتم یکسر موقوف اور یہ بتانے کی شاید ضرورت نہیں کہ صبح عاشور کی اذان سے ایک پوری روایت وابستہ ہے جس نے اس اذان کو خاص معنویت دے دی ہے۔ روایت یہ ہے کہ یہ اذان حضرت علی اکبر نے دی تھی جو ہمشکل نبی تھے اور جن کی آواز بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی آواز سے مشابہ تھی۔ اس مضمون کو مرثیہ خوانوں نے خاص طور پر انیس نے اپنے اپنے رنگ سے باندھا ہے۔

''علی اکبر اذاں دو صبح کا تارا چمکتا ہے''

تو اذان ہو رہی تھی۔ ماتمی خاموش کھڑے تھے۔ کسی کسی نے گریہ شروع کر دیا تھا۔ اذان ختم ہوتے ہی زنجیر زن ماتمیوں نے حلقہ بنایا' نوحہ شروع کیا اور زنجیروں کا ماتم شروع ہو گیا۔ پنجابی نوحہ تھا۔ مضمون وہی کہ

''علی اکبر اذاں دو صبح کا تارا چمکتا ہے''

صفدر صاحب نے کھڑے کھڑے ایک دم جھرجھری لی۔ قمیص اتار کر اس طرح پھینکی کہ میرے منہ پر آ کر پڑی اور زن سے ماتمیوں کے حلقہ میں اور پتا نہیں کب کس طرح کس سے انہوں نے زنجیر حاصل کی۔ گھڑی بھر میں ان کی برہنہ پشت لہولہان ہو گئی۔ شاید صفدر صاحب کو اسلامی روایت میں وہ شے مل گئی تھی جس کی انہیں تلاش تھی۔

اگلے محرم کے آتے آتے ہماری وہ صحبت ہی بکھر گئی۔ سو پھر موچی دروازے کا رخ ہی نہیں کیا' مگر پھر تھوڑے برسوں بعد ہمارے ایک اور دانشور دوست کو یاد آیا کہ فیض صاحب دو کام پابندی سے کرتے ہیں' عید کی نماز اور موچی دروازے میں شب عاشور۔ عذر یہ ہے کہ یہ تو ہمارا کلچر ہے تو اس دوست نے تقاضا کیا کہ چلو ہمارے ساتھ موچی دروازے۔ یہ تھے اعجاز حسین بٹالوی۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر کتنے برسوں تک یہ رسم ادا کی بلکہ عزاخانوں میں جا کر ان کے ساتھ اگربتی موم بتی بھی سلگائی تا آنکہ وہ بھٹو کے مقدمے میں الجھ گئے اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اصل میں میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے تو جتنا ماتم مرثیہ کرنا تھا وہ میں نے بچپن لڑکپن میں کر لیا' اب ایک زمانے سے فارغ چلا آتا ہوں' لیکن اگر کوئی دانشور دوست اس راہ کی طرف کھنچتا دکھائی دے' کلچر' متھ' کسی بھی واسطے سے سہی میں چار قدم اس کے ساتھ ضرور چلتا ہوں۔ اس کا ثواب تو مجھے ملتا ہوگا۔ لیجئے ثواب پر مجھے اپنے دوست پروفیسر سجاد رضوی کا ایک خواب یاد آ گیا۔ سجاد رضوی ٹی ہاؤس اور حلقہ ارباب ذوق کی مخلوق تھے۔ غزلیں لکھیں' تنقیدی مضامین لکھے' ''صحیفہ'' کی اڈیٹری کی۔ اب ذاکر حسین ہیں۔ مجلس

خوب پڑھتے ہیں' مگر عزاداروں کو ان سے شکایت ہے کہ رلاتے نہیں۔ ہاں تو ایک وقت میں انہوں نے مجھے واقعہ کربلا کے حوالے سے ایک کتاب لکھنے پر اکسایا تھا۔ اسی ہنگام انہوں نے ایک خواب دیکھ لیا۔ اب خواب کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیسے وارد ہوتے ہیں بس وارد ہو جاتے ہیں۔

''مولانا'' میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ جیسے میں ایک مزار کے سرہانے کھڑا ہوں۔ خیال کچھ اس طرح کا کہ جیسے یہ امام کا مزار ہے۔ مزار کے اندر سے ایک ہاتھ نکلا۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ لاؤ' وہ انتظار حسین کی کتاب کہاں ہے؟''

بات آئی گئی ہوئی' مگر چند دنوں بعد موصوف آئے۔ کہا کہ ''مولانا میں نے وہ خواب پھر دیکھا ہے۔ پھر اسی طرح سے مزار سے ہاتھ نکلا ہوا ہے اور وہی آواز کہ انتظار حسین کی کتاب کہاں ہے۔''

میں نے سوچا' پھر سجاد رضوی سے کہا کہ ''اصل میں جس کتاب کا مولا کی طرف سے تقاضا ہے وہ وہ نہیں جو تم لکھوانا چاہتے ہو بلکہ اس ناول کے لیے ہے جو میں ''بستی'' کے نام سے لکھ رہا ہوں۔ واقعی اس میں تاخیر ہو گئی ہے۔ اب جلدی مکمل کرتا ہوں اور چھپواتا ہوں۔''

لو میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ذکر شاکر صاحب کا تھا۔ میں بتا رہا تھا کہ شاکر صاحب ان دنوں بھائیں بھائیں کرتے پرنسپلز ہاؤس میں اکیلے منہ لپیٹے پڑے رہتے۔ کوئی دوست آ جاتا تو منہ پر تھوڑی رونق آ جاتی۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہوں نے ایک گھر دیکھ لیا۔ کشور ناہید کا گھر۔ کشور ناہید سے دوستی بڑھی تو منہ پر رونق نظر آنے لگی اور اب لازم نہیں تھا کہ شاکر صاحب اپنے خانہ ویران ہی میں بیٹھ کر دوستوں کا انتظار کریں۔ آخر کشور کا گھر بھی تو تھا جو اب ماشاءاللہ بہت تیزی سے مرجع اہل ذوق بنتا جا رہا تھا۔ اب شاکر صاحب کا ٹھکانا یہ گھر تھا۔

مگر ایک شام اچانک شاکر صاحب کشور کے گھر جانے کے بجائے ٹی ہاؤس آ گئے۔ بہت دل گرفتہ تھے۔ رفتہ رفتہ کھلے۔ کشور کے یہاں جو کچھ بھی ہوا بہر حال اس کے سلوک سے نالاں تھے۔ احمد مشتاق کو ایسا موقعہ خدا دے۔ شاکر صاحب جو خود کہنا چاہتے تھے اور کہہ نہیں پا رہے تھے وہ بطرز احسن مشتاق نے کہا اور شاکر صاحب کو سمجھایا کہ اب تو آپ نے دیکھ لیا کہ وہ بی بی عزت داروں سے کیا سلوک کرتی ہے۔ سو اب اس گھر جانے سے توبہ کرو اور شاکر صاحب نے کان پکڑے اور توبہ کی۔

تو اب روز شام کو شاکر صاحب ٹی ہاؤس آ جاتے اور وہی ہمیشہ والا طریقہ کہ جس کی طرف سے دل پر میل آ جاتا اس کے خلاف خود آدھا فقرہ بولنا' باقی کا کام یاروں پر چھوڑ دینا جسے وہ تہہ دل سے انجام دیتے۔ یہاں مشتاق کے لیے ان کا بولا ہوا آدھا فقرہ بہت تھا۔ وہ بیان اس طرح مکمل کرتا کہ شاکر صاحب سمجھتے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا۔ یوں مشتاق کی زبان کی راہ مشتاق کے ساتھ

شاکر صاحب کے دل کا بھی غبار نکل جاتا اور مشتاق مطمئن کہ اب شاکر صاحب اس کوچہ میں نہیں جائیں گے۔

مگر ہوا یوں کہ روز شام کو آتے آتے ایک شام شاکر صاحب ٹی ہاؤس نہیں آئے' پھر دوسری شام بھی نہیں آئے' پھر جب تیسری شام بھی نہ آئے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے کہا کہ مشتاق شاکر صاحب لگتا ہے پھر اس طرف ہو لیے۔ مشتاق نے کھوج لگایا اور ہمارا شک درست نکلا۔

دنوں بعد جب شاکر صاحب ٹی ہاؤس آئے تو مشتاق نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ شاکر صاحب سنتے رہے' سنتے رہے پھر بے وقوفانہ سی ہنسی ہنسے اور اپنی صفائی میں بولے "یار' وہ کوفتے بہت اچھے بناتی ہے۔"

مشتاق کے سارے طعنے ایک طرف اور یہ بیان صفائی دوسری طرف۔ میں نے ابھی تک کشور کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کوفتے نہیں کھائے تھے' اس لیے میں بھی کیا کہہ سکتا تھا۔ خیر آگے چل کر وہ میں نے کھائے۔ اس کے سوا میں کہہ سکتا ہوں کہ کھانے کا معاملہ بھی حسن کا سا ہے کہ کچھ صاحب حسن میں ہوتا ہے کچھ دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ ذائقہ آدھا کھانے میں ہوتا ہے' آدھا کھانے والے کی زبان اور تالو میں ہوتا ہے۔ وہ یار بھی تو تھے جو اس دستر خوان پر سجی ہوئی قدر دانوں کی طرف سے آئی ہوئی ڈش کو بھی کشور کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ہنڈیا گردانتے اور ہونٹ چاٹتے تھے۔ اصل میں یہ کشور کے چولہے کی برکت اور ہاتھ کی لذت تھی کہ جو ڈش اس سے منسوب ہوگئی اس میں ایک نرالا سواد پیدا ہوگیا۔ بہر حال کچھ تو تھا کہ یہ دستر خوان پھیلتا چلا جا رہا تھا حتیٰ کہ کرشن نگر کا گھر چھوٹا پڑ گیا۔ پھر کشور کو اس دم بدم پھیلتے دستر خوان کی خاطر اقبال ٹاؤن جا کر نیا گھر تعمیر کرنا پڑا۔ پھر تو یوں لگا کہ شہر میں اگر کوئی گھر ہے تو کشور کا گھر ہے اور کوئی دستر خوان ہے تو کشور کا دستر خوان ہے۔ الف لیلیٰ کی ایک کہانی میں خلیفہ ہارون رشید کا ذکر یوں آیا ہے کہ وہ روز شام کو بھیس بدل کر بغداد کے اس دروازے کی طرف نکل جاتا جس دروازے سے مسافر شہر میں داخل ہوتے وہ کسی ایک مسافر کو اپنے مہمان کے طور پر پسند کرتا اور محل میں لا کر اس کی تواضع کرتا۔ کشور کو بھی اپنے وقت کی خلیفہ ہارون رشید سمجھو۔ مسافر نواز ایسی کہ کسی مسافر کو دعوت کے بغیر شہر سے واپس نہیں ہونے دیا۔ شروع میں ضرور اس نے مسافر تلاش کیے ہوں گے' مگر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ مسافر کو لاہور میں قدم رکھنے کے بعد خود ہی پتا چل جاتا تھا کہ شجر سایہ دار کہاں ہے۔ وہ خود ہی سونگھتا سونگھتا اس در پہ پہنچ جاتا تھا۔ مسافر کے نام چوہے کا بچہ بھی لاہور میں داخل ہو جاتا تو کشور اسے آنکھوں پہ بٹھاتی اور کس کس قماش کا مسافر کس کس نگر سے کھنچ کر یہاں پہنچتا اور سیدھا جا کر کشور کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتا۔ اب تو لگتا تھا اور مسافروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس دستر خوان کی مہک ادھر نہر سویز کو عبور کر کے اور ادھر واہگہ کو پار کر کے کس کس دیس تک گئی ہے۔ ایک دو دفعہ اسلام آباد گیا تب بھید کھلا کہ مسافر کیوں اب لاہور کا رخ

نہیں کرتا۔ لاہور کا پانی تو اسلام آباد بہہ گیا۔ مسافروں کا رخ اب اس نگر کی طرف ہے۔

لیجئے خلیفہ ہارون رشید کا حوالہ آیا تو مجھے کشور کی ایک اور شاہانہ نسبت یاد آ گئی۔ اس نسبت کے انکشاف سے پہلے میں یہ بتاتا چلوں کہ ''مشرق'' کی کالم نگاری کے زمانے میں میرا شہر کے نجومیوں سے اچھا خاصا ربط وضبط تھا۔ مال کے فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا ایک نجومی تو اپنے نجوم سے زیادہ میرے کالم کی تاثیر کا قائل ہو گیا تھا۔ ایک روز دفتر آیا اور نوٹوں کی ایک گڈی میرے سامنے رکھ دی۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے سٹپٹا کر پوچھا۔

''انتظار صاحب جی' بہت دن ہو گئے' ایک کالم اور لکھ دیں' آج کل کام مندا جا رہا ہے۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو بولا ''صاب جی' اس ویلے تو میرے پاس اتنی ہی رقم تھی۔ کالم کے بعد کام ذرا چمکے گا تو پھر اور خدمت کروں گا۔''

ایک نجومی صاحب پنڈی میں تھے جو غازی منجم کہلاتے تھے۔ غازی صاحب وقتاً فوقتاً مجھے اپنی پیش گوئیوں سے نوازتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی طرف سے مجھے ایک عجب زائچہ موصول ہوا۔ یہ کشور کا زائچہ تھا۔ زائچہ میں بتایا گیا تھا کہ اس نیک ساعت میں جب کشور بحالت عدم رحم مادر میں آئی تو زحل مشتری کے قریب آتے آتے چار درجے کے فرق پر رہ گیا تھا۔ اگر زحل نے یہ چار درجے بھی عبور کر لیے ہوتے تو کشور ناہید کو صاحب قرآن کا مرتبہ حاصل ہو جاتا۔

ہماری تاریخ میں دو صاحب قرآن گزرے ہیں۔ صاحب قرآن اول امیر تیمور' صاحب قرآن ثانی شاہجہان بادشاہ۔ ایک نے کھوپڑیوں کے مینار کھڑے کیے۔ دوسرے نے تاج محل تعمیر کیا۔ کشور صاحب قرآن ثالث بنتے بنتے رہ گئی۔ پتا نہیں اس صورت میں وہ کیا گل کھلاتی۔ بہرحال اب صورت یہ ہے کہ اس کے یہاں یہ دونوں شوق جلالی اور جمالی چار درجہ کے فرق کے ساتھ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ حسرت تعمیر اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ انتھک کام کرتی ہے جس کام کو ہاتھ لگاتی ہے' جس دفتر میں جا کر بیٹھتی ہے اسے اس کے ذوق عمل سے چار چاند لگ جاتے ہیں' مگر عملہ کی کمبختی آ جاتی ہے۔ سو کشور کے ذوق تعمیر کے ساتھ وہیں کہیں آپ کو ایک چھوٹا موٹا کھوپڑیوں کا مینار بھی کھڑا نظر آئے گا۔

غازی صاحب نے چار درجوں کے فرق کو دور کرنے کا ایک نسخہ تجویز کیا تھا۔ انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ کشور ناہید سے کہو کہ وہ بطخوں کا ایک جوڑا پال لے۔ اس کے اثر سے چار درجوں کا یہ فرق دور ہو سکتا ہے۔ میں نے ازراہ مصلحت کشور کو یہ نسخہ نہیں بتایا۔ وجہ ظاہر ہے مجھے دو کھوپڑیاں بہت عزیز تھیں' شاکر علی کی کھوپڑی اور زاہد ڈار کی کھوپڑی۔

غازی منجم کا کہنا کہ کشور کے جتنے ستارے ہیں وہ سب مذکر ہیں۔ سیارہ بہرام مذکر، زحل مذکر، مشتری مذکر، اور اس سے اس منجم نے یہ نتیجہ نکالا کہ کشور کی چال ڈھال، بات چیت اور جملہ خواص خالصتاً مذکر ہیں، البتہ جسمانی بناوٹ مونث ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ کشور اپنی جسمانی بناوٹ سے مار کھا گئی۔ سمجھ لیجئے کہ یہاں بھی چار درجہ پیچھے رہ گئی ورنہ کامل مذکر ہوتی اور پوری امیر تیمور۔ مگر صاحب آدمی کامل کہاں ہوتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی کسر رہ جاتی ہے۔ امیر تیمور کہاں کا کامل تھا اور نہیں تو اس کی ٹانگ میں نقص پیدا ہو گیا۔ یہاں صیغہ میں تھوڑی کسر رہ گئی۔

مگر شاید یہ بھی وقت کی ضرورت تھی۔ یہ کشور کے مذکر ستاروں ہی کا تو فیضان ہے کہ وہ آزادی نسواں کے لیے اتنی مردانہ وار لڑ رہی ہے۔ تحریک آزادی نسواں کی جو دوسری فعال کارکن ہیں شاید ان سب ہی کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے ستاروں میں مذکر ستارے زیادہ ہیں۔ ان ستاروں کے زور پر وہ آزادی نسواں کے معاملہ کو آگے دھکیل رہی ہے۔ یہ آگے دھکیلنے کی بات میں نے کشور ہی کی معرفت بریخت سے مستعار لی ہے۔ ''فتنہ سامان دل'' کی تقریب میں اسلم اظہر تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے بریخت کے کھیل سے ایک مکالمہ نقل کیا۔ پادری صاحب گیلی لیو سے کہتے ہیں کہ سچ اگر سچ ہے تو وہ اپنی راہ خود کیوں نہیں بناتا۔ گیلی لیو جواب دیتا ہے کہ سچ اتنا ہی آگے بڑھتا ہے جتنا ہم اسے آگے دھکیلتے ہیں۔ اسلم اظہر کا مطلب یہ تھا کہ کشور اپنی شاعری سے سچ کو آگے دھکیل رہی ہے۔ مگر کشور بے چین روح ہے۔ اس نے دیکھا کہ شاعری اس معاملہ میں ہیٹی ہے۔ اس کے ذریعہ سچ کو زیادہ آگے نہیں دھکیلا جا سکتا۔ تب وہ نثر میں رواں ہوئی۔ نثر کی کارکردگی سے بھی مطمئن نہ ہوئی تو سیدھی میدان عمل میں کود پڑی اور ویمن ایکشن فرنٹ میں جت گئی۔ اس وقت سے نسوانی سچ کو بڑی تیزی سے آگے دھکیل رہی ہے۔

کشور عورتوں کی آزادی کی بہت بڑی علمبردار ہے۔ اس مقصد سے مردوں سے لڑنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہے۔ مگر مردوں کی بھی وہ دشمن نہیں ہے۔ مفید مشوروں سے انہیں بھی نوازتی ہے۔ مجروح سلطان پوری لاہور مشاعرہ پڑھنے آئے تو تنت وقت پہ ایک مشورہ دیا۔ کان میں کہا کہ مجروح صاحب، یہ فیض کا شہر ہے، یہاں گل و بلبل والی غزل نہیں چلے گی۔ اسے کراچی کے لیے اٹھا رکھئے۔ یہاں کوئی دار و رسن والی غزل سنائیں۔ مگر مجروح صاحب نے اس مشورے پر عمل کرنے کو اپنی مردانہ غیرت اور شاعرانہ انا کے خلاف جانا۔ ہر پھر کر گل و بلبل والی غزلیں ہی پڑھیں۔ نتیجہ یہ کہ فلاپ ہو گئے۔

اس میں کشور کی کیا خطا تھی۔ اس نے تو مجروح صاحب کے ساتھ ہمدردی کی تھی اور پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ ہمدردی اور خدا ترسی کا جذبہ کشور میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ دوستوں کی دوست نہیں بھی ہو تو مشکل کے وقت دوست بن جاتی ہے بلکہ مشکل ہی کے وقت دوست بنتی ہے۔ یہی تو مشکل ہے کہ کشور کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے آدمی کو کوئی نہ کوئی مصیبت مول لینی پڑتی ہے۔

آسان طریقہ یہ ہے کہ بیمار پڑ جاؤ۔ گلدستہ تو خیر بیماری کے پہلے ہی دن پہنچ جائے گا۔ بیماری کے دوران گلدستہ پہنچنا اور شفایابی پر کیک کاٹنا یہ تو معمول کی بات ہوئی۔ اصل کشور ناہید اس وقت اپنا چہرہ دکھاتی ہے جب ادیب اس طرح بیمار پڑے کہ اس کے پاس علاج کے لیے پیسے نہ ہوں۔ بس پھر کشور سرگاڑی پیر پہیہ ایک کر دیتی ہے اور پھر روپوں کی تھیلی مریض کے سرہانے ہوتی ہے اور ہسپتال کے بڑے ڈاکٹروں کی توجہ خاص اسے حاصل ہوتی ہے۔ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب ادیب شفایاب ہو جاتا ہے اور شفایاب کا کیک کٹ جاتا ہے' کیونکہ اس کے فوراً بعد ہی شفایاب ادیب کے تعلقات کشور سے کشیدہ ہو جاتے ہیں' جیسے شفا پانے کے بعد حبیب جالب سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ خوش حال اور صحت مند ادیب کشور کو وارا نہیں کھاتے اور چونکہ اب وہ زمانہ نہیں جب ادیب پریشان حال رہتے تھے اور بالعموم تپ دق کے مرض کا شکار ہو جاتے تھے۔ جب اس کمرشلزم کے زمانے میں وہ خوب کما رہے ہیں اور ماشاءاللہ ان کی صحتیں بھی اچھی ہیں' اس لیے بالعموم کشور کی ان سے اور ان کی کشور سے نہیں بنتی۔

اے لو میں دوستوں کا ذکر کیے چلے جا رہا ہوں اور ادھر حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں جنگ سر پہ تلی کھڑی ہے۔ دیواروں پہ' کاروں پہ جہاں دیکھو لکھا ہوا ہے۔ کرش انڈیا (Crush India) وہ رمضان کے دن تھے۔ ایک افطار پارٹی میں اپنی کالم نگاری کے واسطے سے شریک تھا۔ میرے برابر ''ڈان'' والے نثار عثمانی بیٹھے تھے۔ میرا یہ طور چلا آتا تھا کہ جب بھی ان سے مڈھ بھیڑ ہوتی تو قومی صورت حال کے بارے میں ان کی رائے مانگتا۔ استفسار کرتا کہ کیا ہو رہا ہے' کیا ہونے والا ہے۔ بس اسی قسم کی ایک ڈیڑھ بات اس وقت بھی ان سے ہوئی۔ مگر انہوں نے ساری بات چھوڑ کر اچانک مجھ سے ایک عجب سوال کیا ''انتظار صاحب' آپ نے ان دنوں کوئی خواب دیکھا ہے۔''

میں ہکا بکا کہ انہوں نے یہ کیا سوال کیا ہے۔ مگر پھر جلدی ہی میں نے اپنی حیرت پر قابو پایا اور پھر جواب دیا ''ہاں دیکھا تو ہے۔''

''سنایئے' پھر میں آپ کو اپنا خواب سناؤں گا۔''

میں نے اپنا خواب سنایا۔ ان کا خواب سنا۔ پھر تعجب سے کہا کہ ''عثمانی صاحب' ان دونوں خوابوں میں کتنی مشابہت ہے اور دونوں ہی کچھ مہاجرانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ ان کی تعبیر آپ کیا کریں گے۔''

''تعبیر تو اچھی نہیں ہے۔ بس آپ دعا ہی کریں کہ پاکستان کسی طرح بچ جائے۔''

بس اسی آن افطار کا وقت ہو گیا۔ ہم کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔ مگر اندر ہی اندر مجھے تھوڑی سی کرید تھی۔ میں نے کھاتے

کھاتے پوچھا ''عثمانی صاحب' آپ نے کسی اور سے بھی یہ سوال کیا ہوگا۔ وہاں سے کیا جواب آیا؟''

''نہیں' کسی سے نہیں کیا' نہ کسی کے سامنے اپنا یہ خواب بیان کیا۔ بس اس وقت یونہی خیال آ گیا کہ آپ سے پوچھا جائے۔''

اور اب مجھے وہ تاریخی شام یاد آ رہی ہے جب میں مال روڈ پر چلتے چلتے ان کے دفتر کی طرف مڑ گیا۔ اس وقت آئی اے رحمن بھی وہاں موجود تھے۔ میں نے وہی سوال کیا جو ان دنوں ہر کسی کی زبان پر تھا۔

''اس وقت آپ دو سیاسی مبصر جمع ہیں۔ یہ بتایئے کہ کیا واقعی جنگ ہوگی؟

نثار عثمانی خاموش رہے۔ رحمن صاحب نے بڑے تیقن سے کہا۔ ''نہیں'' اور پھر انہوں نے دلائل دینے شروع کیے۔

رحمن صاحب بڑی سیاسی سمجھداری کے ساتھ بات کرتے ہیں۔ میں نے جب بھی جس محفل میں بھی انہیں سنا ان کے استدلال سے قائل ہو کر اٹھا۔ اس وقت انہوں نے بڑی تفصیل سے پوری صورت حال کا تجزیہ کیا اور نتیجہ یہ نکالا کہ جنگ نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنی پیالی ختم کی' اطمینان کا لمبا سانس لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

مگر جب میں نے اپنی گلی میں قدم رکھا تو کچھ لڑکے شور مچا رہے تھے ''جنگ بج گئی' جنگ بج گئی۔''

میں نے دل ہی دل میں تحقیر سے کہا کہ ان لڑکوں کی عمریں دیکھو اور ان کی جنگی جنون دیکھو۔ ان کا بس چلے تو واقعی جنگ شروع کرا دیں' مگر جب میں نے قدم رکھا تو دیکھا کہ عالیہ سخت پریشان بیٹھی ہیں۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''تمہیں پتا نہیں ہے' جنگ شروع ہو گئی ہے۔''

''جنگ شروع ہو گئی' کون کہتا ہے۔ یہ جو لڑکے باہر شور مچا رہے ہیں' ان کے کہنے میں آ گئیں۔''

''ریڈیو نے ابھی ابھی اعلان کیا ہے۔''

میں نے جلدی سے ریڈیو لگایا۔ جنگ کے سلسلہ میں شہریوں کو ہدایات دی جا رہی تھیں۔ بلیک آؤٹ شروع تھا۔ باہر سے آوازیں آ رہی تھیں ''لائٹ بجھاؤ' لائٹ بجھاؤ۔''

تو جنگ واقعی شروع ہو گئی ہے۔ میں نے بے بسی سے سوچا۔

◆◆◆

آدھا پاکستان نیا پاکستان

پاکستان ٹوٹ چکا تھا اور ناصر کاظمی ہسپتال میں پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ محفلوں اور صحبتوں کا رنگ اور سے اور ہو گیا تھا۔ پاکستان کونسل میں اب جو بھی جلسہ ہوتا' اس میں ہر پھر کر وہی ایک مسئلہ' وہی ایک تشویش کہ جنگی قیدی کب آئیں گے' کیسے آئیں گے؟ اب یہاں ایسی خواتین بڑی تعداد میں نظر آتی تھیں جو پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں۔ یہ اسیر فوجی اور سول افسروں کی بیویاں' بیٹیاں تھیں۔ مقرروں میں بھی وہی پیش پیش ہوتی تھیں۔ کتنے گھر اس سانحہ سے متاثر ہوئے تھے۔ میں کراچی گیا تو اپنی بہن کے گھر کا عجب نقشہ دیکھا۔ ہماری بہن صبح گھر سے نکلتیں اور سارا دن قریب کے امامباڑے میں ماتم مرثیے میں گزارتیں۔ ہمارے بہنوئی گھر میں جانماز پر بیٹھے وظیفے دعائیں پڑھتے رہتے۔ ہمارا بھانجا حسن ظہیر بریلی کیمپ میں رنج اسیری کھینچ رہا تھا۔ پاکستان کے اور بھی کتنے گھر ہوں گے جن کا کم وبیش یہی نقشہ ہوگا۔ کتنے اسیری کھینچ رہے تھے۔ کتنے گم تھے' کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس رستخیز بے جا میں مارے گئے یا بچ کر کہیں نکل گئے۔ نکلے تو کس طرف نکلے؟ نیپال کی طرف یا برما کی طرف۔

گھروں میں' محفلوں میں' جلسوں میں سوگ کی فضا تھی اور ناصر کاظمی کی حالت بگڑتی چلی جا رہی تھی۔ یکم مارچ 1972ء کو صبح منہ اندھیرے جب ابھی چڑیوں نے بولنا شروع کیا تھا' وہ درختوں اور چڑیوں کی اس دنیا سے سدھار گیا۔ پاکستان اور ناصر چند مہینوں کے فرق سے بس آگے پیچھے گئے یعنی وہ پاکستان جس میں' میں نے 1947ء کے آتے جاڑوں آ کر قدم رکھا تھا اور بنگالی جس کا جزو لاینفک تھے اور اس نئے ملک کی اکثریت تھے۔ اب جو پاکستان تھا' وہ تو بھٹو صاحب کے دیئے ہوئے نام کے مطابق نیا پاکستان تھا اور اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ ناصر جب ڈھاکہ اور ڈھاکہ کے آس پاس کی بستیوں میں گھوم پھر کر واپس آیا تو کتنا گرمجوش نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس ہری بھری دھرتی نے اس کے تخیل کو نئے سرے سے تازہ کر دیا ہے۔ ''یار'' وہ مجھی خوب آدمی تھا۔ کہنے لگا کہ ''جی میرا باپ مکھی تھا۔''

''مکھی۔'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''جی' ویسے تو وہ آدمی تھا۔ بس مکھی بن گیا۔''

''کیسے بن گیا؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگا ''پتہ نہیں چلا جی' کیسے بن گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے مکھی بنا۔ بس کھڑا تھا۔ اچانک میرے دیکھتے ہی دیکھتے بن گیا۔ میں دیکھتا رہ گیا۔''

ایسی کتنی باتیں اس نے مجھے جلدی جلدی سنا ڈالیں۔ یہ 1959ء کا ذکر ہے۔ رائٹرز گلڈ نیا نیا قائم ہوا تھا۔ ادیبوں کا ایک لمبا چوڑا قافلہ مشرقی پاکستان کے سفر پر روانہ ہوا۔ ناصر بھی اس قافلہ میں تھا۔ میں کوتاہ قدم نکلا۔ میرے قدم اس سفر پر نہیں اٹھے۔ ہاں پھر میں نے 1967ء میں پاکستان کونسل کی طرف سے وہاں کا پھیرا لگایا۔ ڈھاکہ اور راجشاہی کو چھوا اور آ گیا۔ اس وقت ڈھاکہ پاکستان کا شہر تھا اور مشرقی پاکستان کا صدر مقام۔ اب پچھلے برسوں میں سمجھ لیجئے کہ 1997ء میں ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے ڈاکٹر مبشر حسن کے قافلہ کے ساتھ اس دیار میں گیا تو ڈھاکہ اب بنگلہ دیش کی راجدھانی تھا۔ میں اس شہر میں اچھی طرح تو ایک ہی جوان کو جانتا تھا' غلام محمد کو یا ناول نگار شوکت عثمان سے سرسری تعارف تھا۔ ہاں ایک تیسری شخصیت بھی ہے مگر اس کا ذکر میں ذرا بعد میں کروں گا۔ غلام محمد کو میں اس وقت سے جانتا تھا جب 1962-1963ء میں' میں ادب لطیف کی ادارت کر رہا تھا۔ اس عزیز کے افسانے پسند کر رہا تھا اور چھاپ رہا تھا۔ ملاقات اس سے میری 1971ء میں ہوئی' جب وہ اس پر آشوب زمانے میں کسی سرکاری کام سے لاہور آیا اور چلتے چلتے مجھ سے بھی ملا۔ مشرقی پاکستان میں دندناتی ہوئی مغربی پاکستانی مخلوق سے سخت برگشتہ تھا' نزلہ گرا غریب اردو پر۔

''میں نے طے کیا ہے کہ اب میں اردو میں نہیں لکھوں گا۔'' اس نے اپنا یہ فیصلہ مجھے سنایا اور چلا گیا اور واقعی اس کے بعد اس کی کوئی اردو تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔ اگرچہ اس قیامت کے گزر جانے کے بعد کتنے ہی خط مجھے موصول ہوئے مگر اس کے پاس ایسے ٹیڑھے سوال تھے جن کے جواب میرے پاس نہیں تھے۔ سو میں ہی جواب سے کنی کاٹ گیا۔ ڈھاکہ پہنچنے پر میں نے اسے تلاش کیا اور ملاقات کی۔ اب اس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ دل کو مرض لگا لیا تھا۔ بنگلہ میں بھی لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ بس انگریزی میں صحافت کرتا تھا۔ پہلے پاکستان سے خوش نہیں تھا' اب بنگلہ دیش سے ناخوش تھا۔ بتانے لگا کہ میں نے طے کیا ہے کہ بنگلہ دیش چھوڑ دوں اور امریکہ جا کر جہاں میرا بیٹا ہے' آباد ہو جاؤں۔''

غلام محمد نے میری ملاقات اپنے دوست فرہاد مظہر سے کرائی۔ فرہاد مظہر آگے مکتی باہنی کے سرگرم کارکن تھے۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ان کی سوچ میں تبدیلی آئی۔ اب ایک تحریک چلا رہے ہیں کہ بنگلہ زبان میں فارسی عربی کا جتنا بھی رنگ ہے' الفاظ اور تلمیحات ہی کے واسطے سے سہی' اسے فروغ دینا چاہیے کہ اس زبان کا اسلامی روایات سے رشتہ پختہ ہو۔

فرہاد مظہر اردو سے یکسر نا آشنا' مگر ان کی بیگم فریدہ اختر فر فر اردو بول رہی تھیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ دیکھئے میں ڈھاکہ آیا۔ آپ

دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ ایک ملاقات نہیں ہوسکی۔ شہید اللہ قیصر کی بیگم سے ملنا چاہتا تھا مگر ان کا مجھے اتا پتہ ہی نہیں ملا۔

''آپ پنا قیصر کو کیسے جانتے ہیں؟''

میں نے بتایا کہ اس خاتون کو میں نے کیسے جانا۔ کھٹمنڈو میں بھی ایسا ہی ایک سیمینار منعقد ہوا تھا۔ میں وہاں پہنچا ہوا تھا۔ وہ بھی آئی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کی پیاری سی بیٹی شومی۔ 1971ء کے پرآشوب دنوں میں یہ المناک خبر تو ہم سب ہی نے اخباروں میں پڑھی تھی کہ ڈھاکہ میں بنگالی دانشوروں کی ایک پوری ٹولی کو اکٹھا قتل کر دیا گیا مگر اخبار میں واقعہ کو خبر کے طور پر پڑھنا ایک بات ہے لیکن جس پر بیتی ہو اس کی زبان سے سننا' اس کا اثر ہی کچھ اور ہوتا ہے اور پھر پنا قیصر کا جذبات سے لبریز بیان کہ کس طرح رات گئے ان کے دروازے پر دستک ہوئی اور کس طرح شہید اللہ قیصر کو لے جایا گیا اور کس طرح وہ شوہر کو ڈھونڈنے گھر سے نکلیں اور کہاں جا کر کس حال میں شوہر کو پایا۔ ''میری شادی کو ابھی دو سال ہوئے تھے اور شومی' شاید وہ گود میں تھی۔''

جب تقریر ختم ہوئی تو سننے والوں پر سناٹا طاری تھا۔ کتنی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

میرا اتنا کہنا کافی تھا کہ میں تمہارے ابو کو غائبانہ جانتا ہوں۔ ایک مشہور پاکستانی صحافی کی حیثیت سے اور ایک ناول نگار کی حیثیت سے (مصنف ملاح) بس میں شومی کے لیے اب انکل تھا۔ اس نے چلتے چلتے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا۔ شومی قیصر' ٹی وی کی ڈرامہ آرٹسٹ۔ تاکید کی کہ جب کبھی ڈھاکہ آنا ہو' ہم سے ضرور ملیں۔

مجھے اگر ذرا بھی گمان ہوتا کہ میرے لیے ڈھاکہ جانے کا بہانہ نکل آئے گا تو میں وہ کارڈ سنبھال کر رکھتا۔

''پنا قیصر اب پارلیمنٹ کی ممبر ہیں۔ مصروف بہت رہتی ہیں۔'' فریدہ اختر بتانے لگی' پھر اچانک اٹھی۔ جا کر فون کا ڈائل گھمایا۔ بنگلہ میں کچھ باتیں کیں' پھر مجھے بلایا ''لیجیے' بات کیجیے۔''

''کس سے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پنا قیصر سے۔''

میں شرمندگی کا اظہار کر رہا ہوں کہ آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی اور صبح میں جا رہا ہوں اور وہ کہہ رہی ہیں ''مجھے آج ہی شومی نے بتایا۔ اس نے آپ کو ٹی وی پر دیکھا تھا۔''

پھر وہی تاکید کہ اب کے آپ ڈھاکہ آئیں تو ضرور ملیں میں پھر شد و مد سے وعدہ کرتا ہوں۔

اور ہاں قیصر نے 1971ء کے ڈھاکہ کا جو خون آشام نقشہ کھینچا تھا' وہ یہاں آ کر میں نے اس میوزیم میں دیکھا جو بنگلہ دیش

نے یہ سوچ کر قائم کیا ہے کہ مبادا وہ اپنی تاریخ کے اس خونیں باب کو فراموش کر دیں۔ اس وقت کی کھینچی گئی تصویریں یہاں آویزاں ہیں۔ ہر تصویر اس وقت کی المناک کہانی اس طرح سناتی نظر آتی ہے کہ 1947ء کے فسادات کی وحشت و بربریت اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔

اگلے دن سیمینار میں میرے برابر ایک نیا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ باہمی تعارف ہوا۔ وہ تاریخ کے آدمی تھے اور اس ریسرچ سنٹر کے ڈائریکٹر جو بنگلہ دیش کی تحریک کے عوامل و محرکات اور واقعات و حادثات کی تحقیق کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے اس میوزیم کے بارے میں پوچھا۔

''جی ہم کل ادھر گئے تھے۔'' پھر میں نے مناسب لفظوں میں اپنے افسوس اور دکھ کا اظہار کیا' تامل کیا۔ پھر کہا ''مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیا؟''

''اسی میوزیم کے ایک گوشے میں 1940ء کے اس جلسہ لاہور کی بھی تصویر آویزاں تھی جس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ وہ اکیلی تصویر ان تصویروں کے بیچ عجب سی لگتی ہے۔''

اس پر وہ چپ رہے۔ میں نے تامل کیا۔ پھر کہا ''اگر یہ تصویر یہاں آویزاں ہے تو پھر ایک اور تصویر بھی یہاں آویزاں کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اس وقت کی تصویر جب برصغیر کے مسلمان زعماء 1906ء میں اسی شہر میں اکٹھے ہوئے تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہوئی تھی۔ پتہ چلنا چاہیے کہ جس تاریخ کا یہ انجام ہے' اس کا آغاز بھی اسی شہر سے ہوا تھا۔ وقت کی بوالعجبی۔ آغاز کیا تھا' انجام کیا ہوا ہے۔''

وہ رکے' پھر سرسری بولے کہ ''وہ تصویر اب کہاں محفوظ ہے؟'' اور پھر ہم دوسری باتیں کرنے لگے۔

ڈھاکہ سے ہماری رخصتی کی صبح آن پہنچی۔ صبح ہی صبح غلام محمد کی ہمراہی میں شوکت عثمان آن پہنچے۔ لیجئے ان سے تو ملاقات ہو گئی۔ سب پاکستانی ہم عصروں کو یاد کیا۔ ایک ایک کو سلام کہا' خدیجہ مستور کو بھی۔

''خدیجہ مستور کو میں آپ کا سلام کیسے پہنچاؤں گا؟''

''کیوں نہیں پہنچاؤ گے؟''

''کتنے برس ہو گئے' انہیں دنیا سے سدھارے ہوئے۔''

''اچھا؟ یہ واقعہ گزر گیا اور یہاں ہمیں معلوم ہی نہیں۔''

میں واپس آ کر آہستہ آہستہ ان کے ہم عصروں کو ابھی ان کا سلام پہنچا رہا تھا کہ ان کے انتقال کی خبر آ گئی۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ غلام محمد کے سدھار جانے کی بھی خبر پڑھ لی۔

لو میں کدھر نکل گیا۔ ذکر یہ ہو رہا تھا کہ ناصر بنگال کی دھرتی سے کتنا اثر لے کر آیا تھا۔ پھر جب فوجی ایکشن شروع ہوا اور نوبت علیحدگی تک پہنچی تو اس بیچ اس نے کس درد سے اس سرزمین کو یاد کیا

جنت ماہی گیروں کی
ٹھنڈی رات جزیروں کی
سبز سنہرے کھیتوں پر
پھواریں سرخ لکیروں کی
اس بستی سے آتی ہیں
آوازیں زنجیروں کی

یہاں تک آئے ہیں چھینٹے لہو کی بارش کے
وہ رن پڑا ہے کہیں دوسرے کنارے پر
یہ ڈھونڈتا ہے کسے چاند سبز جھیلوں پر
پکارتی ہے ہوا اب کسے کنارے پر
وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے
وہ دل میں کھبنے والی آنکھیں کیا ہوئیں
وہ ہونٹ مسکرانے والے کیا ہوئے

بس اسی لہجہ میں بولتے بولتے اس نے آنکھیں موند لیں اور ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔

ناصر گیا تو ناصر کے پیچھے پیچھے کئی اور شاعر چلے گئے۔ بس ہفتے ہی کے اندر اندر باقی صدیقی گئے' یوسف ظفر گئے۔

مگر مجھے ان کے سوا ایک اور موت یاد آ رہی ہے جو تھوڑے وقفہ کے بعد ہوئی۔ استاد امانت علی کی موت۔ اور اس موت سے شاید چھ سات دن پہلے کی ایک ملاقات۔ شام کو میں ٹی ہاؤس گیا تو دیکھا کہ استاد امانت علی آئے بیٹھے ہیں اور سخت غصے میں ہیں۔

''انتظار صاحب' میں ایک پریس کانفرنس کرنے والا ہوں۔ آپ کو اس میں آنا ہے۔

''حاضر ہوں گا۔ مگر پریس کانفرنس کس تقریب میں۔''

''بس میں یہ ملک چھوڑ رہا ہوں۔''

''خیر تو ہے۔''

''یہ لوگ میرے فن کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔ میں پریس کانفرنس میں اعلان کر دوں گا اور ملک سے نکل جاؤں گا۔''

''کون لوگ۔''

''یہ پی ٹی وی والے۔ کہتے ہیں کہ غزلیں گاؤ' ترانے گاؤ۔ میں کہتا ہوں' اور میرا محبوب راگ باگیشری' خیال' جے جے ونتی۔ اس پر انہیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔ تو میرا فن تو مر جائے گا۔ میں پریس کانفرنس میں یہ بتاؤں گا۔''

بس یہ کہتے کہتے استاد اٹھے اور تیزی سے نکل گئے۔ میں سمجھا کہ یہ وقتی غصہ تھا۔ شاید نشہ چڑھ گیا تھا۔ اتر جائے گا۔ مگر موسیقار بات کا پکا نکلا۔ سچ مچ ملک چھوڑ گیا۔ اور گیا بھی کون سے ملک۔۔۔۔۔۔۔ ملک عدم۔

مگر یہ اکیلے امانت علی خاں کا المیہ نہیں تھا۔ ان دنوں سب ہی پکا گانے والے مشکل حالات سے دو چار تھے۔ وہ جو ابھی ذکر تھا کہ افتخار جالب نے راگ درباری کو اور اس واسطے ساری کلاسیکی موسیقی کو درباروں کی یادگار اور زوال پسندی کی نشانی بتایا تھا وہ ایک فرد کی رائے نہیں تھی۔ اس وقت کے انقلابی ٹولہ کا نقطہ نظر یہی تھا۔ عوامی موسیقی' عوامی آرٹ' عوامی ادب' یہ ان کا تکیہ کلام تھا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو انہوں نے جانا کہ اب اس تصویر کو روبعمل لانے اور ثقافتی انقلاب برپا کرنے کا سنہری موقع مہیا ہو گیا ہے۔ اصل میں اس وقت انقلابی دانشور بہت اونچی ہواؤں میں تھے۔ ہم ایسے کالے آدمیوں سے بات ہی نہیں کرتے تھے۔ سمجھ رہے تھے کہ انقلاب آ چکا ہے۔ یہ تو آگے چل کر کھلا کہ بھٹو صاحب کتنے انقلابی اور کتنے عوامی ہیں۔ بہر حال اقتدار کے شروع کے دنوں میں تو ان کا یہ امیج برقرار تھا' ہر چند کہ نیو کیمپس ہال کے بھرے جلسہ میں حسین نقی کا ان سے مچیٹا ہو چکا تھا۔ اور وہ تو یہ کہئے کہ اللہ نے بھٹو صاحب کے دل میں نیکی دی کہ انہوں نے پولیس کو تنت وقت پہ روک دیا ورنہ اس عزیز کی مشکیں تو کسی گئیں تھیں۔

بہر حال ثقافتی معاملات میں تو انقلابی گروہ کی لائن اچھی خاصی چلی۔ خاص طور پر عوامی موسیقی کا سلوگن اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ انہیں دنوں الحمرا آرٹ کونسل کی چیرمینی سے جسٹس رحمن رخصت کئے گئے تھے۔ اب اس کرسی پر انور سجاد رونق افروز تھے۔ چھوٹتے ہی ایک پریس کانفرنس بلائی اور عوامی موسیقی کے فروغ کا ایک پورا منصوبہ پیش کر ڈالا۔ میں نے بصد ادب اس عزیز سے پوچھا کہ اس منصوبے میں روشن آراء بیگم اور نزاکت علی سلامت علی کے لیے بھی کوئی جگہ ہے۔ اس نے رعونت سے جواب دیا کہ دیکھیں گے۔

اس پر استاد امانت علی خاں کا ردعمل تو آپ نے دیکھ لیا۔ روشن آراء بیگم کی بھی سن لیجئے۔ ان کا ایک مراسلہ اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ 14 اگست 1972ء کو پی ٹی وی پر ایک پروگرام پیش ہوا جس میں فیض صاحب' صادقین اور روشن آراء بیگم نے شرکت کی تھی۔ مت پوچھئے کہ صادقین نے کیا کہا اور فیض صاحب نے کیا فرمایا۔ مجھے زیادہ ہمدردی روشن آراء بیگم سے تھی جو لگتا تھا کہ اس پروگرام میں آ کر پھنس گئی ہیں۔ گفتگو بھی تشنہ' گانا بھی تشنہ۔ ایسا کیوں ہوا۔ انہی سے سنئے۔

لالہ موسیٰ

17 اگست 1972ء

محترم جناب انتظار حسین صاحب۔ سلام مسنون!

مزاج گرامی۔ آج میں نے روزنامہ ''مشرق'' میں آپ کا ''لاہور نامہ'' پڑھا۔ اس میں آپ نے میرے متعلق یہ بات بالکل درست فرمائی ہے کہ میں تو صرف موسیقی کی زبان جانتی ہوں کیونکہ میں ایک موسیقار ہوں اور ادیب اور مقرر نہیں ہوں۔ پھر بھی آپ کی اطلاع کے لیے میں ان حالات اور مجبوریوں کا ذکر ضروری سمجھتی ہوں جو اس انٹرویو اور ٹھمری کے وی ٹی آر کے تیار کرنے میں پیش آئیں۔

مجھے اگست کے پہلے ہفتے میں راولپنڈی ٹیلی ویژن والوں نے کچھ ترانے ریکارڈ کرانے کے واسطے دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مجھے ایک ٹھمری بھی گانا ہوگی جو ایک انٹرویو اور ٹھمری پاکستان کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر 14 اگست کو دکھائی جائے گی۔ راولپنڈی پہنچنے پر مجھے مندرجہ ذیل سوال دیئے گئے جس پر میں نے اظہار خیال کرنا تھا۔

1- پاکستان میں کلاسیکی موسیقی اور اس کا مستقبل؟

2- کیا کلاسیکی موسیقی ہمارے موجودہ زمانے کے تقاضے پورے کر سکتی ہے؟

دراصل جو صاحب کراچی سے میرا انٹرویو لینے آنے والے تھے وہ 10 اگست تک راولپنڈی نہ آ سکے۔ انٹرویو ویسے یہ مذکورہ دو

سوالوں کی روشنی میں ریکارڈ کرلیا گیا۔ گو مذکورہ سوالوں میں یہ ذکر نہیں تھا کہ گزشتہ پچیس سالوں میں موسیقی نے کیا ترقی کی اور موسیقار کا اس میں کتنا حصہ ہے۔ پھر بھی میں نے اپنی آل پاکستان میوزک کانفرنس لاہور کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ جہاں عوام پچیس سال پہلے کلاسیکی موسیقی سننے سے گھبراتے تھے اب اس فن کو دلچسپی سے سنتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں نے آل پاکستان میوزک کانفرنس کی سالانہ محافل موسیقی کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جن میں ہزاروں عوام شریک ہو کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

میرے انٹرویو کے اختتام پر میں نے پانچ منٹ کی ٹھمری بھی گائی تھی مگر جب 14 اگست کو میں نے اپنا وی ٹی آر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انٹرویو اور ٹھمری میں خاصی کاٹ چھانٹ کر دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ بمشکل میں ٹھمری کے بول ہی کہہ پائی تھی اور انترہ شروع بھی نہیں ہو رہا تھا کہ وی ٹی آر ختم ہو گیا۔

اب آپ خود انصاف فرمائیں کہ مذکورہ حالات میں میں اس سے زیادہ کیا کر سکتی تھی۔ سمع خراشی کی معافی چاہتی ہوں۔

فقط

آپ کی خیر اندیش۔۔۔۔۔۔۔روشن آراء بیگم

انٹرویو میں کاٹ چھانٹ تو ہونی ہی تھی۔ یہ بیان کہ ہزاروں لوگ کلاسیکی موسیقی کی محفل میں شریک ہوتے ہیں ٹی وی کی انقلابی پالیسی کو وارا نہیں کھاتا تھا۔

اور حلقہ ارباب ذوق انقلاب کو کیسے چلا رہا تھا وہ بھی سن لیجئے۔ ناصر کاظمی کا انتقال ہو گیا تو حلقہ ارباب ذوق نے تعزیتی جلسہ کیا۔ خیر یہ تعزیتی جلسہ تو حلقہ کے پرانے اراکین کے کہنے سننے سے کسی طرح ہو گیا مگر اگلے ہی ہفتے جو تعزیتی جلسہ ہونا تھا، وہ نہ ہو سکا۔ خیر میں تو وہاں نہیں تھا۔ میں اور مشتاق حلقہ کی رکنیت کو تیاگ چکے تھے اور سیکرٹری کو اپنا تحریری استعفیٰ بھیج چکے تھے۔ ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر خبر سنی۔ اصل میں ناصر کے انتقال کے دوسرے تیسرے دن ہی پنڈی سے یوسف ظفر کے انتقال کی خبر آ گئی۔ یوسف ظفر حلقہ کے پرانے رکن۔ ان اراکین میں سے جن کے نام سے حلقہ جانا جاتا تھا۔ حلقہ میں تعزیتی جلسہ کا سوال اٹھنا ہی تھا۔ انقلابیوں کی ٹولی بگڑ گئی۔ کیا حلقہ اسی لیے رہ گیا ہے کہ رجعت پسند ادیبوں کے تعزیتی جلسے کرتا رہے۔ استدلال خوب تھا۔ شاید ان کے حساب سے بہت صحیح تھا۔ انقلاب پہلے ہی ناصر کے تعزیتی جلسہ کی وجہ سے ایک ہفتہ لیٹ ہو گیا تھا۔ یہ دوسرا تعزیتی جلسہ بھی ہو جاتا تو انقلاب دو ہفتے پیچھے جا پڑتا۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر انقلاب میں اتنی تاخیر مگر پھر ہوا کیا۔ انجم رومانی بھرا کھا کر جلسہ سے اٹھے۔ ان کے ساتھ حبیب جالب اٹھے، شہرت بخاری اٹھے، سلیم شاہد اٹھے۔ ٹی ہاؤس میں آ کر اعلان کیا کہ اصلی حلقہ تو ہم ہیں۔ یوسف ظفر کی یاد میں چائے کی میز پر بیٹھ کر تعزیتی جلسہ کیا۔

اگلی اتوار تک آتے آتے حلقہ کے نئے رنگ سے بیزار کتنے اراکین اکٹھے ہوئے۔ اپنے تئیں اصلی حلقہ کی تجدید کی۔ سہیل احمد خان سیکرٹری بنے۔ ایک نو وارد نوجوان کہ ڈھاکہ سے بہہ کر لاہور آن نکلا تھا' جوائنٹ سیکرٹری بنا۔ نام اس کا سراج منیر تھا۔ ٹی ہاؤس کی بالائی منزل میں جلسہ ہوا۔ لیجیے حلقہ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ کسی بھلی گھڑی میں کسی نے کیا خوب کہا تھا

حلقہ کے مقاصد کی گرتا ہے نگہبانی
یا انجم رومانی یا زاہد فارانی

زاہد فارانی تو برائے بیت تھا۔ یہ مقام اصل میں شروع سے انجم رومانی سے منسوب چلا آتا تھا۔ سو دیکھ لو کیسے وقت میں کیا کام دکھایا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔ انقلابی بھنڈار الگ' حالی کی دکان الگ

''مال ہے نایاب پھر گاہک ہیں اکثر بے خبر''

گاہکوں کو خبر ہوتے ہوتے ہوئی۔ ٹی ہاؤس میں حلقہ کے یاران کہن اور یاران نو اکٹھے ہوتے چلے گئے۔ میں بھی وہاں آنے جانے لگا۔ دونوں حلقوں میں امتیاز اس طرح قائم ہوا کہ نئے قائم ہونے والے حلقہ کو حلقہ ارباب ذوق ادبی کہا جانے لگا۔ جس حلقہ سے بغاوت کی گئی تھی' وہ حلقہ ارباب ذوق سیاسی کے نام سے مشہور ہوا۔

قائدین بغاوت جنہوں نے حلقہ ارباب ذوق ادبی قائم کیا' دو تھے۔ انجم رومانی اور حبیب جالب مگر یہ تو اجتماع ضدین تھا۔ آخر کیسے ہوا؟ بس یہ حالات کی بوالعجبی تھی۔ انقلابیوں میں کھرا نگ تو حبیب جالب ہی تھا۔ باقی تو سب دانشوروں اور ادیبوں کے انقلاب میں تھوڑا تھوڑا کھوٹ ملا ہوا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ حلقہ میں بیٹھے ہوئے باقی انقلابیوں کی مرغی تو خالی کیمپ میں کڑکڑاتی تھی۔ حبیب جالب کی عوامی شاعری کا طوطی پورے ملک میں بولتا تھا مگر مقدر کا کھیل کہ پھر بھی حبیب جالب کو عزیز الحق اور اس کے حواریوں کے مقابلہ میں پسپا ہونا پڑا۔ بات یہ ہے کہ انقلاب کے قبلہ کا بھی تو بٹوارہ ہو گیا تھا۔ انقلابیوں کے دو برانڈ چل رہے تھے۔ چینی برانڈ اور روسی برانڈ۔ ان دنوں چینی برانڈ کا شور زیادہ تھا۔ روسی برانڈ کو انہوں نے ترمیم پسند کہہ کہ مطعون کیا اور یہ ان کے شور کا کمال تھا کہ ترمیم پسند بھی رجعت پسند کی قسم کی ایک گالی بن گئی۔ حلقہ میں چینی برانڈ کا زور تھا۔ نتیجہ یہ کہ رجعت پسند انجم رومانی اور ترمیم پسند حبیب جالب مشترک دشمنوں کے مقابلہ میں متحد ہو گئے۔ یہ اتحاد مومنین حلقہ کے لیے مبارک ثابت ہوا۔ حلقہ ارباب ذوق ادبی کامیابی سے چلتا رہا۔

سراج منیر جیسا کہ میں نے ابھی بتایا' اس حلقہ کا نائب سیکرٹری بنا تھا' سمجھ لو کہ اس جوان عزیز نے حلقہ ارباب ذوق ادبی سے آغاز کیا مگر جلد ہی آگے نکل گیا۔ ذہن براق پایا تھا' قلم تیز چلتا تھا۔ قلم بھی اور زبان بھی۔ زبان بے عیب' بیان شستہ' لہجہ دلنشین مگر یہ خوبیاں آدمی کو اچھا مقرر بنا سکتی ہیں۔ ادب اس کے سوا بھی کچھ مانگتا ہے تو اصل جوہر سراج منیر کا اس وقت کھلا جب اس نے تنقیدی مقالے لکھے۔

جب ربط وضبط بڑھا تو اس کے کچھ اور گن بھی سامنے آئے۔ مجھے ان دنوں گردے کی تکلیف تھی۔ ایک روز دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سراج منیر ہاتھ میں ایک شیشی لیے کھڑا ہے۔ کہا کہ اس کے دس قطرے پانی میں ملا کر روز صبح کو پی لیا کریں۔ انشاء اللہ گردے کے سلسلے میں اس کے بعد کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ کیسی دوا ہے؟ کس حکیم نے تجویز کی ہے؟ پتہ چلا کہ موصوف خود ہی حکیم ہیں۔ ہومیوپیتھی میں درک رکھتے ہیں۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ اس نے میرا ہاتھ دیکھا اور بہت کچھ بتا ڈالا۔ پھر زائچہ بنانے کا وعدہ کیا۔ دوسرے تیسرے دن ملاقات ہوئی تو زائچہ ہاتھ میں تھا۔ پتہ چلا کہ دست شناسی سے آگے بڑھ کر علم نجوم کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے۔

پھر ایک روز گھر پہ ملاقات کے دوران میں نے دیکھا کہ یہ عزیز عالیہ کو دعائیں لکھ کر دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ کسی پر جادو کیا گیا ہو تو اس کا توڑ کس کس دعا سے کیا جا سکتا ہے۔ کچھ دعائیں بتائیں۔ ایک تعویز لکھ کر عنایت کیا۔

ادب، ہومیوپیتھی، فراست الید، علم نجوم، جادو ٹونے، تعویز گنڈے اور ادو وظائف۔ میں حیران کہ اس جاتہار کا قدم کہاں کہاں ہے مگر ابھی تو کچھ اور گن سامنے آنے تھے۔ ایک روز گرمی کھائی، حلقہ کی کاروائی کا رجسٹر پٹخ کر پھینکا اور یہ جا وہ جا۔ ٹھیک بھی تھا، عزائم بلند تھے۔ حلقہ سے بندھائی ہاؤس میں ٹکا کب تک بیٹھا رہتا۔ تھوڑے دنوں بعد پتہ چلا کہ جوہر شناس مل گیا۔ اب جنرل ضیاء کا منظور نظر ہے۔

انہیں دنوں یہاں ایک اور ستارے کی نمود ہوئی۔ حلقہ کی روایت چلی آتی تھی کہ شاعر ایک چیز پیش کرے گا، خواہ غزل ہو خواہ نظم مگر اس شاعر نے اپنی دس غزلوں کے ساتھ اپنی مہورت کی۔ کیا غزلیں تھیں کہ مہورت ہی پر ہنگامہ ہوگا۔

چڑیا دھنے ہوا میں چاند
بے کل بالک وا میں چاند
چڑیا بالک ہونٹ کی بیٹی
اڑتا شجر صبا میں چاند
جدا سمندر سے چاند سوتا
بدن سمندر کی حس بنا جب
سوئے سورج کی نسل کا لمحہ

بوئے راتوں میں اب پرندہ سیہ
آہٹ پھرے ہے پلوں سے دور دور
دریا سراغ ڈھلتا موجود سے دور دور
آواز کو عبث ہے گفتار کا اندھیرا
رفتار کو جلا ہے آنکھوں سے دور دور

سامعین حیران و پریشان جیسے ان کی مت ماری گئی ہو۔ تھوڑی دیر تک سناٹا طاری رہا۔ پھر اچانک مختلف سمتوں سے آوازیں آئیں اور ایک ہی سوال کیا گیا کہ کیا یہ غزلیں تھیں۔ اگر غزلیں تھیں تو ان کا کچھ مطلب بھی ہوگا' وہ کیا ہے؟ مطلب عنقا نظر آیا۔

مگر اس شاعری کے حامی بھی موجود تھے۔ ایک نے دفاع کرتے ہوئے معترضین پر ہلہ بول دیا۔ ''صاحب شاعری بھی کوئی بھینس ہے کہ اس سے دودھ ضرور دوہا جائے۔ مطلب نہیں ہے تو نہ سہی' شاعری تو ہے۔''

دوسرے حامی نے زیادہ مثبت انداز میں دفاع کیا۔ کہا کہ ''ان غزلوں سے مطلب اسی طرح برآمد ہوتا ہے جیسے بھرے تھنوں والی بھینس سے دودھ برآمد ہوتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ آدمی دودھ دوہنا جانتا ہو۔''

یہ تھے صلاح الدین محمود۔ آدمی بھی نرالا' شاعر بھی نرالا۔ دراز قامت' گوری رنگت' بھرا بھرا جسم' لباس وہی ایک کرتا پاجامہ۔ رنگ اس کا کبھی گیروا' کبھی سفید اور ہمیشہ یہ شان کہ جیسے ابھی استری کر کے پہنا گیا ہے۔ بے شک اسے پہنے صبح سے شام ہوگئی ہو۔ لباس میں کبھی شکن نہیں دیکھی گئی۔ رات کو سو کر صبح کو اٹھے تو بھی لباس ویسا ہی صاف اور شکن سے پاک۔ داغ دھبہ نہ کبھی لباس پر دیکھا گیا نہ شخصیت پر۔ شخصیت بھی ایسی کہ جیسے ابھی حوض کوثر سے دھل کر آئی ہے اور یہ کہ ایک غوطہ گنگا ندی میں دیا گیا ہے۔ علی گڑھ میں پلے بڑھے مگر طور اطوار سارے لکھنو والے۔ شائستگی کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ شائستگی کے ساتھ بولنا' بات کرنا۔ والد گرامی پنجاب کی مٹی تھے۔ اس مٹی کی سوندھ کو انہوں نے علی گڑھ میں رہتے ہوئے آخری وقت تک برقرار رکھا مگر صلاح الدین محمود نے ہمیشہ اپنے آپ کو علی گڑھ کی مٹی جانا۔

علی گڑھ والے ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ ہم سب ہی نے انہیں دیکھ رکھا ہے۔ علی گڑھ بھی تھوڑا بہت دیکھا ہی ہے مگر یہ علی گڑھ والا نرالا تھا۔ جس علی گڑھ کی جھلک دکھاتا تھا' وہ علی گڑھ بھی نرالا تھا۔ زبان نرالی' امیجری نرالی' چاندر' اسپ سیاہ' نقش اول' نابینا طائر' شجر۔ یہ اس کے کلیدی لفظ اور ترکیبیں ہیں کہ بار بار ان کی نظموں میں ان کی گونج سنائی دیتی ہے۔ میں نے کہا کہ ''صلاح الدین آپ

کی زبان الگ لب ولہجہ الگ امیجری الگ آپ اپنے ہمعصر نئے شاعروں سے اتنے الگ کیوں نظر آتے ہیں؟''

بولے ''میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ اصیل شاعری تو اس طرح وارد ہوتی ہے جیسے یک لخت بارش کا چھینٹا پڑے۔ اس کی وضاحت کیسے ہو سکتی ہے۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جیسے ہر اصیل شاعر ایک نجی متھ لے کر ظاہر ہوتا ہے' ایسے ہی میرے پاس بھی ایک نجی متھ ہے۔ بس یوں سمجھو کہ جیسے ایک چٹیل میدان ہے۔ اس میں دو گھوڑے اسپ سیاہ اور اسپ سفید دوڑ رہے ہیں اور کسی شے کی تلاش میں ہیں۔ پھر ایک گھنا جنگل ہے۔ گھنے جنگل کے بیچوں بیچ ایک چاند رہے۔ میں اس چاند تک پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کی نجی متھ سر آنکھوں پر۔'' میں نے کہا ''مگر ایک چیز اجتماعی متھ بھی ہوتی ہے۔''

''کیوں نہیں۔'' تھوڑا سوچ کر بولے۔ ''ایک تو قرآن کا لحن ہے جو میں نے بچپن سے سنا اور میرے اندر سما گیا اور ایک حضور پاک صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات اقدس۔'' اور اسی کے ساتھ صلاح الدین محمود کے جسم میں ایک تھرتھری دوڑ گئی۔ بتاتے تھے کہ جب وہ مکہ گئے تھے تو ایک رات؟' غار حرا میں گزاری۔ پھر بڑی محنت سے ایک نقشہ تیار کیا اور اس راستے کا تعین کیا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم چل کر مکہ سے مدینہ پہنچے تھے۔ منصوبہ بنایا تھا کہ اس راستہ پر پیدل چل کر منزل مقصود تک پہنچیں مگر آخر کیوں؟ اسے وہ نقش اول کہتے تھے اور وضاحت اس طرح کرتے تھے کہ میں اس پاک وقت تک پہنچنا چاہتا ہوں جس پاک وقت میں حضور پاک نے سانس لیا تھا۔ اس وقت میں جو لہو کی گردش تھی' اس گردش کو میں اپنے لہو میں محسوس کرنا چاہتا ہوں۔

مدینہ پہنچ کر مجھے خط لکھا۔

انتظار حسین صاحب!

رسول اللہ سے ایک بار پھر میں نے اپنے حواس کی ازلی پاکیزگی مانگی ہے۔ تاکہ حاضر حیات کے اس میدان میں دوبارہ پہلا قدم دھر سکوں۔ اور کائنات کی تمام جنبش کا نقش اول پا سکوں۔

صلاح الدین محمود

مدینہ منورہ

رجب 1403ھ

مگر اس کے بعد یوں ہوا کہ ایک شام انہوں نے دوستوں کو مدعو کیا کہ ایک نادر شے دستیاب ہوئی ہے۔ اس سے آپ کو متعارف کرانا ہے۔ دوست جمع ہوئے۔ چائے پی۔ جب شام ڈھل گئی اور رات ہو گئی تو انہوں نے روشنیاں گل کر دیں۔ اندھیرے میں

ریکارڈ بجنا شروع ہوا۔ یہ سبھ لکشمی کا لانگ پلے ریکارڈ تھا۔ میرا بائی کے بھجن سبھ لکشمی کی آواز صلاح الدین محمود کے لیے اسے سننا عبادت کا درجہ رکھتا تھا۔ ایک روز کہنے لگے کہ جب سبھ لکشمی کی آواز میں یہ سنتا ہوں کہ پربھو آ دو پربھو آ دو تو مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ بس سمجھ لیتا ہوں کہ پربھو آ گئے۔

میں نے کہا "صلاح الدین! آپ خوب آدمی ہیں۔ ادھر قرآن کے لحن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذات سے اتنی عقیدت اتنا استغراق اور ادھر میرا بائی سے اتنا عشق۔"

بولے "میرا بائی کے بغیر تو میرا اسلام مکمل نہیں ہوتا۔" پھر وضاحت کرنے لگے۔ "انتظار صاحب! میں خلا میں تو پیدا نہیں ہوا ہوں۔ ان مسلمانوں کی اولاد ہوں جو نو سو برس سے یہاں رچے بسے چلے آ رہے تھے۔ کھجور کا پیڑ مدینہ منورہ سے لا کر یہاں لگایا جائے گا تو کھجور کے ذائقہ میں تھوڑا فرق تو آئے گا۔"

"مگر آپ کو تو نقش اول کی جستجو ہے؟"

"ہاں وہ بھی ہے۔ دیکھئے بیج سے درخت بنتا ہے۔ جب درخت بن جاتا ہے تو اس کی شکل ہی اور ہوتی ہے۔ ہر رنگ کا پرندہ اس پر آ کر بیٹھتا ہے مگر اس درخت کو کبھی کبھی تو یہ خیال آتا ہوگا کہ بیج کی جو اولین چیخ تھی اسے سننا چاہیے۔ تو میں بھی بیج کی اولین چیخ سننا چاہتا ہوں۔ بیج جو حضور پاک کے وقت میں چٹخا تھا اور اس سے کونپل پھوٹی تھی۔"

ایک روز وقت طے کر کے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے "آپ نے خیال کا سن ستاون نمبر نکالا تھا۔ یہ بتایئے کہ عظیم اللہ خان کے بارے میں آپ کے پاس کتنا مواد ہے؟"

میں نے کہا "صلاح الدین صاحب! کیوں آپ ہمیں شرمندہ کرتے ہیں۔ ارے اس کے متعلق جاننے کی خاطر میں اکیلے نے نہیں سعید محمود نے بھی لائبریریاں چھان ڈالیں۔ تھوڑی سی معلومات سے آگے کچھ ملا ہی نہیں۔"

بولے "یہ شخص مجھے بہت Fanscinate کرتا ہے۔ میں نے اس کے متعلق خاصا مواد جمع کیا ہے۔ اس کا خاصا وقت لندن میں گزرا۔ ڈکنس سے اس کی دوستی تھی۔ وہاں اونچی سوسائٹی میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ میمیں اس پر ریجھی ہوئی تھیں بلکہ جس ستاون کی شکست کے بعد آزادی کے سپاہی یہاں سے فرار ہوئے تو کچھ میموں نے اپنے اثر رسوخ سے اس کی یہاں سے نکلنے میں مدد کی۔" میں نے کہا جب آپ اس شخص پر کام کر رہے ہیں تو اختر حسین رائے پوری کے ایک بیان کی روشنی میں بھی تھوڑی چھان بین کر لیجئے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت میں اپنی کھٹمنڈوں کی یادوں کے ذیل میں لکھا ہے کہ عظیم اللہ خاں نے اس شہر میں پناہ لی تھی اور یہ کہ وہ

1947ء کے کئی سال بعد تک جیتا رہا۔ اس نے اپنی یادداشتیں قلمبند کی تھیں جو اس نے مولانا ابوالکلام کو بھجوادی تھیں۔

''ویسے تو اس کا اتنی عمر پانا قرین قیاس نظر نہیں آتا۔ پھر بھی سوچنا تو چاہیے کہ آخر انہوں نے کون سے شواہد کی بنا پر یہ بات کہی ہے۔''

افسوس کہ صلاح الدین کے باقی منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی تشنہ تکمیل ہی رہا مگر اس میں ان کی اپنی خطا نہیں تھی۔ اس موقع پر فرشتہ اجل نے عجلت دکھائی مگر خیر یہ ظالم فرشتہ بھی ان کے رکھ رکھاؤ میں ایسا خلل تو نہیں ڈال سکا۔ بس یوں ہوا کہ اچانک ایک صبح ان کی طبیعت بگڑی۔ خون کی قے آئی۔ کلی کر کے باتھ روم سے نکلے۔ بستر پر دراز ہو گئے۔ اس طرح کہ لباس پر شکن نہ پڑے۔ ایک ہچکی لی اور گزر گئے۔

اچھا تو میں کیا بات کر رہا تھا۔ ہاں حلقہ ارباب ذوق ادبی کی بات ہو رہی تھی۔ ادبی حلقہ اور سیاسی حلقہ لگتا تھا کہ دو الگ دنیائیں ہیں۔ یہاں ادب زیر بحث ہوتا۔ سیکرٹری سہیل احمد خان تھے جو اس وقت تنقید کے میدان میں ایک ابھرتے ہوئے روشن ستارے کا تاثر دیتے نظر آتے تھے۔ اسی حساب سے شاعری اور افسانے میں کچھ نئی سمت کنمناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ جس کے یہاں ادب کی چٹیک تھی اور لکھنے لکھانے کی آرزو۔ وہ اس طرف دوڑتا ہوا آتا اور اس محفل میں جہاں گنے چنے لوگ ہوتے' شریک ہوتا۔

ادھر حلقہ ارباب ذوق سیاسی میں عزیز الحق کے انقلاب کا گھوڑا ایکٹ دوڑ رہا تھا۔ ساری حدیں پھلانگتا چلا جا رہا تھا۔ بس ایک دم ہی پٹخنی کھائی۔ ایک چیلی کے جلے بھنے شوہر کی گولی کا نشانہ بنا اور دم کے دم میں وہ شعلہ کی مثال بھڑکتی جان ٹھنڈی ہو گئی۔

عزیز الحق کے گزرنے کے بعد حلقہ کے انقلابی بے آسرا ہو گئے۔ جو ادب کے نام صفر تھے اور خالی انقلاب کے نعرے کے سہارے دندناتے تھے' وہ جلد ہی غائب غلہ ہو گئے۔ جو انقلاب اور ادب کی کھچڑی پکا رہے تھے' ان کا یہ ہوا کہ جس کے جدھر سینگ سمائے' ادھر نکل گیا۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ٹی ہاؤس کے حلقوں میں سعادت سعید کی دو پلی ٹولی نے پائی۔ اس نے انقلاب کا ٹوپا اتار کر دو پلی ٹولی سر پر منڈھ لی اور پی ای این کے مولویوں کی امامت میں نمازیں پڑھنے لگا۔

اب حلقہ میں چنگبرے انقلابی رہ گئے تھے۔ سو انتہا پسندی کا دور ختم ہوا۔ رویے میں اعتدال پیدا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دونوں حلقوں میں صلح صفائی کی تحریک شروع ہوئی۔ بار بار مذاکرات ہوئے جیسے ہندوستان اور پاکستان کے بیچ ہوتے ہیں کہ امیدوں کے ساتھ شروع ہوتے ہیں اور ناکامی پر ختم ہوتے ہیں۔ آخر کے تئیں وہ زمانہ آ گیا کہ نہ حلقہ ارباب ذوق سیاسی رہا' نہ حلقہ ارباب ذوق ادبی رہا۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء نے دونوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ دونوں کو اپنی دکان بڑھانی پڑی۔

ہاں اسی ہنگام جب حلقہ میں افراتفری پڑی تھی اور وہ دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا تو قیوم نظر نے گوشہ نشینی کو ترک کیا۔ اپنے پرانے

خلقی رفقا و انصار کو اکٹھا کر کے اپنا حلقہ ارباب ذوق چالو کیا۔ کتنے دنوں تک ہم یہ سنتے رہے کہ قیوم صاحب جمعہ کے جمعہ اپنے رفقاء و انصار کو کہیں مسلم مسجد کے اس پاس کسی گوشے میں جمع کرتے ہیں۔ وہاں حلقہ کا جلسہ ہوتا ہے۔ جب ادھر دونوں حلقوں نے اپنی دکان بڑھا دی تو قیوم صاب کے حلقہ کے لیے فروغ پانے کے خاصے امکانات تھے مگر اسی زمانے میں قیوم صاحب کی صحت جواب دے گئی۔ باقی ان کے کسی رفیق میں اسے سنبھالے رکھنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ وہ حلقہ گوشہ گمنامی میں شروع ہوا اور گوشہ گمنامی ہی میں آخری سانس لے کر ختم ہو گیا۔

جب ایک ایک کر کے سارے حلقے نبڑ گئے اور ان کے بنانے بگاڑنے والے دبک کر اپنے اپنے کونوں میں بیٹھ گئے' تب لاہور کے ادبی افق پر مبارک احمد نمودار ہوئے۔ ٹی ہاؤس میں پہنچ کر انہوں نے حلقہ کی تجدید کا بیڑا اٹھایا اور یاران حلقہ کو جھنجھوڑ کر جگایا۔

مبارک احمد کی کیا پوچھتے ہو۔ حلقہ کی پرانی ہڈی ہیں۔ میراجی کے وقتوں سے ویسے کے ویسے ہی چلے آ رہے ہیں۔ اسی وقت سے سائیکل اور نئی شاعری یہ دو چیزیں ان کے دم کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ سائیکل تو جیسی تب تھی' ویسی ہی اب ہے۔ ہاں نئی شاعری کا معاملہ یہ ہے کہ پہلے نظم آزاد لکھتے تھے۔ جب نئی شاعری نے نثری نظم کو جنا اور سب طرف سے اسے شاعری کی حرام اولاد بتا کر تھڑی تھڑی ہونے لگی تو انہوں نے نومولود کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کی حفاظت اور پرورش اپنے ذمے لے لی۔ اس بچے کی پرورش کرتے کرتے مبارک احمد بقول خود ''کرہ ارض کے نمائندہ شاعر'' بن چکے ہیں۔ آگے ایک طویل نظم ''زمانہ عدالت نہیں ہے۔'' لکھی تھی۔ یاروں کو بتایا کہ انہوں نے یہ نظم اقوام متحدہ کے چارٹر کی نکر پر لکھی ہے۔

جب دیکھا کہ شاعری سے کام نہیں چل رہا تو بہت غور و فکر کے بعد ایک دن گجرات سے چل کر لاہور پہنچے۔ ٹی ہاؤس میں دوستوں کو جمع کیا اور اعلان کیا کہ میں نے عالمی حکومت کا ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت بڑی قوموں کو مجبور کیا جائے گا کہ چھوٹی قوموں کی مدد کریں۔

''بڑی قوموں کو مجبور کون کرے گا؟'' یہ سوال ان کے دوستوں میں سے یوسف کامران نے اٹھایا۔

''میں مجبور کروں گا۔'' مبارک احمد نے قطعی لہجہ میں کہا۔

''اگر آپ کی بات بڑی قوموں نے نہ مانی تو کیا ہوگا؟''

''تو پھر میں عالمی رائے عامہ کو ان کے خلاف بیدار کروں گا۔''

مبارک احمد کو اس مشن میں ایک ہاتھ بٹانے والے کی ضرورت تھی۔ قرعہ فال اعجاز حسین بٹالوی کے نام نکلا۔

''ان سے پوچھ تو لیجیے۔'' کسی نے کہا۔

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ایسا کام ہے جس میں شرکت سے انکار ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔''

''پھر بھی اگر انہوں نے انکار کر دیا تو؟''

''تو پھر میں ان کے خلاف عالمی رائے عامہ کو جھنجھوڑوں گا۔''

اس منصوبے کو وہ عملی جامہ پہنانے لگے تھے کہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ اس ہنگامی صورتحال کے تحت انہوں نے اپنی عالمی حکومت کے منصوبے کو تھوڑے عرصے کے لیے ملتوی کیا اور پاکستان میں جمہوریت کی حفاظت کی ذمہ داری تک اپنے آپ کو محدود کر لیا۔

مبارک احمد ویسے تو سب ہی عورتوں کے دلدادہ ہیں مگر دو عورتیں ایسی ہیں جن کے لیے وہ جان بھی دے سکتے ہیں۔ اول بے نظیر بھٹو دوم ہیما مالنی۔ ہیما مالنی کی شان میں انہوں نے ایک نظم لکھی تھی۔ جب رام لال پاکستان آئے تو انہوں نے یہ امانت ان کے سپرد کی اور کہا کہ یہ نظم آپ کو خود بمبئی جا کر ہیما مالنی کو پہنچانی ہے۔''

ویسے سب سے زیادہ نظمیں انہوں نے دو عورتوں کے بارے میں لکھی ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے بارے میں اور کشور ناہید کے بارے میں۔ کشور ناہید کو وہ ایک زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی شاعرہ بتاتے تھے۔ تھوڑے عرصے کے بعد انہیں یہ رائے تبدیل کرنا پڑی۔ پھر انہوں نے یہ اعزاز سارہ شگفتہ کو دیا۔ سارہ شگفتہ کے انتقال کے بعد وہ متذبذب رہے کہ اب یہ عزت کس شاعر کو دی جائے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلے اس فیصلہ سے انہوں نے مجھے آگاہ کیا۔ وہ جون کی ٹیکا ٹیک دوپہر تھی' جب انہوں نے میرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے دروازہ کھولا۔ دیکھا کہ مبارک احمد سائیکل لیے کھڑے ہیں۔ پسینہ میں شرابور ہیں۔

''خیر تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بولے ''بس ایک خبر تمہیں دینے آیا ہوں۔''

''کیا خبر ہے؟''

''میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عذرا عباس ٹی ایس ایلیٹ سے بڑی شاعرہ ہے۔''

میں حواس باختہ ان کی صورت تکنے لگا۔

''صحیح کہہ رہا ہوں۔ ایلیٹ کی نظم ''ویسٹ لینڈ'' عذرا عباس کی نظموں کے مقابلہ میں.....

میں نے جھرجھری لی۔ فوراً ان کی بات کاٹی ''مبارک صاحب! بس کریں۔ گرمی بہت ہو رہی ہے۔ آپ کی اطلاع کا شکریہ۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نے اپنا پیغام آپ کو پہنچا دیا ہے۔'' سائیکل پر سوار ہوئے۔ یہ جا وہ جا۔ مطلب یہ کہ مبارک احمد جس کا بیڑا اٹھاتے ہیں' اس کے لیے جان لڑا دیتے ہیں اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر دم لیتے ہیں تو اب انہوں نے حلقہ کی تجدید کا بیڑا اٹھایا تھا اور واقعی انہوں نے حلقہ کو زندہ کر دکھایا اور اس طرح زندہ کیا کہ سیاسی حلقہ اور ادبی حلقہ کی تقسیم ہی ختم ہو گئی۔ حلقہ ارباب ذوق اب صرف حلقہ ارباب ذوق تھا۔

حلقہ جب چل نکلا تو انہوں نے اسے سلام کیا اور پھر نثری نظم کے فروغ کے مشن کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ نثری نظمیں لکھ لکھ کر ڈھیر لگا دیے۔ پھر ''کلیات'' چھپوائی اور اعلان کیا کہ اس کلیات کو لے کر جس میں آ کے ہر سوال کا جواب موجود ہے اور نثری نظم کا پیغام عظیم دیا گیا ہے' دنیا کے سفر پر نکلوں گا۔ پہلے امریکہ جاؤں گا۔ اگر اس نے مثبت جواب نہ دیا تو آسمان کی طرف منہ کر کے تھوکوں گا کہ تھوک میرے ہی منہ پر پڑے کہ امریکہ تو کیا دنیا کے کسی ایک شخص کو بھی دکھ دینا نہیں چاہتا۔''

تو اس کینڈے کے آدمی ہیں مبارک احمد۔ دھن کے پکے۔ جس وقت جو بھی دھن سوار ہو جائے' پھر رات دن ایک کر دیتے ہیں۔ حلقہ ارباب ذوق کو ڈوبتے دیکھا تو ضبط نہ ہو سکا۔ اس میں جت گئے اور جیسے تیسے کر کے اس کھٹ بگڑی گاڑی کو چالو کر دیا۔ اب اگر اس کا پچھلا معیار اور وقار واپس نہیں آیا تو اس میں قصور ان کا نہیں' زمانے کا ہے۔ اب پاکستان کے سارے ہی ادارے اپنا وقار کھو چلے تھے۔

حلقہ کی کچھ روایات ساری خرابی کے باوجود یہاں بھی برقرار دیکھی گئیں۔ ایک روایت یہ چلی آتی تھی کہ کوئی ایک سر پھرا پہلا پتھر پھینکنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا۔ کوئی مضمون ہو' کوئی مسئلہ۔ اس میں اسے درک ہو یا نہ ہو مگر پہلا پتھر پھینکنے کا فریضہ بہر حال ادا کرنا ہے۔ کسی زمانے میں رحمن مذنب کیل کانٹے سے لیس بیٹھے رہتے تھے۔ ادھر مضمون ختم ہوا' ادھر وہ جاری ہو گئے۔ یونانی دیو مالا سے بسم اللہ کرتے اور پھر چل سو چل۔ اسی کے آس پاس کے زمانے میں شاد امرتسری نے پہلا پتھر پھینکنے والے کی حیثیت سے سر اٹھایا۔ مقالہ ہو' افسانہ ہو' نظم ہو' غزل ہو۔ وہ ہر مضمون میں رواں تھے اور اس شان سے کہ پڑھنے والا تحریر ختم کر کے سانس لینے نہیں پاتا تھا کہ شروع ہو جاتے۔ حلقہ کے دولخت ہونے کے آس پاس کے زمانے میں اکبر لاہوری نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ اکبر لاہوری عمر کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے کہ حلقہ کی طرف مائل ہوئے۔ بینائی جاتی رہی تھی۔ بیٹی عصائے پیری بنی ہوئی تھی۔ اس کے سہارے حلقہ میں پہنچتے اور اس پابندی کے ساتھ کہ نمازی کی نماز قضا ہو جائے۔ ان کا حلقہ میں آنا قضا نہیں ہو سکتا تھا۔ وقت سے پہلے کہ ابھی ہال خالی پڑا ہوتا کہ وہ وارد ہوتے اور اپنی طے شدہ نشست پر شست باندھ کر بیٹھ جاتے۔

مبارک احمد کے تجدید کردہ حلقہ میں یہ ذمہ داری خان فضل الرحمن خان نے سنبھالی۔ کیا نرالے بزرگ تھے۔ لمبے لگ لگ' جسم

سینک سلائی' سر سارا سفید' وقت پر ٹی ہاؤس میں قدم رکھتے۔ پہلے چائے کی میز پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھتے۔ پھر بالائی منزل میں جا کر حلقہ کے جلسہ میں شریک ہوتے اور وہاں جو کچھ پڑھا جاتا' اسے اسلامی معیار پر پرکھتے اور رد کر دیتے۔ تحریر میں فحاشی کو بہت جلدی سونگھ لیتے تھے یہ الگ بات ہے کہ خود ان کے ناولوں' افسانوں میں یہی رنگ خوب بہار دکھاتا تھا۔ آخر یاروں سے رہا نہ گیا اور ان کے ایک ناول کا حوالہ دے کر کہا کہ اس ناول میں تو آپ نے حد کر دی۔ ہیرو سارے مزے لوٹ کر آخر لواطت کی طرف چل پڑتا ہے۔

افسوس سے کہنے لگے کہ ''کمبخت کو میں نے بہت روکا مگر وہ رکا ہی نہیں۔ میں کیا کرتا۔''

''مگر آپ کے دوسرے کردار بھی بہت جلدی کھل کھیلتے ہیں۔''

بولے ''کیا بتاؤں میرے کردار میرے قابو میں نہیں رہتے۔ میں تو ان کی اصلاح کی بہت کوشش کرتا ہوں مگر مخرب اخلاق حرکتوں سے باز نہیں آتے۔''

شاہد حمید نے ٹالسٹائی کے ''وار ہیڈ پیس'' کا ترجمہ کیا۔ حلقہ کی ایک نشست میں اس پر گفتگو کا اہتمام ہوا۔ ٹالسٹائی کے بارے میں کہنے والوں نے جو کچھ کہا اسے خاموشی سے سنتے رہے۔ پھر ایک دم سے ابل پڑے۔ بولے اگر ٹالسٹائی اتنی ہی عظیم شخصیت تھا' جتنا آپ لوگ بتا رہے ہیں تو پھر وہ مشرف بہ اسلام کیوں نہیں ہوا۔''

◆◆◆

جرنیلی زمانہ

یہ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ روزہ نماز کا بہت چرچا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ جب جونیجو صاحب وزیراعظم بنے تو رمضان آنے پر افطار پارٹی کی تقریب سے بہت سے صحافیوں کو یاد کیا گیا۔ مدعوین میں میرا بھی نام تھا۔ وزیراعظم ہاؤس میں ایک شام جنرل ضیاء الحق کی طرف سے افطار کا اہتمام تھا۔ دوسری شام جونیجو صاحب کی افطار پارٹی کے لیے وقف تھی۔ پہلی شام یوں ہوا کہ افطار کرتے کرتے جنرل صاحب نے اذان کی آواز سنی اور فوراً اس سمت چلے جہاں نماز کا اہتمام تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے پورا ہجوم۔ کیا صحافی' کیا غیر صحافی۔ میں نے دیکھا کہ پیچھے ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔ پھر ادھر ادھر نظر ڈالی تو دور ایک گوشے میں ایک درخت تلے ڈان والے احمد علی خان کھڑے نظر آئے۔ میں لپک کر ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ظفر صمدانی بھی کسی طرف سے آن نکلا ہے۔ ایک ڈیڑھ دانہ اور لڑھکتا پڑکتا اس ٹولی میں آن شامل ہوا۔

اگلی شام وہی مقام' اسی طرح سے افطار کا اہتمام۔ اسی طور اذان کی آواز مگر ہوا یہ کہ جونیجو صاحب جب نماز کے لیے چلے تو بس چند گنے چنے تنگ ان کی معیت میں تھے باقی سب افطاری میں مشغول نظر آئے۔

اس سے میں نے یہ جانا کہ نماز برحق مگر دیکھنے والے یہ بھی دیکھتے ہیں کہ دعوت نماز کس طرف سے ہے۔ بھٹو صاحب ویسے تو بہت دانا بینا تھے مگر اسلام کا علم بلند کرتے وقت اس نکتہ کو فراموش کر گئے۔ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اقدام' جمعہ کی چھٹی' گھڑ دوڑ پر پابندی' شراب پر پابندی مگر عجب ہوا کہ ایسے کام انجام دینے کے بعد بھی ان کی مسلمانی مشکوک ہی رہی۔ ہاں یہ جو احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا اقدام تھا' اس کا تھوڑا اثر ہماری دوستیوں پر بھی پڑا۔ میں غالب احمد کو کب سے مسلمان سمجھتا چلا آ رہا تھا۔ اچانک پتہ چلا کہ وہ تو غیر مسلم ہے۔ مجھے تو خیر جانے دو' ہمارے دوستوں کے حلقہ میں اسلام کے سب سے بڑے مبلغ تو اپنے شیخ صلاح الدین چلے آ رہے تھے۔ ان کے دو ہی تو محبوب موضوعات تھے۔ وقت کا مسئلہ اور اسلام۔ انہوں نے اسلام کے بیج سے کیسا کیسا فلسفہ کشید کر کے ہمارے ذہن نشین کیا تھا مگر حیف کہ غالب احمد کی نامسلمانی ان کی نظروں سے اوجھل رہی۔ اس انکشاف کی سعادت ہمارے سیکولر رہنما ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل ہوئی۔

خیر دوستی تو نبھانی تھی۔ کتنے زمانے سے اس یار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس دن میں نے سوچا کہ آئین دوستی کا تقاضا یہ ہے

کہ اب جبکہ دوست مسلم سے غیر مسلم بن گیا ہے تو اس حادثے پر اس سے جا کر اظہار ہمدردی کیا جائے یا تعزیت کی جائے۔

میرے ہوتے ہوئے میرے سوا جو دوسرا دوست غالب احمد سے تعزیت کرنے آیا تھا' وہ حیات احمد خان تھے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ بھٹو صاحب نے اپنی طرف سے ایسے کتنے قدم اٹھائے کہ مولویوں کو ان کے اسلام کا قائل ہو جانا چاہیے تھا مگر عجب ہوا کہ یار و اغیار نے ان اقدامات پر اعلان تاشقند والا نسخہ اثر کر گیا اور جیسے ان کا اسلامی سوشلزم کا نعرہ چل گیا' ویسے یہ اسلام کے حوالے سے بھی کامیابی ان کے قدم چومے گی مگر اس میدان میں کامیابی کسی اور کے نام لکھی گئی تھی۔ کیا یہ نیتوں کے فرق کی وجہ سے ہوا یا طریقہ واردات کے اختلاف کے باعث۔ اس گتھی کو آپ سلجھاتے رہیے۔ بہر حال واقعہ یوں ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے اسلام کا نام لیا اور کامیاب ٹھہرے اور ان کی نماز کی تحریک تو واقعی بہت موثر ثابت ہوئی۔ راتوں رات کتنے بیوروکریٹ نمازی بن گئے اور دفتر دفتر نماز کی صفیں بچھ گئیں۔ ہمارے ''مشرق'' کے دفتر میں چند گنے چنے پکے نمازی چلے آتے تھے۔ ظہر کی نماز کا وقت ہوا اور انہوں نے قلم رکھ کر قریب کی مسجد کا رخ کیا مگر اب اچانک دفتر کا دفتر نمازی بن گیا۔ ظہر کا وقت ہوا۔ ادھر سے ضیاء اسلام انصاری جو ضیاء الحق کی نظر کرم سے اخبار کے چیف ایڈیٹر بن گئے تھے' اپنے کمرے سے نکلے اور ادھر کیا خوش نویس اور کیا اخبار نویس اپنی اپنی نشست سے اٹھے اور نماز کے لیے صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

دروغ بر گردن راوی' سننے میں آیا کہ دفتروں' اداروں میں جو نماز نہیں پڑھتے' ان کی نام نوٹ کیے جاتے ہیں اور جو پابندی سے یہ فریضہ انجام دیتے نظر آتے ہیں' انہیں ترقی دینے کا معاملہ زیر غور ہے۔ اس خبر یا افواہ نے خاطر خواہ اثر کیا۔ دفتروں میں نمازوں کی صفیں اور لمبی ہو گئیں۔

اس صورتحال نے ثقافتی' ادبی اور علمی اداروں کو بھی متاثر کیا۔ لاہور آرٹ کونسل کے پروگرام میں تھیٹر' مصوری' موسیقی کے ساتھ ساتھ بقدر نمک رقص بھی شامل تھا۔ مہاراج غلام حسین کتھک روز شام کو اسی ایک دیرینہ آن بان کے ساتھ چھڑی گھماتے کونسل میں آتے۔ کتھک کی مختصر سی کلاس میں پہنچ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے' چھڑی سامنے رکھتے۔ خوبصورت سی پان کی ڈبیا کھول کر پان یا خالی الائچی منہ میں رکھتے اور کتھک کا درس شروع کرتے۔ ایک صبح میں نے خبر پڑھی کہ آرٹ کونسل میں رقص کی کلاس بند ہو گئی۔ دل میں کہا کہ یہ تو ہونا ہی تھا۔ آرٹ کونسل کے سارے ہی پروگرام ان دنوں اسلامی حلقوں کی طرف سے سخت تنقید کی زد میں تھے۔ اتفاق سے اسی ہفتے کونسل کی گورننگ باڈی کی میٹنگ تھی۔ اس کا ایک رکن میں بھی تھا۔ کمشنر لاہور آفریدی صاحب چیئرمین تھے۔ میں نے ان کی توجہ اس خبر کی طرف دلائی اور استفسار کیا کہ اس کلاس کو اچانک بند کرنے کا سبب کیا تھا؟ بولے ''خبر غلط ہے۔ ہم نے صرف اتنا

کیا ہے کہ اس کلاس کو تہہ خانے میں منتقل کر دیا ہے تا کہ لوگوں کی نظروں میں زیادہ نہ آئے۔ ویسے آپ اپنے کالم میں یہ ذکر نہ کریں ورنہ پھر شاید کلاس بند ہی کرنی پڑ جائے' ہم پر Pressure بہت ہے۔''

اصل میں اس دباؤ کا مقابلہ جو شخص کر رہا تھا' وہ کوئی دوسرا تھا۔ وہ تھے گورنر پنجاب جنرل جیلانی۔ ویسے تو وہ ضیاء الحق کے مارشل لاء کے رکن رکین تھے۔ لیکن اس شہر کے لیے کچھ اچھے کام کر گئے۔ انہی کا دم تھا کہ آرٹ کونسل نہ صرف اپنے فنون کے پروگراموں کے ساتھ بچ گئی بلکہ اس کی مجوزہ نئی عمارت بھی کھڑی ہو گئی۔

ہاں مجلس ترقی ادب کی ایک میٹنگ مجھے نہیں بھولتی۔ حنیف رامے کی وزارت اعلیٰ کے زمانے میں جب اس مجلس عاملہ کی نئی تشکیل ہوئی تھی تو اس کے نئے اراکین میں محمد سلیم الرحمن اور مجھے بھی شامل کیا گیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی مجلس کے ڈائریکٹر تھے اور ہیں۔ انہوں نے جو اشاعتی پروگرام منظوری کے لیے پیش کیا' اس میں کلیات میر کے نئے ایڈیشن کی اشاعت بھی شامل تھی۔ ہمارے بزرگ ڈاکٹر سید عبداللہ نے جھرجھری لی۔ پہلے میر سے اپنے عشق کا ذکر کیا' پھر ایک عجب ٹکڑا لگایا۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ اس وقت قوم کو ایسی کتابوں کی ضرورت ہے جو اس کے اسلامی اور قومی شعور کو بیدار کریں۔ ''کلیات میر'' کو شائع کر کے کیا کیجئے گا۔ ویسے بھی ہندوستان میں تو کلیات چھپ ہی گئی ہے۔

کمیٹی کے سرکاری اراکین نے فوراً ان کی بات کی تائید کی' مجھ سے رہا نہ گیا۔ ان کے بیان کی مقدور بھر مخالفت کی مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنا آلہ سماعت اتار کر الگ رکھ دیا تھا۔ میری کوئی بات ان کے کانوں تک نہیں پہنچی۔ یہ ان کا خاص طریقہ واردات تھا۔ اپنی بات کہہ کر آلہ سماعت سے اپنے کانوں کو آزاد کر لیتے تھے۔ پھر آپ مار پیچھے پکار کرتے رہیں' ان کے کانوں پر ذرا جوں رینگ جائے۔ کانوں تک بات پہنچتی' تب ہی تو جوں رینگنے کی توقع کی جاتی۔

پھر قاسمی صاحب نے غالب کے نسخہ حمیدیہ کی نئی اشاعت کی اجازت مانگی۔ اب کے پروفیسر غلام حسین' ذوالفقار نے اسی سید صاحب والے استدلال کے ساتھ اس کی اشاعت کی مخالفت کی۔ خیر غلام حسین ذوالفقار سے نبٹنا کسی قدر آسان تھا کہ یہاں نہ بزرگی کا احترام درمیان میں حائل تھا نہ آلہ سماعت۔

کچھ دلچسپ اور عبرت انگیز واقعات ریڈیو پر پیش آئے۔ جنرل ضیاء الحق کی طرف سے ریڈیو اور ٹی وی کو ایک ہدایت آئی تھی کہ ان کے پروگراموں میں شراب کا ذکر نہیں آنا چاہیے۔ ایک ادبی مذاکرے میں یوں ہوا کہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے پروگرام کے پروڈیوسر شکور بیدل نے ہمیں سمجھایا کہ بحث میں کوئی ایسا شعر نہ پڑھا جائے جس میں شراب کا ذکر ہو۔ میں نے کہا کہ اگر شراب کا

ذکر ہو تو پھر کیا ارشاد ہے۔ شکور بیدل سوچ میں پڑ گئے۔ پھر کہا یار ایسے شعروں سے بھی اجتناب کر ہی لیا جائے تو مناسب ہے۔ میں نے کہا بہر حال جو موضوع زیر بحث ہے اس میں مجھے اقبال کے ''ساقی نامہ'' کا حوالہ دینا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال کے ساقی نامہ کے باب میں تمہاری ریڈیو پالیسی کیا کہتی ہے۔ شکور بیدل ہاتھ جوڑ کھڑے ہو گئے۔ ''یار مجھ پر رحم کرو۔ میری نوکری کا معاملہ ہے۔''

ہاں حب الوطنی کے تقاضوں نے بھی تو ان دنوں عجب شکل اختیار کر لی تھی۔ اسلامی کلچر پر کوئی بحث تھی۔ میں نے تاج محل کا حوالہ دیا۔ شکور بیدل بے چین ہوئے۔ پروگرام بیچ میں روک دیا۔ کہا کہ ''اوپر سے اعتراض آ جائے گا۔ اس حوالے کو جانے دو۔''

''آخر کیوں؟'' میں نے چڑ کر پوچھا۔

''تاج محل ہندوستان میں ہے ناں۔''

میں نے کہا کہ اس حوالے کو منہا کر کے مسلمانوں کے کلچر اور آرٹ پر بات کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ سو میں اس بحث سے علیحدہ ہوتا ہوں۔ سجاد باقر رضوی بھی اس پروگرام میں تھے۔ وہ گرمی کھا کر فوراً ہی رواں ہو گئے اور ایسے رواں ہوئے کہ مادری اصول' پدری اصول' انفس' آفاق' یونگ سب ہی ان کے استدلال کی لپیٹ میں آ گئے۔ بیچارے شکور بیدل حیران و پریشان کہ اب کیا کیا جائے۔ انہوں نے پھر وہی ہتھیار استعمال کیا۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے ''پروفیسر صاحب! میری نوکری کا معاملہ ہے۔''

شکور بیدل غلط نہیں کہتے تھے۔ ان ظالم ہدایات سے بال برابر بھی انحراف ہو جاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے تھے۔ ایک ریڈیو کالم میں' میں نے موسم کے میووں کا ذکر کرتے ہوئے کہیں بھٹوں کا بھی ذکر کر دیا۔ ریڈیو کے باریک بینوں کے سامعہ نے درمیان سے نون غنہ غائب کر دیا۔ اوپر رپورٹ پہنچائی کہ فلاں پروگرام میں ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور صاحب پروڈیوسر غریب کی کمبختی آ گئی۔ اس نے ہزار صفائی پیش کی کہ ذکر بھٹو کا نہیں بھٹوں کا تھا۔ افسران اعلیٰ قائل نہیں ہوئے۔ مشکل سے جان بخشی ہوئی مگر اس سزا کے ساتھ کہ وہ پروگرام اس سے لے لیا گیا۔

وہ تو خیر مارشل لاء تھا اور مارشل لاء بھی کونسا؟ ضیاء الحق والا مگر آگے چل کر نام نہاد جمہوری حکومتوں نے بھی اپنے اپنے حساب سے ضیاء الحق کی سنت پر عمل کیا۔ وہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کا دوسرا دور تھا۔ میری ایک کہانی کو خالد احمد نے پی ٹی وی کے لیے ڈرامائی جامہ پہنایا۔ اس ڈرامے کے ساتھ عجب ہوا کہ بغیر کسی معذرت یا وضاحت کے اسے بیچ میں روک دیا گیا۔ اشتہار چلنے لگے۔ پھر کوئی دوسرا پروگرام شروع ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا معمہ ہے۔ اگلی صبح کو بھید کھلا جب سکرپٹ ایڈیٹر ظہور بھائی حیران و پریشان میرے پاس آئے۔ پتہ چلا کہ ڈرامہ کے بیچ کہیں اوپر سے ہدایت آئی کہ اس ڈرامے کو فوراً روک دو۔ یہ تو کراچی کی صورتحال کے بارے میں

ہے اور پھر پوچھ گچھ ہونے لگی کہ یہ ڈرامہ کس نے پڑھا اور کس نے منظور کیا؟ بیچارے ظہور بھائی کو اب اپنی صفائی پیش کرنی تھی۔ کہانی کے مصنف سے وہ مدد چاہتے تھے۔ کہانی کا مصنف ان کی اس باب میں کیا مدد کر سکتا تھا؟

خیر اس ڈرامے پر تو اس قسم کے شک کا جواز موجود تھا۔ مضحکہ خیز صورتحال میرے ایک دوسرے ڈرامہ کے بارے میں پیدا ہوئی۔ یہ طویل دورانیہ کا ایک کھیل تھا جو (آٹھواں سوال'' کے عنوان سے سٹیج پلے کے طور پر لکھا گیا تھا۔ پی ٹی وی کے تقاضوں پر میں نے ان کی نذر کر دیا۔ بختیار احمد نے بڑے شوق سے اسے تیار کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ ایسی پروڈکشن ہے کہ دیکھو گے تو دل خوش ہو جائے گا مگر پیش آج ہوتا ہے' نہ کل ہوتا ہے۔ جب خاصے دن گزر گئے تو مجھے کرید ہوئی کہ معاملہ کیا ہے۔ پہلے یہ سن لیجئے کہ اس ڈرامے کی بنیاد قصہ حاتم طائی پر ہے کہ حسن بانو اپنے امیدواروں کے سامنے یہ شرط رکھتی ہے کہ جو اس کے سات سوالوں کا جواب لائے گا' اس سے وہ شادی کرے گی۔ پی ٹی وی کے عاقلوں نے یہ نکتہ نکالا کہ ڈرامہ نگار نے حسن بانو کے پردے میں بے نظیر بھٹو کو پیش کر ڈالا ہے۔ بس پھر کھیل سرد خانے میں چلا گیا۔

اچھا جب شاہد محمود ندیم لاہور سٹیشن کے جی ایم بنے اور انہوں نے مجھ سے کھیل لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا کہ برادر پہلے میرے اس کھیل کا حق حساب کرو جو پی ٹی وی کے سرد خانے میں پڑا ہے۔ اس عزیز نے جلد ہی پیش کر ڈالا اور کوئی قیامت نہیں ٹوٹی۔ پتہ چلا کہ کچھ پابندیاں اوپر سے عاید ہوتی ہیں' کچھ خود پی ٹی وی کے اہلکاروں کے وسوسوں' اندیشوں سے اگتی ہیں۔ مارشل لاؤں کے زیر اثر پل کر نام نہاد جمہوری حکومتوں کے مارشل لائی احکامات سے تربیت پا کر وہ اتنے عقلمند ہو گئے ہیں کہ اب انہیں اوپر والوں کے اشارے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ خود ہی بھانپ لیتے ہیں کہ اوپر والے کیا چاہتے ہیں اور انہیں کیا کرنا ہے۔ بہر حال میں نے اس واقعہ سے سبق لیا اور آئندہ کے لیے ٹی وی کے لیے ڈرامہ لکھنے سے کان پکڑے۔ پہلے بھی میں کون سا اس صنف میں رواں تھا۔ بس کبھی کبھار کا معاملہ تھا' اب اس سے بھی توبہ کر لی۔

خیر تو ذکر ضیاء الحق کے زمانے کا تھا۔ کیا زمانہ تھا۔ ایک طرف نمازوں کا چرچا تھا' دوسری طرف سر عام پھانسیوں اور کوڑوں کا شور تھا۔ میں نے ایک لطیفہ صفدر میر سے سنا تھا کہ جب دلی میں نادر شاہ نے قتل عام کا حکم دیا تو لاہور میں ایک زندہ دل لاہوریئے نے دوسرے سے کہا کہ بھاجی' ایس ویلے دلی میں قتلام دا میلہ لگا ہے' ہا چلو چلئے میلہ دیکھیں۔ تب سنا تھا' اب دیکھا۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے پھانسیوں کا میلہ لگا۔ اسے دیکھنے کے لیے لگتا تھا کہ پورا شہر جیل روڈ پر ڈھل آیا ہے۔ احمد مشتاق کے گھر سے دریا دکھائی دیتا تھا۔ ہم نے جو اپنا گھر بنایا' وہاں سے جو چیز سب سے پہلے دکھائی دی' وہ پھانسیوں کا تختہ تھا۔ صبح ہی صبح برآمدے میں کھڑے ہو کر

جو ادھر ادھر نظر دوڑائی تو عقبی دیوار کے پرے کیا دیکھتا ہوں کہ جیل کے احاطے میں ہمارے گھر کے رخ مزدور ٹھوک پیٹ کر رہے ہیں۔ مجھے اس گھڑی کب پتہ تھا کہ یہ اصل میں پھانسی کے تختے ہیں جو نصب کیے جا رہے ہیں۔ وہ تو دوپہر ہوتے ہوتے پتہ چلا۔ خلقت ڈھلی چلی آ رہی تھی۔ پھر لوگوں کو ایسی دیواروں اور چھتوں کی تلاش ہوئی جہاں سے یہ تماشا اچھا دکھائی دے۔ کتنے زندہ دلوں نے ہمارے گھر کی چھت کو تاڑا۔ کتنی مشکل سے منت سماجت کرنے والوں کو ٹالا۔ پھر بھی عین پھانسیوں کے وقت میری اپنی چھت پر نظر گئی تو کتنے تماشائی وہاں ڈٹے نظر آئے۔ پتہ نہیں کس طرف سے چڑھ کر آئے۔ میں پریشان ہو ہو کر انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ میری نظروں سے بے نیاز شوق میں ڈوبے پھانسیاں دیکھ رہے تھے۔ پھانسیوں کے تختوں کی طرف نظر دوڑانے کی مجھ میں ہمت نہیں ہوئی۔ ہراساں و پریشاں اپنی چھت اور اس پر لدے تماشائیوں کو دیکھا کیا۔ پوری تین پھانسیاں لگی تھیں۔ شائقین کو کھلی دعوت دید تھی۔

مگر یہ تو ٹریلر تھا۔ ایسے کئی ٹریلر یہاں وہاں چلے۔ بڑی پھانسی بعد میں لگی مگر اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ بس دن چڑھے ضمیمے آئے جن سے پتہ چلا کہ آخر کے تئیں بھٹو صاحب کو پھانسی لگ گئی۔ پورا ملک ہل گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ ادھ مرا بچہ جو بھٹو صاحب کے انتظام میں پیدا ہوا تھا' سانس لینے لگا۔ اکیڈمی آف لیٹرز کا پہلا جلسہ عام اس پھانسی کے ہفتے بھر بعد منعقد ہوا۔ یہ ادارہ بھٹو صاحب کے عہد حکومت میں وجود میں آیا تھا مگر بس اس حد تک کہ دفتر قائم ہو گیا اور احمد فراز اس کے چیئرمین بن گئے۔ ادارہ متحرک ضیا عہد میں ہوا اور ایسا متحرک ہوا کہ سال کے سال اسلام آباد میں ادیبوں کا ایک میلہ سا لگتا۔ لاہور سے لے کر فاٹا تک کے ادیب ڈھل کر آتے اور موج میلہ کرتے۔ پہلا میلہ قدرے پھیکا تھا۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کا واقعہ تازہ تھا۔ دلوں' دماغوں پر اس کا بہت اثر تھا۔ سو کتنے ادیبوں نے اس برس وہاں جانے میں تامل کیا۔ اگلے برسوں میں اس میلہ نے بہت رونق پکڑی۔ مجھے چونکہ کبھی شرکت کا شرف حاصل نہیں ہوا' اس لیے آنکھوں دیکھا حال رقم کرنے سے قاصر ہوں۔ کانوں سنی کتنی سنا سکتا ہوں۔ کتنے ہی شریک ہونے والوں کو یاروں کے بیچ معذرتی لہجہ میں کہتے سنا کہ کیا کرتے مجبوری تھی۔ دھمکی مل گئی تھی' جانا پڑا۔ نوکری خطرے میں تھی۔ میرا ایسا کوئی تجربہ نہیں ہے' ہر چند کہ ٹرسٹ کی زد میں آتے ہوئے اخبار سے وابستہ تھا۔ اس وقت اکیڈمی کے چیئرمین شفیق الرحمن تھے۔ وہ تو گئو آدمی تھے۔ فعال کردار اکیڈمی کے ڈائریکٹر مسیح الزمان صدیقی ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے بھی بس تقاضے ہی کیے تھے۔ ان کے بعد والوں نے تو زیادہ تقاضے وقاضے بھی نہیں کیے۔ انہوں نے ناموروں اور گناموں کا اتنا مجمع اکٹھا کر لیا تھا کہ اکا دکا ادیب اگر شریک بھی نہ ہوتا تو اس سے ان کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ آمروں اور نیم آمروں وزیر اعظموں کو سامعین ہمیشہ ہی وافر

مقدار میں میسر رہے مگر آگے تو بس وہ سیاسی تقریریں کیا کرتے تھے۔ضیاء الحق کا ایک شوق یہ تھا کہ سال کے سال ادب پر ایک خطبہ دیتے تھے۔ یہاں بھی انہیں سامعین بہت میسر آئے۔ بڑا ادبی خطبہ۔اس کے بعد ادیبوں کے اعزاز میں بڑا کھانا۔ایک برس مشیر ادیبوں نے ان کی توجہ اس طرف دلائی کہ ادیب آپ کا کھاتے ہیں۔اوپر سے بلاتے ہیں اور ایسی نظموں' غزلوں اور نثری تحریروں کو ان کے نوٹس میں لایا گیا جن میں ان کے تجزیئے کے حساب سے مارشل لاء کے خلاف اشارے ملتے تھے۔تب جنرل صاحب نے اپنے خطبہ میں برہمی کا اظہار کیا اور موجود ادیبوں پر جتایا کہ اس کے بعد آپ کو میرا نمک کھانا ہے مگر اس برس نفری اتنی زیادہ تھی کہ سکیورٹی والے چیک کرتے کرتے تھک گئے۔کتنوں کو انہوں نے ڈائننگ ہال میں گھسنے ہی نہیں دیا۔

◆◆◆

ادب بیبیوں کی گود میں

صاحب! عجب وہ دور تھا کہ ادبی سرگرمی کم ہوتی چلی جارہی تھی اور ادیبوں کی سرگرمیوں میں تیزی آتی چلی جارہی تھی۔ ادب مندے کا شکار تھا لیکن ادیبوں کا کاروبار زور پکڑ رہا تھا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا کہ پاکستان سے ادب غائب ہو جائے گا' بس ادیب رہ جائیں گے اور عجب صورتحال تھی کہ تخلیقی سرگرمی تو جیسے تھوڑی رہ گئی ہو مگر ادیبوں کی تعداد اچانک بڑھ گئی تھی۔ اکیڈمی آف لیٹرز کی کانفرنسوں کی برکت سے دیکھتے ہی دیکھتے ادیبوں کی آبادی میں کتنا اضافہ ہو گیا تھا۔

ہاں اسی زمانے میں ہمارے ادبی نقشہ میں ایک اور طاقت ابھر کر سامنے آئی۔ ویسے مارشل لاء سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اور اکیڈمی آف لیٹرز کا بھی اس میں کوئی احسان نہیں ہے مگر بہرحال یہ واقعہ اسی زمانے میں ظہور پذیر ہوا کہ بیبیاں ہماری دنیائے ادب میں اس طرح متحرک ہوئیں کہ ادب نسوانی کاروبار نظر آنے لگا بلکہ یہاں تک گمان ہونے لگا تھا کہ پاکستان میں اب اگر ادب کو پروان چڑھنا ہے تو وہ بی بیوں کی گود میں پروان چڑھے گا۔ وہی اسے دودھ پلائیں گی، گودوں کھلائیں گی۔ میں ابھی کہہ رہا تھا کہ ضیاء الحق کے سبز قدم ایسے آئے کہ جلد ہی دونوں حلقوں یعنی ادبی حلقہ اور سیاسی حلقہ دونوں کا بستر لپٹ گیا اور ٹی ہاؤس میں ادب موضوع گفتگو نہیں رہا۔ ضیاء الحق کا مارشل لاء یہ تھا' وہاں ادیبوں کا نیا موضوع گفتگو۔ ایسے میں جمیلہ ہاشمی کو ایک جھرجھری آئی۔ ناول، افسانے لکھتے لکھتے انہیں خیال آیا کہ شاعر اچھے ہیں کہ مشاعرے منعقد کرتے ہیں۔ وہ سناتے ہیں' سننے والے داد کے ڈونگرے برساتے ہیں' فکشن والے اس لطف سے محروم ہیں۔ سو انہوں نے شب افسانہ کی کھچڑی پکائی۔ افسانہ نگاروں کو اکسایا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ کونے میں منہ چھپائے بیٹھے رہتے ہو۔ محفل میں آؤ اور افسانہ سناؤ۔ پہلی ایسی محفل ان کے گھر میں شروع فروری 1977ء میں آراستہ ہوئی۔ انہوں نے کس اہتمام سے اپنے گھر میں فرش فروش بچھائے' گاؤ تکیے سجائے، بیچ میں شمع رکھی۔ ہر ایک کے سامنے ٹھونگنے کے لیے خشک میوے کی طشتری، کھانے کے لیے پائے، سننے کے لیے افسانے۔ پائے پیٹ بھر کر سب نے کھائے۔ افسانے چار افسانہ نگاروں نے سنائے۔ قاسمی صاحب نے، اشفاق احمد نے، اعجاز حسین بٹالوی نے، جمیلہ ہاشمی نے۔

جمیلہ ہاشمی نے اولاً ایک ناول نگار کی حیثیت سے نام پایا۔ پھر ان کے دسترخوان کا چرچا ہوا۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ تھا۔ اس پر مستزاد آموں کا ایک شاندار باغ۔ آموں کی فصل میں ایک آم پارٹی کا اہتمام ضرور کرتیں۔ جاڑوں میں شب افسانہ' اس کے ساتھ

کھانا دانہ۔ ایک اور شب افسانہ یاد آ رہی ہے۔ یہ فروری 1979ء میں آراستہ ہوئی تھی۔ اس میں دو چیزوں کی بہت تعریف ہوئی تھی۔ گاجر کے حلوے کی اور قدرت اللہ شہاب کے ناول کے باب کی۔ وہاں تو انہوں نے اس قصے کو ناول کے باب کے طور پر ہی پیش کیا تھا۔ ''شہاب نامہ'' کی اشاعت پر پتہ چلا کہ وہ ان کی آپ بیتی کا ایک ورق تھا۔

جمیلہ ہاشمی نے تو اس محفل کا آغاز شب افسانہ ہی کے طور پر کیا تھا مگر شرکائے محفل میں دو روحیں ایسی تھیں جنہوں نے اسے خالص شب افسانہ نہیں رہنے دیا۔ صلاح الدین محمود اور کشور ناہید۔ دونوں کی نظموں کے لیے یہ جواز پیدا کیا گیا کہ ان میں کہانی کا رنگ ہے۔ پھر بیگم ادا جعفری نے کہ ان دنوں اسی شہر میں تھیں۔ ایک محفل شب کا اہتمام کر ڈالا جو شاعری اور افسانہ دونوں سے مالا مال تھی۔

لکھنے والی بیبیوں کے طفیل ایسی محفلوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ بیگم حجاب امتیاز علی نے سوچا کہ یہ محفلیں کسی ضابطے کے تحت ہونی چاہئیں۔ ان کا کوئی قاعدہ قانون ہونا چاہیے تو انہوں نے ایک چھوٹی سی میٹنگ طلب کی۔ شبانہ محفلوں کا ایک منصوبہ پیش کیا۔ منشور جو انہوں نے مرتب کیا تھا' پڑھ کر سنایا۔ اس سلسلہ کا نام من وسلویٰ رکھا گیا۔ چند شرطیں جو ان کے پیش کردہ پیپر میں بیان ہوئی تھیں' یہ تھیں۔

زیادہ سے زیادہ بائیس حضرات یا بارہ جوڑے اس میں شریک ہوں۔ ہر چاند کی 12 کو یہ محفل بپا کی جائے۔ نیز۔۔۔۔۔۔

1- رائے عامہ کے بعد جگہ کا فیصلہ ہوا۔ کسی کا گھر' کوئی سائبان' کسی جگہ کا پرسکون زینہ' کسی درخت کا سایہ' کنار دریا وغیرہ۔

2- ہر ادیب اور شاعر اپنے ساتھ ایک شمع (یا روشنی کا کوئی اور منبع) ایک نظم' غزل یا کہانی اور ایک پکوان جو کہ چھ متوسط خوراک والے ممبران کے لیے کافی ہو لائے اور چپ چاپ میز پر رکھ دے۔ جاتے وقت خاموشی اور صبر سے اپنے خالی برتن لیتا جائے۔

3- میٹھا ضرور ہو۔

4- جب کسی کا گھر منتخب ہو تو میزبان کا فرض ہے کہ وہ اپنے کھانے کی میز' گرم روٹی یا چاول' موسم کے مطابق مشروب اور برتن وغیرہ پیش کرے اور گھبرائے ہرگز نہیں۔

5- اس محفل میں نظم' غزل' کہانی یا مقالہ تازہ ترین ہو تو بہت اچھا ہے۔ پرانی چیز بھی طوعاً و کرہاً سن لی جائے گی۔ (طویل اور اکتا دینے والی کہانی یا مقالے کسی کانفرنس کے واسطے اٹھا رکھیں)

6- پہلی محفل کے اختتام پر اگلی محفل میں تخلیقات پیش کرنے والوں کا تعین کیا جائے گا۔ اس ضمن میں کسی قسم کا عذر' شرم یا نخرہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔

7- آنے کے وقت کی پابندی کی جائے گی۔ جانے کے وقت پر کوئی پابندی نہیں۔

تجاویز اور شرائط اور بھی تھیں۔ میں نے چند ایک گن چن کر نقل کی ہیں۔ پیپر اس بیان پر ختم ہوتا ہے۔

ایک شام میں نے اپنے ہاں مندرجہ ذیل کو چائے پر مدعو کر کے ان تجاویز کا اعلان کیا اور من وسلویٰ کی داغ بیل ڈالی۔

جناب وبیگم منظور الٰہی' جناب وبیگم صلاح الدین محمود' جناب انتظار حسین' جناب وبیگم نور الحسن جعفری' جناب وبیگم یوسف کامران' جمیلہ ہاشمی گاؤں گئی ہوئی ہیں۔ واپس آ کر شامل ہوں گی۔

حجاب امتیاز علی

صدر وبانی ''من وسلویٰ''

مارچ 1977ء

حجاب امتیاز علی سے میرا تعارف کوئل کے واسطے سے ہوا۔ میرا مطلب ہے باقاعدہ تعارف ورنہ ویسے تو میں ایک زمانے سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے گھر جا کر نہاری بھی بہت کھائی ہے مگر نہاری تو میں وہاں نعیم طاہر کے مہمان کی حیثیت سے کھاتا تھا۔ شاید ایک آدھ دفعہ تاج صاحب نے بھی یاد کیا مگر تاج صاحب کے ہمراہ تو میں انہیں آرٹ کونسل میں بھی کب سے دیکھ رہا تھا۔ ہر کھیل دیکھنے باقاعدگی سے تاج صاحب کے ساتھ آتی تھیں مگر ہمیشہ میں نے انہیں چپ ہی پایا۔ بس اچانک ایک صبح مشرق کے دفتر میں مجھے ان کا فون موصول ہوا ''انتظار صاحب! کیا اس موسم میں آپ نے کوئل کی آواز سنی ہے؟''

اس سوال پر مجھے چونکنا ہی تھا۔ کون اس زمانے میں اس پر دھیان دیتا ہے کہ کوئل کب بولتی ہے اور کب مور جھنکارتے ہیں۔ برا ہو نئے زمانے کا جس نے فطرت سے ہمیں یکسر بیگانہ کر دیا ہے تو خیر میں نے جلدی جلدی نہر کنارے اپنی صبح کی سیروں کو یاد کیا اور کہا ''جی نہیں' ابھی تک مجھے یہ آواز سنائی نہیں دی۔''

''انتظار صاحب! یہ تو بہت عجیب بات ہے۔ اب تو ساون بھی لگ چکا ہے اور کوئل ابھی تک نہیں بولی ہے۔ میں نے کیلی فورنیا خط لکھ کر معلوم کیا' وہاں بھی ابھی تک کوئل نہیں بولی ہے۔''

کیلی فورنیا۔ اس پر میں چکرایا مگر انہوں نے جلد ہی وضاحت کر دی۔ ''بات یہ ہے کہ کیلی فورنیا کی آب وہوا بھی ہمارے علاقوں کی طرح ہے۔ کوئل وہاں بھی ہوتی ہے اور موسم کے حساب سے بولتی ہے مگر اس برس وہاں ابھی تک کوئل کی آواز سنائی نہیں دی ہے اور آپ نے ابھی تک اس پر کالم نہیں لکھا۔ کیوں نہیں لکھا؟''

میں اپنی کوتاہی پر سخت شرمندہ تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ موسم پر جو میں کالم لکھتا رہا ہوں اور درختوں اور پرندوں کے بارے میں جو باتیں کرتا رہا ہوں' اسے وہ باقاعدگی سے پڑھتی رہی ہیں مگر جب اس بہانے تبادلہ خیال کا سلسلہ قائم ہو گیا تو پھر بات موسموں' درختوں اور پرندوں تک محدود نہیں رہی۔ پتہ چلا کہ معاشرتی مسائل و معاملات میں بالخصوص مذہب کے حوالے سے اور عورتوں کے حوالے سے جو اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں' اس میں ان کا شغف بہت ہے۔ اس نقطہ نظر سے بھی اب انہوں نے میری تحریروں کو پرکھنا شروع کر دیا۔ کبھی فون یا خط کے ذریعہ شاباش دی جا رہی ہے' کبھی سرزنش کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ان کا ایک خط ذرا سن لیجئے۔

جناب انتظار حسین! تسلیم

لاہور واپس آئی تو دیکھا کہ آپ کی تحریرات میں ایک حرارت اور زندگی آ گئی ہے جو پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کی۔ شاید اب آپ اپنی جبلتوں سے آگاہ ہو گئے ہیں۔ جب بھی کوئی آدمی اپنی کسی جبلت کا معقول استعمال کرتا ہے تو وہ قابل عزت ہو جاتا ہے۔

آپ کے اخبار ''مشرق'' میں ٹیلی ویژن کے رمضان المبارک کے پروگراموں کی تفصیل دیکھی۔ موسیقی اور ڈرامے بند کر دیئے گئے ہیں۔ تعجب ہوا۔ یہ تو ماتم کی علامات ہیں۔ رمضان المبارک خوشیوں کا مہینہ ہے۔ مسلمان روزے رکھتے' نماز پڑھتے اور اپنے معبود حقیقی کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اس میں غم کی کیا بات ہے۔ روزہ دار یہ چاہے گا کہ افطار اور نمازوں کے بعد ٹیلی ویژن پر کوئی ڈرامہ دیکھے' دل پسند موسیقی سنے اور تفریح حاصل کرے۔

غم و الم اور ماتم کا مہینہ محرم کا ہوتا ہے۔ اس مہینے میں موسیقی کوئی مسلمان بھی سننا پسند نہیں کرتا جبکہ محرم کے مہینے میں بعض بے درد لوگ جو اپنے آپ کو بڑا مذہبی بتاتے ہیں' اپنی شادی کی دعوتیں کرتے اور لوگوں کو اس میں مدعو کر کے اس کا اشتہار کرا سکتے ہیں اور اس پر لوگوں کو اعتراض بھی نہیں ہے تو رمضان کے مہینہ میں روزہ داروں کی صالح تفریح پر اعتراض اور پابندی کیوں ہے؟ کیا روزہ رکھنا کوئی جرم ہے کہ اس پر ہر قسم کی پابندی عائد کی جائے۔ اس کا جواب مجھے ضرور سمجھایئے۔

والسلام

حجاب امتیاز علی

یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹر اسرار نئے نئے مولویت کے میدان میں اترے تھے اور اسلام کی اپنے رنگ سے تعبیر کر رہے تھے۔ عورتیں خاص طور پر اس تعبیر کی زد میں تھیں۔ آئے دن اخباری بیان جاری کرتے تھے اور ادھر ان کا بیان جاری ہوا اور ادھر بیگم حجاب

کا فون موصول ہوا۔

''انتظار صاحب! آپ نے ڈاکٹر اسرار کا بیان پڑھا۔ آپ اس پر کیا لکھ رہے ہیں؟''

کبھی جواب میں پورا خط لکھ ڈالتیں۔

''میں نے بھی اسلام کے بارے میں تھوڑا غور و فکر کیا ہے۔''

''اچھا'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''میں نے اسلامی نظام کا ایک خاکہ بھی تیار کیا تھا۔ بھٹو صاحب کو بھیجا تھا۔ ان کی طرف سے جواب نہیں آیا۔''

مطلب یہ کہ یہ رومانی روح ویسے تو آسمان کی بلندیوں میں مائل پرواز رہتی تھی مگر زمین پر اتر کر حقیقی معاملات و مسائل سے بھی خوب نبٹتی تھی۔ باقی آسمان کی بلندیوں میں پرواز صرف تخیلی سطح پر نہیں تھی' سچ مچ پرواز کر کے بھی دکھایا۔

ایک دفعہ میں نے ان سے پوچھا کہ ''آخر آپ کو ایئر یا پائلٹ بننے کا خیال کیسے آیا؟''

بولیں ''نیلا آسمان مجھے بلاتا رہتا تھا۔ بے حد جی چاہتا تھا کہ کھلی فضا میں بلندیوں میں اڑتی اڑتی نیلے آسمان کو جا چھوؤں۔ اسی جذبے سے سرشار میں فلائنگ کلب میں جا شامل ہوئی اور ایئر پائلٹ بن گئی۔ انتظار صاحب! میں لینڈنگ بہت اچھی کرتی تھی۔ پتہ ہے یہ تربیت میں نے کس سے حاصل کی۔''

''کس سے؟''

''چیل سے۔ چیل میری استاد ہے۔ میں لان میں بیٹھی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ایک چیل اڑتی اڑتی آئی اور لان میں اتر پڑی۔ جس طرح پنجوں کو جوڑ کر وہ نیچے اتری' اس سے مجھے سبق ملا کہ جہاز کو بھی بس اسی طرح اتارنا چاہیے۔''

بلیوں سے انہوں نے کیا سیکھا۔ یہ کبھی نہیں بتایا۔ اگرچہ وہ بلیوں کی عقل و دانش کی بہت قائل تھیں۔ کہنے لگیں ''پتہ نہیں لوگ سیامی بلیوں کے کیوں اتنے شیدائی ہیں۔ وہ تو بہت غبی ہوتی ہیں۔ ہمارے گلی محلوں میں جو بلیاں گھومتی پھرتی ہیں' ماشاء اللہ وہ بہت سمجھدار اور عقل مند ہوتی ہیں۔''

ایک زمانے میں ان کے اردگرد اٹھائیس بلیاں منڈلاتی رہتی تھیں۔ انہیں کے بیچ بیٹھ کر اس شان سے لکھتی تھیں کہ ان کا تخیل نیلے آسمان کی خبر لاتا تھا۔ لیجیے ان کے یہاں منعقد ہونے والی ایک محفل یاد آ گئی۔

''انتظار صاحب۔ کل شام غروب آفتاب کی محفل ہے۔ آپ تشریف لا سکیں گے۔''

''غروب آفتاب کی محفل؟'' میں چکرایا۔

''آپ کو کیا پتہ نہیں ہے کہ کل سال کا آخری دن ہے۔ اس برس کے سورج سے کل ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ میں نے کچھ دوستوں کو جمع کیا ہے۔ آپ بھی آیئے۔''

میں پہنچا۔ سخت ٹھنڈی شام تھی۔ مہمان اندر ٹھنسے بیٹھے تھے۔ بار بار بیگم حجاب باہر سے خبر لے کر آتیں۔ ''دیکھئے دھوپ اب جا رہی ہے۔ یہ اس برس کی آخری دھوپ ہے۔ سورج بس ڈوبنے والا ہے۔ کل جو دھوپ نکلے گی وہ یہ نہیں ہوگی۔ اس سے ملاقات کر لیجئے۔''

مہمان پھر بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے تو انہوں نے ہار کر دروازہ کھول دیا۔ باہر سے سخت ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ کچھ مہمان ان کے منہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر آئے۔ ان میں میں بھی تھا مگر افسوس کہ سورج اس وقت تک ڈوب چکا تھا۔ مہمانوں کی اس بے حسی سے وہ کچھ کبیدہ خاطر نظر آ رہی تھیں۔ ایک عادت قائداعظم اور بیگم حجاب میں مشترک نظر آئی۔ کہتے ہیں کہ قائداعظم نے اپنی سج دھج میں قرینہ آخری دنوں تک برقرار رکھا۔ بیماری کے عالم میں بھی اسی طرح شیو کا اہتمام کرتے' اسی طرح کا لباس میں قرینہ۔ بیگم حجاب کا معاملہ بھی یہی تھا۔ مینہ بوندی ہو' جاڑا پالا ہو' دکھ بیماری ہو' مجال ہے ان کی سج دھج میں کوئی فرق آ جائے۔ وہی قرینہ' اسی قسم کا نظم وضبط انہوں نے من وسلویٰ میں بھی قائم کرنے کی کوشش کی۔ اسی لیے ایک ایک شرط جزئیات کی حد تک طے کی۔ من وسلویٰ نے جب سال گزار لیا تو باقاعدہ اس کی رپورٹ لکھی اور بتایا کہ ''اس دوران حجاب امتیاز علی' ادا جعفری' جمیلہ ہاشمی' صلاح الدین محمود' منظور الٰہی' کشور ناہید اور یوسف کامران کے گھروں پر محفلیں منعقد ہوئیں جن میں وقتاً فوقتاً فیض جمیلہ ہاشمی' حجاب امتیاز علی اور انتظار حسین نے کہانیاں پیش کیں اور منظور الٰہی نے مضامین پیش کیے۔ اس کے علاوہ احمد ندیم قاسمی' جمیل الدین عالی' محمد خالد اختر' محمد کاظم' امجد اسلام امجد' حبیب جالب' عطا شاد' جمیل جالبی' بیگم سردار جعفری' مختار مسعود اور مستنصر حسین تارڑ بھی محفلوں میں صدر کی اجازت سے بطور مہمان شامل ہوئے۔''

مگر بیگم حجاب کا مطلوبہ قرینہ اور امن وامان یہاں کتنے دن برقرار رہ سکتا تھا کہ یہ تو اصلاً عورتوں کی محفل تھی۔ مرد تو آٹے میں نمک کی نسبت سے تھے۔ اب ذرا تصور کیجئے کہ برتن بھی اکٹھے کھے جائیں تو ضرور کھنکتے ہیں اور یہاں تو بیبیاں تھیں۔ لکھنے والی بیبیاں' کیا کم تھیں کہ ان میں لکھنے والوں کی بیگمات بھی آن شامل ہوئیں۔ جلد ہی کٹا چھنی شروع ہوگئی۔ خیر کشور نے جو سلسلہ شروع کیا تھا' وہ تو ہمارے کلچر کے عین مطابق تھا۔ دیکھئے غیبت تو ہمارے کلچر کا جزو لاینفک ہے اور یہاں من وسلویٰ کے ضابطہ سے مطابق آنے کا وقت

مقرر تھا' جانے کا وقت مقرر نہیں تھا تو جو جوڑے جلدی رخصت ہو جاتے تھے' وہ تو اپنی خوشی سے خطرہ مول لیتے تھے۔ ایک کشور ہی نہیں' چند ایک اور دانے دیر تک بیٹھتے۔ جلدی جانے والے اپنے طور اطوار سے' اپنی نشست و برخاست سے ان کی محفل کے لیے غذا فراہم کر جاتے۔

جلد ہی لڑائیاں شروع ہو گئیں اور تو اور دو بہنیں لڑ پڑیں۔ جلد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ جمیلہ ہاشمی اور سائرہ ہاشمی اب ایک جنگل میں نہیں رہ سکتیں۔ لڑائیاں بھائیوں میں زیادہ ہوتی ہیں' ہابیل قابیل کے وقت سے ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ بہنیں بالعموم نہیں لڑتیں مگر ایک مرتبہ لڑ پڑیں تو پھر انہیں اللہ ہی ملائے تو ملیں۔

یوں سمجھئے کہ ہمارے ادب میں یہ بیبیوں کا زمانہ تھا۔ وہ زمانہ کبھی کا ختم ہو چکا تھا جب ایک طرف انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ گرم ہوتا تھا' دوسری طرف حلقہ ارباب ذوق کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ ادب اس وقت ایک زندہ طاقت نظر آتا تھا۔ انجمن تو جلد ہی سرکاری عتاب میں آ کر ختم ہو گئی اور ترقی پسند تحریک تتر بتر ہو گئی۔ حلقہ نے لمبی اننگ کھیلی۔ پھر اس پر بھی برے دن آئے۔ پہلے دو ٹکڑوں میں بٹا' پھر دونوں حلقوں کا بستر لپٹ گیا۔ اب مبارک احمد مسیحا بنے ہوئے تھے اور مردے میں جان ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے مگر زمانہ بدل چکا تھا۔ اب زمانہ یہ تھا کہ جو لکھنے کے معاملہ میں سنجیدہ ہے' وہ گھر کے کونے میں بیٹھ کر لکھے۔ باہر ادب کی صورت یہ تھی کہ ایک طرف وہ ذریعہ حصول مراعات تھا' دوسری طرف نقل محفل۔ بیبیوں نے کیا خوب محفلیں سجائی تھیں کہ ہم خرما و ہم ثواب۔ شعر و افسانہ بھی اور کھانا دانہ بھی مگر ان محفلوں میں جلد ہی درہمی پیدا ہو گئی۔ من و سلویٰ کا حلقہ خاص منتشر ہو گیا۔

جعفری صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا۔ ادا جعفری اسلام آباد چلی گئیں۔ بہن نے بہن سے لڑ کر اپنی بزم الگ آراستہ کر لی اور اس زعم کے ساتھ کہ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے۔ گھروں کی دیوار سے جو دیوار ملی ہوئی تھی۔ پروانوں کو مشکل پیش آتی کہ اس گیٹ میں داخل ہوں یا برابر والے گیٹ میں۔ بہر حال من و سلویٰ والی مخلوق کا ٹھیکہ تھوڑا ہی تھا۔ شہر رنگ رنگ کے ادیبوں سے پٹا پڑا تھا۔ اس پر مستزاد وہ مخلوق جو وقت ضرورت ادیب کے طور پر کام آتی ہے۔ تو اس بی بی کو ہم نفس وافر مقدار میں میسر آ گئے۔

گھریلو ادبی محفل کا جو نسخہ لاہور میں تیار ہوا تھا' وہ ادا جعفری کے واسطے سے اسلام آباد اور اسلام آباد سے کراچی پہنچا۔ اسلام آباد میں بیٹھ کر انہوں نے ''سلسلہ'' کے نام سے اسی والی نہج پر محفلوں کا یہ سلسلہ شروع کیا۔ وہاں جا کر اس کاروبار میں ایک نیا پیچ پڑا۔ آپ جانیں کہ اسلام آباد تو گریڈوں کا شہر ہے۔ میل ملاقاتیں اسی حساب سے ہوتی ہیں۔ یوں انور الحسن جعفری بہت بھلے آدمی تھے۔ افسرانہ ٹھسا ان کے یہاں دور دور نظر نہیں آتا تھا۔ یاروں کے یار۔ ادب کے رسیا' خود بھی قلم گاہے گاہے چلاتے تھے۔ یاروں

کے چند ایک خاکے لکھے اور خوب لکھے مگر تھے تو بہر حال افسر اور سیکرٹری کی سطح کے افسر۔ ان دنوں شاید کیبنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کے یہاں جو ادیب جمع ہوئے' وہ نادانستہ بالعموم وہ تھے جو ساتھ میں افسر بھی تھے۔ ساتھ ساتھ جو ادب کے رسیا یہاں پہنچے' وہ بھی کسی نہ کسی طرح اسی افسر طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ شہر میں جو سرگرم ادیب تھے' ان میں سے تو اکا دکا ہی کوئی بڑا افسر ہوگا' باقی تو سب چھوٹے گریڈ والے ہی تھے۔ انہوں نے ''سلسلہ'' کے خلاف لام بندی شروع کر دی۔ یہ تھا لاہور اور اسلام آباد کا فرق۔ لاہور میں من وسلویٰ کے حلقہ میں جو ادیب جمع ہوئے' وہ اطمینان سے کھاتے پیتے اور ادب بگھارتے رہے۔ لاہور کے باقی ادیبوں نے اس کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ کسی کو مہمان بطور بلایا تو وہ وہاں چلا گیا مگر اسلام آباد کے ادیبوں کے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔

اسلام آباد ادیبوں کو اس وقت ممتاز مفتی کی قدر معلوم ہوئی۔ اصل میں اس وقت انہیں ایک جانے مانے سینئر ادیب کی اشد ضرورت تھی۔ بس انہوں نے مفتی صاحب کو اپنا بزرگ مانا اور ان کے سائے میں اپنا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں مجھے بھی ایک دفعہ شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ادب کی ڈشیں تو ویسی ہی تھیں جیسی اسلام آباد میں تیار ہو سکتی تھیں' باقی دسترخوان انواع واقسام کی ڈشوں سے آراستہ تھا اور ہر ڈش خوب اور مرغوب۔

ہماری بیچاری آپا ادا جعفری بیگم حجاب کی بھی بری بنیں اور اسلام آباد میں بھی آنکھوں دانتوں پر چڑھیں۔ بیگم حجاب کو غصہ اس بات پر تھا کہ من وسلویٰ تو خاص ان کی ایجاد تھی' ادابی نے ان کی اجازت کے بغیر اس کا نام بدل کر اپنا ٹھپہ لگایا اور اسلام آباد میں چالو کر دیا۔ اس روز سے انہوں نے ادا جعفری کو بے وفا چڑیا کہنا شروع کر دیا۔

مگر خیر کراچی جا کر ''سلسلہ'' کے سارے داغ دھل گئے۔ یہاں ادا جعفری کے گرد جو ادیب اکٹھے ہوئے' وہ کم وبیش سب ادیب ہی تھے۔ کسی کی افسرانہ حیثیت تھی بھی تو اس میں افسرانہ بو نہیں تھی جو اسلام آباد بیوروکریٹ کا طرہ امتیاز ہے۔ مشفق خواجہ' مشتاق یوسفی' شان الحق حقی' جمیل جالبی۔ آپ ان میں سے کس پر انگلی اٹھا سکتے ہیں۔

دوسرا خیر کا پہلو یہ تھا کہ یہاں سلسلہ میں لاہور کی طرح بیبیوں کی ریل پیل نہیں تھی۔ نہ کوئی کشور ناہید' نہ کوئی جمیلہ ہاشمی۔ ادیبوں کی بیگمات بھی مجھے تو بالعموم امن پسند ہی نظر آئیں۔ تو یہاں لاہور والا نسوانی فساد پیدا نہیں ہوا۔

ادھر لاہور میں بیگم حجاب چند برس خاموش بیٹھی رہیں مگر پھر انہوں نے جھرجھری لی۔ اب کے انہوں نے بہت احتیاط برتی۔ پچھلے تلخ تجربے کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہوں نے من وسلویٰ کا دائرہ محدود رکھا۔ صرف انہیں اکٹھا کیا جن کی وفاداریاں طے شدہ تھیں۔ میں ان کا پرانا نیاز مند' صلاح الدین محمود نفیس وشائستہ آدمی اور سراپا ادب' شیخ منظور الٰہی سے دیرینہ وضع دارانہ تعلقات' جمیلہ ہاشمی اللہ

کو پیاری ہو چکی تھیں۔ کشور کے کانوں میں انہوں نے بھنک نہیں پڑنے دی اور ہاں نثار عزیز۔ نثار عزیز اسلام آباد میں تھیں تو وہاں ادا جعفری کا دست بازو اور سلسلہ کی رکن رکین۔ یہاں آ کر انہوں نے اپنی حجاب آپا کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور ان کی مریدنی خاص بن گئیں۔

تو اب من وسلویٰ پر بیگم حجاب کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ کہیں دن تو ہم کہیں دن' وہ کہیں رات تو ہم کہیں رات۔ جاوید قریشی کو رکن بنایا گیا تھا مگر جب وہ پنجاب کے چیف سیکرٹری بن گئے تو وہ غیر حاضر رہنے لگے۔ بیگم حجاب نے فوراً کاغذی کارروائی کی اور حلقہ سے انہیں خارج کر دیا۔ مگر شیخ منظور الٰہی بہت قرینے کے آدمی نکلے۔ جب بینظیر حکومت کے ختم ہونے کے بعد عبوری حکومت میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنے تو من وسلویٰ کے احباب کو وزیر اعلیٰ کے ڈنر میں مدعو کیا اور معذرت کی کہ اب وہ تھوڑے عرصے تک من وسلویٰ میں شریک نہیں ہو سکیں گے۔ چھٹی کی درخواست منظور ہوئی۔ مگر خیال تھا کہ چھٹی لمبی ہو گی۔ مگر اس وقت کے صدر فاروق لغاری کی بے بصیرتی کی وجہ سے عبوری حکومت کا زمانہ مختصر ہی رہا۔ شیخ صاحب جلدی واپس آ گئے۔

جاوید قریشی کی رخصتی سے پیدا ہونے والے خلا کو حمید اختر نے پر کیا۔ مگر کمی شاعر کی پڑی تھی۔ حمید اختر اس کمی کو کیسے پورا کرتے۔ یہ کمی ظفر اقبال کو لا کر پوری کی گئی۔ ظفر اقبال یاروں کے حلقہ میں بدنام ہوں گے۔ یہاں تو انہوں نے کوئی فساد پیدا نہیں کیا مگر پھر بیگم حجاب کی صحت بھی تو جلد ہی جواب دے گئی۔ وہ بستر سے لگ گئیں اور من وسلویٰ کی نشستیں موقوف۔ بلیوں کی انجمن تو پہلے ہی درہم برہم ہو چکی تھی۔ اب من وسلویٰ کی محفل بھی اجڑ گئی۔ میں نے باتوں باتوں میں یونہی پوچھ لیا کہ ''اب آپ کے یہاں بلیاں نظر نہیں آتیں۔''

اس پر بہت افسردہ ہوئیں۔ بولیں ''انتظار صاحب! بلی آدمیوں سے بڑھ کر خدمت مانگتی ہے۔ میں اب تھک گئی ہوں۔ بلیوں کی خدمت نہیں کر سکتی۔''

آخر میں بس ایک بلی رہ گئی تھی۔ وہ شاید اس بلی کی اپنی سعادت مندی تھی۔ بیگم حجاب کو تو اب اپنا وجود دوبھر لگتا تھا۔ بلی کی دیکھ بھال کیا کرتیں۔ بس یہ اس بلی کا پاس وفا تھا کہ وہ ان کا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ یہ شاید ہماری ان سے آخری ملاقات تھی۔ نثار عزیز' اصغر بٹ بھی ساتھ تھے۔ ہم ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھے۔ اکیلی وفا شعار بلی نے آ کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ افسردہ نظروں سے ہمیں دیکھا' پھر ہمارے بیچ آنکھیں موند کر بیٹھ گئی۔ جیسے بیگم حجاب کی طرف سے معذرت کر رہی ہے۔ بیگم حجاب اب اس قابل نہیں رہی تھیں وہ چل کر یہاں آ سکتیں ورنہ پہلے تو جیسا بھی حال ہوتا' اسی قرینے کے ساتھ کسی نہ کسی طرح ہمارے پاس آ کر بیٹھتی

تھیں۔ آج ہمیں خود ان کے کمرے میں جانا پڑا۔ نقاہت طاری تھی۔ مشکل سے آنکھیں کھولیں اور اچانک ایک سوال کیا ''انتظار صاحب! آپ خدا کو مانتے ہیں؟''

''جی، مانتا ہوں اور آپ؟''

اس پر چپ ہو گئیں۔ تامل کے بعد بولیں ''جب میں صبح کو اٹھتی ہوں تو اس وقت تو خدا پر میرا ایمان برقرار ہوتا ہے مگر'' رکیں، پھر بولیں ''دن ڈھلتے ڈھلتے مجھے وسوسے آن گھیرتے ہیں۔ شام کو میں اس کے وجود سے منکر ہو جاتی ہوں۔''

اسی رو میں انہوں نے چند اور باتیں کہیں۔ میں نے پوچھا ''آپ کو آخر اللہ میاں سے شکایت کیا ہے؟''

''بہت شکایتیں ہیں۔ دیکھئے انتظار صاحب! موٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو مکینک ٹھوک پیٹ کر کے اسے چالو کر دیتا ہے اور ہمیں تو اللہ نے خود بنایا ہے۔ ہمارے سارے کل پرزے اس کی نظر میں ہیں۔ سو اگر ہمارے کسی پرزے میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے تو اسے اس خرابی کو درست کر دینا چاہیے۔ یہ اس کا فرض ہے۔ آخر جب اس نے مجھے دو ٹانگیں دی ہیں تو میں کیوں چل پھر نہیں سکتی؟''

یہ بیگم حجاب سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ شاید ان کی شکایت دربار الٰہی تک پہنچ گئی تھی۔ بات کسی ایک کل پرزے کی خرابی کی نہیں تھی، معاملہ بہت آگے جا چکا تھا۔ اللہ میاں نے پھر انہیں اپنے پاس ہی بلا لیا۔ رومانی عہد کی ایک روح جو ہمارے درمیان بھٹکتی رہ گئی تھی، اس غیر رومانی زمانے میں لمبا وقت گزار کے آخر کے تئیں سدھار گئی۔

◆◆◆

سیاسی مبصر، منجم، افواہ ساز سب ہار گئے

جنرل ضیاء الحق ہنوز دندنا رہے تھے۔ ان کا جرنیلی بندوبست بھی زوروں میں جا رہا تھا۔ سیاسی مبصر' افواہ ساز' نجومی سب نے اپنی اپنی سی کر دیکھی۔ جس جس کے ترکش میں جتنے تیر تھے اس نے سب چلا ڈالے۔ ضیاء الحق کا بال بیکا نہیں ہوا۔ پورا ملک ہی افواہوں' سیاسی قیاس آرائیوں اور منجمانہ پیشین گوئیوں کی زد میں تھا۔ پھر بھی کم از کم لاہور شہر کی حد تک ٹی ہاؤس کو ایک گونہ امتیاز حاصل تھا۔ شہر میں جس وکیل' جس صحافی' جس پروفیسر کو جو افواہ یا جو پیشین گوئی دستیاب ہوتی یا اس نے بی بی سی پر جو مطلب کی بات سنی ہوتی یا ٹائم یا نیوز ویک میں پڑھی ہوتی' اسے لے کر ٹی ہاؤس پہنچتا کہ شہر میں ایک یہ ٹھکانا تھا یا منڈی جہاں اس طرح کے ہر مال کی بہت کھپت تھی۔ ان دنوں ٹی ہاؤس میں کچھ زیادہ ہی مجمع رہتا تھا۔ وہ زمانہ تو کبھی کا گزر چکا تھا' جب یہاں زور و شور سے بحث ادبی مسائل پر ہوا کرتی تھی۔ بین الاقوامی صورتحال ہو یا ملک کا سیاسی احوال بس ضمنی طور پر ہی زیر بحث آتا تھا لیکن ادب اب پس منظر میں چلا گیا۔ کہاں کی رباعی' کہاں کی غزل' اب تو مارشل لاء اعصاب پر سوار تھا۔ ہر پھر کر وہی ایک چیک کہ پاکستان کو جرنیل صاحب سے رہائی کب مل رہی ہے؟ ایسے میں کیا ادیب' کیا غیر ادیب۔ جس کے پاس کوئی خبر' کوئی افواہ' کوئی پیشین گوئی' کوئی ٹوٹکا ہوتا' اسے ٹی ہاؤس کی میزوں پر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ محض اور صرف ادب پر تکیہ کرنے والوں کے لیے اب یہاں کسی میز پر کوئی جگہ نہیں تھی۔ سوز اہد ڈار کو بھی اپنی کتاب بغل میں داب کر یہاں سے کنارہ کر کے گھنٹوں کے حساب سے باہر فٹ پاتھ کے جنگلے کے سہارے کھڑا رہنا پڑتا۔

اس عالم میں یار عزیز احمد بشیر نے ایک سیاسی مبصر کی حیثیت سے ٹی ہاؤس میں قدم رکھا اور دیکھتے دیکھتے اپنے گرد معتقد سامعین کا ایک مجمع جمع کر لیا۔ اس کے تجزیے خالص مارکسی ہوتے تھے اور ان کی رو سے ضیاء الحق کا فوری زوال صاف صاف نظر آتا تھا۔ اس لیے ان میں بہت جان اور بہت اپیل تھی۔ احمد بشیر کو جب میں نے ''امروز'' میں دیکھا تھا تو اس وقت وہ ترقی پسندوں سے دور اور ممتاز مفتی سے قریب تھا۔ سو جب عارف عبدالمتین کو اپنے مارکسی جوش خروش کی بدولت ادب لطیف کی ادارت سے ہاتھ دھونے پڑے تو وہ مجھے ممتاز مفتی کے اس غصے میں برابر کا شریک نظر آیا تھا جو مفتی صاحب کے ادب لطیف کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے عارف عبدالمتین کے خلاف پیدا ہو گیا تھا مگر تب سے اب تک زمانہ بہت بدل چکا تھا اور ہم میں سے کتنوں کی فکر و نظر میں بڑی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ شاید میں خود بھی اب اس طریقہ سے تو نہیں سوچتا جس طرح اس زمانے میں سوچتا تھا۔

اب احمد بشیر کا ایمان اور ایقان مارکسیت میں تھا اور اس فلسفہ میں اس نے اتنی دسترس بھی پہنچائی تھی کہ اپنے ماسکو کے سفر سے فتح مند واپس آیا اور اب جب ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر پاکستان کی صورتحال کا شدہ مارکسی تجزیہ کرتا تو یاروں کو ضیاء الحق کا انجام کتنا قریب نظر آتا مگر جرنیل سخت جان نکلا۔ وہ احمد بشیر کے سارے مارکسی تجزیوں کو سہہ گیا۔ احمد بشیر کے تجزیے لمبے کھنچتے چلے گئے۔ ان میں تکرار کا رنگ پیدا ہونے لگا۔ ٹی ہاؤس کے عجلت پسند سامعین بے اطمینان نظر آنے لگے۔

تب احمد بشیر نے مقامی صورتحال کے تنگ دائرے سے نکل کر بین الاقوامی حالات کا جائزہ لینا شروع کیا اور تب اسے احساس ہوا کہ پاکستان کی صورتحال کا جائزہ اسے بین الاقوامی سیاق وسباق میں لینا چاہیے تھا۔ صحیح نتیجہ اسی صورت میں برآمد ہو سکتا تھا۔ بین الاقوامی افق پر اسے ایک عالمی جنگ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس امکان سے اس کے تجزیوں میں ایک نئی امید کی لہر دوڑ گئی۔ استدلال کچھ اس طرح کا تھا کہ یہ عالمی جنگ بہت خوفناک ہوگی۔ ایسا طوفان اٹھے گا کہ سامراجی طاقتوں کو بہا کر لے جائے گا۔ کسان مزدور ایک بے پناہ طاقت بن کر ابھریں گے۔ ملکوں ملکوں انقلاب آئیں گے۔ ضیاء الحق جیسے سامراج کے پالے ہوئے ڈکٹیٹر اس طوفان میں خس وخاشاک کی طرح بہہ جائیں گے۔

اس تجزیے سے سمجھ لو کہ سوکھے دھانوں پہ پانی پڑ گیا۔ ایک مرتبہ پھر دلوں میں امیدوں کے چراغ روشن ہو گئے۔ صرف زاہد ڈار کو اس تجزیے نے پریشان کیا۔ احمد بشیر نے عالمی جنگ کا نقشہ اتنا خوفناک کھینچا تھا کہ وہ دہل گیا۔ اس نے اپنے Pacifist ہونے کا اعلان کیا اور بولا ''اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ جیسے لوگ تو اس انقلاب کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہیں گے۔ انسان ہی زندہ نہ رہے تو ایسے انقلاب کا فائدہ کیا ہے۔''

احمد بشیر نے نحیف جثے والے زاہد ڈار کو بہت حقارت سے دیکھا ''تیری جان کی کیا حیثیت ہے۔ انقلاب جب آتا ہے تو ایسے بہت سے کیڑے مکوڑے مر جاتے ہیں اور انقلاب میں بہر حال جانیں تو جاتی ہیں۔''

''کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا''

انقلاب کا یہ تصور زاہد ڈار کو تو نہیں بھایا' باقی یار بہت پر امید نظر آ رہے تھے مگر عالمی جنگ اب ہوتی ہے نہ تب ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ پھر ٹی ہاؤس میں بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔ تب احمد بشیر نے ایک شام میز پر بیٹھتے ہی یہ سنسنی خیز اعلان کیا کہ ''لو بھئی عالمی جنگ سر پر آ گئی۔ 15 دسمبر کو شروع ہو جائے گی۔''

''15 دسمبر کو؟'' سب کے دل بلیوں اچھلنے لگے۔ یہ دسمبر 1979ء کا پہلا ہفتہ تھا۔ گویا ایک ہفتہ بعد عالمی جنگ کا پروگرام شروع ہونا

تھا۔

زاہد ڈار کو یقین نہیں آیا۔ اس نے سوالات کرنے شروع کر دیئے۔ بڑا سوال یہ اٹھایا کہ 15 دسمبر کی حتمی تاریخ جو دی گئی ہے' وہ کیسے طے ہو گئی؟

احمد بشیر نے وضاحت کی کہ ''عالمی صورتحال کا جو میں نے تجزیہ کیا ہے' وہ بھی یہی کہتا ہے اور نجوم بھی یہی کہتا ہے۔''

''وہ کونسا نجومی ہے جس نے یہ تاریخ دی ہے۔''

تب گولر کا پیٹ پھٹا ''کل میری شبلی بی کام سے بات ہوئی ہے۔ انہوں نے ستاروں کا حساب دیکھ کر بتایا ہے کہ 15 دسمبر کو عالمی جنگ شروع ہو جائے گی اور شبلی بی کام نے ستاروں کے حساب میں آج تک کبھی غلطی نہیں کی۔''

شبلی بی کام خوب آدمی تھے۔ عالمگیر اور نیرنگ خیال کے وقتوں سے ہم ان کا نام ان رسالوں میں پڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ''آفاق'' کے زمانے میں انہیں دیکھ بھی لیا مگر وہ اس اخبار کے آخری ایام تھے' جب وہ یہاں آئے تھے۔ اس لیے میں انہیں زیادہ دیکھ نہیں پایا۔ ہاں اسی زمانے میں انہوں نے ایم کام کیا تھا اور ان کا نام اچانک ایک بحران سے دوچار ہو گیا۔ وہ اس زمانے کے بی کام تھے' جب فلمی اشتہاروں میں لیلا چٹنس کے نام کے آگے بی اے اور ونمالا کے نام کے آگے بی اے بی ٹی لکھا جاتا تھا اور ''ساقی'' کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی بی اے تھے۔ اس زمانے کا ایم اے تو مجھے ایک ہی یاد آ رہا ہے۔ کرشن چندر ایم اے۔ رفتہ رفتہ ناموں سے یہ سرخاب کا پر غائب ہو گیا مگر شبلی بی کام کے نام کی ترکیب میں بی کام ایسا کھپا کہ نام کا جزو لاینفک بن گیا۔ اب اچانک انہوں نے ایم کام کر لیا تھا اور سوال یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ نام میں سے بی کام کو نکال کر ایم کام کا ٹانگ کیسے جڑا جائے مگر جلد ہی پتہ چل گیا کہ جس طرح کرشن نگر کو اسلام پورہ نہیں بنایا جا سکتا' اسی طرح شبلی بی کام کو شبلی ایم کام نہیں بنایا جا سکتا۔

سو شبلی بی کام' ایم کام ہو جانے کے بعد بھی شبلی بی کام ہی رہے۔ بس فرق اتنا پڑا کہ اب انہوں نے ''پاکستان ٹائمز'' میں انگریزی میں اقتصادیات پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں ان کی یہی مصروفیت تھی مگر احمد بشیر کو ان کے اقتصادیات تجزیوں سے زیادہ ان کے نجوم نے متاثر کیا۔ عالمی جنگ سے انہیں بھی بہت شغف تھا۔ کتنی مرتبہ وہ ستاروں کا حساب لگا کر عالمی جنگ کی پیشین گوئی کر چکے تھے مگر ہر مرتبہ ان کے حساب میں کوئی بال برابر کا فرق پڑ جاتا تھا اور اس لیے جنگ سے ہر مرتبہ ہم بال بال بچ جاتے تھے۔ یوں سمجھئے کہ ان کے ستاروں کے حساب میں جو بال برابر کی کسر چلی آ رہی تھی' اس کی وجہ سے دنیا ابھی تک تہہ و بالا ہونے سے بچی ہوئی تھی مگر اس مرتبہ ان کے ستاروں کے حساب کو احمد بشیر کے سیاسی تجزیئے کی بھی کمک حاصل تھی۔ سوٹی ہاؤس میں یہ طے سمجھا جا رہا تھا کہ 15 دسمبر

کو عالمی جنگ برپا ہونے والی ہے۔

اس برس ٹی ہاؤس میں 15 دسمبر کا بڑی شدت سے انتظار کیا گیا۔ ایک ایک دن پہاڑ بن گیا مگر 15 دسمبر آئی اور گزر گئی۔ جنگ چھڑنے کی کوئی خبر نہیں آئی اور اس شام احمد بشیر نے بھی ٹی ہاؤس آنا مناسب نہیں سمجھا۔ یار بہت مایوس ہوئے۔ احمد بشیر کی سیاسی بصیرت اور شبلی بی کام کی ستارہ شناسی دونوں کا ستارہ گردش میں آ گیا۔ دوسرے تیسرے دن جب احمد بشیر نے یہاں صورت دکھائی اور اس سے تابڑ توڑ سوال کیے گئے تو اس نے زچ ہو کر جواب دیا کہ ''فوجیں تو مقابل آ کھڑی ہوئی تھیں۔ اب اگر وہ آگے قدم نہ بڑھائیں تو اس میں ستاروں کا کیا قصور ہے اور میرے سیاسی تجزیے کی کیا خطا ہے؟''

اسی ہنگام ایک وکیل صاحب ایک اولیائی شان کے ساتھ یہاں نمودار ہوئے۔ انہوں نے تابڑ توڑ ایسی ہنگامہ خیز پیشین گوئیاں کیں کہ انقلاب کے بھوکے احمد بشیر سے ٹوٹ کر ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ جنرل ضیاء الحق کے زوال کی جو انہوں نے پیشین گوئیاں کیں' ان میں انہوں نے یہ احتیاط برتی تھی کہ تاریخ کا تعین نہیں کیا مگر ایک پیشین گوئی کرتے ہوئے سامعین کی بے چینی اور بے صبرے پن کو دیکھ کر ان سے چوک ہو گئی۔ انہوں نے پیشین گوئی کی کہ ایک ہفتے کے بعد ہندوستان میں مارشل لاء لگ جائے گا۔

اس پیشین گوئی میں یاروں کے لیے تسکین کا بہت سامان تھا۔ اکثر یہ ہوا ہے کہ ہندوستان کی مصیبت کو دیکھ کر ہمیں اپنی مصیبت گوارا نظر آنے لگی جیسے ہمسایہ کی مصیبت سے ہماری مصیبت کی تلافی ہو گئی ہو۔ اگر ہمارے یہاں مہنگائی ہے تو چلو کوئی حرج نہیں' ہندوستان میں بھی تو مہنگائی بہت ہو گئی ہے۔ بس کچھ اسی قسم کی تسکین کا سامان اس پیشین گوئی میں تھا تو ایک ہفتہ اس خوشی اور انتظار میں گزرا مگر ہفتہ گزرا' عشرہ گزرا' پندھرواڑہ گزرا۔ ہندوستان میں مارشل لاء نہیں لگا۔ بس اس کے ساتھ وکیل صاحب کا ٹی ہاؤس میں زوال ہو گیا۔

سو کتنے سیاسی مبصر اور منجم ضیاء الحق کے زوال کی پیشین گوئیاں کرتے ہوئے آئے' دم بھر کے لیے چمکے اور ماند پڑ گئے۔ ان پیشین گوئیوں نے یاروں کی تسکین کا سامان بہت فراہم کیا مگر جرنیل کا کچھ نہیں بگاڑا۔ جس طرح ایم آر ڈی کی شوراشوری نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ جرنیل صاحب کی سیاست زوروں پر جا رہی تھی۔ پاک ہند تعلقات کے معاملہ میں ان کی کرکٹ ڈپلومیسی نے شہرت پائی۔ یہ ڈپلومیسی کرکٹ کو راس آئی۔ ہندوستان پاکستان کے بیچ کرکٹ میچ زور و شور سے ہوئے۔ تھوڑا بھلا ادیبوں کا بھی ہو گیا۔ کرکٹ کے طفیل ادیبوں کو بھی تھوڑا آنے جانے کا موقع مل گیا۔ سیمیناروں' مشاعروں کے بہانے کچھ ادیب یہاں سے وہاں گئے۔ سیمیناروں کی تو ہمارے یہاں روایت ہی نہیں ہے۔ مشاعروں کے بہانے البتہ کتنے شاعر وہاں سے یہاں آئے مگر مشاعروں کا شہر تو

اصل میں کراچی ہے۔ لاہور نے تو زمانہ ہوا اس کاروبار سے فراغت حاصل کر لی تھی۔

بہانے بہانے کچھ ادیب لاہور بھی پہنچے مگر دھوم جو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور رام لال کی ہوئی' وہ پھر کسی کو میسر نہیں آئی۔ رام لال بیچارے سیدھے سادھے افسانہ نگار مگر اس شہر میں کیا ان کی آؤ بھگت ہوئی۔ یہاں آ کر انہوں نے اعلان کیا کہ میں تو میانوالی کی مٹی ہوں۔ اس مٹی کو چھوئے بغیر کیسے واپس چلا جاؤں۔ میانوالی والے انہیں میانوالی لے گئے۔ کہتے ہیں کہ وہاں ان کا زبردست استقبال ہوا۔ جب وہ واپس ہندوستان چلے تو دو قیمتی تحفے ان کے ساتھ تھے۔ ایک تو میانوالی کی مٹی سے بھری ہنڈیا اور دوسرا ہیما مالنی کے نام مبارک احمد کا منظوم محبت نامہ۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جب پہلی مرتبہ کراچی ہوتے ہوئے لاہور پہنچے تو ان کے استقبال کا خاص اہتمام ہوا۔ کتنی کاروں کا قافلہ مہمان کو لینے کے لیے ایئر پورٹ جائے گا' لنچ کہاں ہوگا' سہ پہر کو چائے اور پھر تقریب کا اہتمام کیا ہوگا اور رات کو ڈنر کس گھر ہوگا۔ اگلی صبح پہلے شاہی قلعہ' پھر مقبرہ جہانگیر' پھر شالامار باغ' پھر میوزیم اور پھر لنچ سہ پہر کو۔ تقریب کہاں اور کیسے۔ ڈنر کا اہتمام کس کی طرف سے۔ جب کشور نے اس نہج پر پروگرام ترتیب دے کر میرے اور ریاض انور کے حوالے کیا تو میں نے دل میں کہا کہ یا اللہ ہندوستان سے یہ کوئی ادیب آ رہا ہے یا وزیر اعظم ہند تشریف لا رہے ہیں۔ ہم ٹھہرے اناڑی مگر کشور نے تو غیر ملکی مہمانوں کے لیے سرکاری انتظامات دیکھ رکھے تھے۔ اسی نہج پر اس نے یہ پروگرام ترتیب دیا اور مجال ہے کہ شیڈول میں ذرا بھی فرق پڑا ہو اور نارنگ صاحب ٹھہرے تقریر اور تحریر دونوں کے بادشاہ۔ شہر کو لوٹ لیا۔ بڑا کھانا کشور کے یہاں کشور باہر سے آنے والے مہمان کی تواضع صرف کھانے وانے سے نہیں کرتی بلکہ محفوظ ذخیرے میں سے کچھ شاعر نام کے دانے بھی پیش کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ انواع و اقسام کے کھانے کھائے۔ اب یہ مزہ بھی چکھو مگر جس شاعر کو یہاں پیش کیا' وہی بعد میں دشمن جان بن گیا۔

بیگم نارنگ کو اچانک یاد آیا یا سمجھ لو کہ اچانک ہمیں بتایا کہ میں نے تو اسی شہر میں آنکھ کھولی تھی۔ جس محلہ میں تھا ہمارا گھر' اس کا نام تھا قلعہ گوجر سنگھ۔ میں اپنا گھر دیکھوں گی۔ ہم نے کہا کہ بھابھی صاحب' ہم آپ کو قلعہ گوجر سنگھ لے تو چلیں لیکن یہ سوچ لیں کہ دہائیاں بیت چکی ہیں' وہاں کا نقشہ کچھ سے کچھ ہو چکا ہوگا۔ آپ اپنا گھر پہچان بھی لیں گی۔ اعتماد سے بولیں کہ پہچان لوں گی تو ہم انہیں لے کر قلعہ گوجر سنگھ پہنچے۔ گلی گلی گھومے' ایک ایک گھر کو غور سے دیکھتیں اور آگے بڑھ جاتیں۔ اچانک ایک گھر کو دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ غور سے در و دیوار کو دیکھا اور پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ زار و قطار رو رہی ہیں۔ پھر سسکیاں لینی شروع کر دیں۔

صاحب مکان نے باہر نکل کر تعجب سے ہمیں دیکھا۔ میں نے اور ریاض انور نے بڑھ کر انہیں سمجھایا کہ آپ پریشان نہ ہوں۔

یہاں کسی کی نیت بد نہیں ہے۔ یہ ہندوستان سے ہماری مہمان آئی ہیں اور اپنا گھر ڈھونڈ رہی ہیں۔ بس اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہیں۔ اب جو آپ کا گھر ہے' کبھی یہ ان کا گھر تھا۔

''پھر باہر کیوں کھڑی ہیں۔ آپ انہیں اندر لے کر آئیں۔''

صاحب خانہ نے جلدی جلدی چائے کا اہتمام کیا۔ مکان بھی دکھایا اور چائے بھی پلائی۔

لیجئے اس ذکر سے میرے اندر کھد بد ہونے لگی۔ مجھے اپنی بستی' اپنی گلی' اپنا گھر یاد آنے لگا ہے۔ تو لاہور کو تھوڑی دیر کے لیے سلام۔

◆◆◆

بوئے آوارہ

میں جب علی گڑھ پریم چند سیمینار میں شرکت کی غرض سے گیا تھا تو ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بھی تھی کہ لگے ہاتھوں ڈبائی میں بھی جھانک آئیں گے اور اب میرے تصور میں وہ صبح جگمگانے لگی ہے۔ جب صبح ہی صبح میں اور عالیہ کار میں بیٹھ کر ڈبائی کی طرف چلے تھے۔ ابوالکلام قاسمی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ پورا راستہ میرے تصور میں پھیلتا جا رہا ہے۔ میں پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ارے اتنے درخت ہیں یہاں سے وہاں تک اور اتنے پرندے رنگ رنگ کے۔ کوئی تو پہچانے گا مجھے۔ اے لو پرانی شناسائی نکل آئی۔ مقبرہ۔ میں چونکتا ہوں اچانک گردوپیش سے میرا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہ جو میرے دائیں سمت ایک شکستہ مقبرہ ہے اور دانپور کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جب ہمارا اکہ ڈبائی سے چل کر دھول میں اٹا ہوا' کنکروں والی سڑک پہ دوڑتا ہوا جانے کتنا لمبا رستہ طے کر کے اس مقبرے کے قریب سے گزرتا تو ہم جان لیتے کہ بس اب دانپور آیا چاہتا ہے تو میں یہیں سے مڑ کر دانپور کی طرف کیوں نہ ہولوں۔ اور ڈبائی؟ ارے ڈبائی کو دیکھنا اب ہماری قسمت میں کہاں ہے۔ جیسے گھوڑا دریا کنارے پہنچ جائے اور پھر پیاسا چلا آئے۔ کنارے کو تو چھو لیا تھا۔ کنارے ٹامک ٹوئیاں مار کر چلا آیا۔ بستی نے راستہ ہی نہیں دیا۔ دور ہی سے رستہ بتا دیا۔ بستیوں کو جذبات سے عاری مت جانو۔ روٹھتی ہیں تو پھر ایسا روٹھتی ہیں کہ نہ منائے منتی ہیں' نہ درشن دیتی ہیں۔

خیر اس وقت تو وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اب سمجھ میں آ رہی ہے جو بستی خواب ہو جائے اور افسانہ بن جائے' وہ پھر ان بلندیوں سے نیچے نہیں اترتی۔ تو اب میں اس دیار میں خوابوں اور افسانوں ہی کے واسطے سے پہنچ سکتا ہوں۔ فرض کیجیے میں وہاں پہنچ جاتا مگر اس بستی میں تو پھر بھی نہیں پہنچتا۔ گھوڑا جب دوسری بار ندی میں منہ ڈالتا ہے تو وہ پہلی والی ندی نہیں ہوتی۔ وہ ندی تو گزر چکی ہوتی ہے' اب یہ دوسری ندی ہوتی ہے مگر مجھے تو اس اپنی بستی میں داخل ہونے کا راستہ ہی نہیں ملا۔ پریشان تھا کہ وہ دھرم شالہ' وہ آموں کا باغ' وہ شفاخانہ' وہ اس کے بیچ پھولا ہوا باغیچہ' وہ سب کہاں ہیں جن کے بیچ سے بستی میں داخل ہونے کا اور اپنے محلہ میں پہنچنے کا رستہ نکلتا تھا۔ وہ سب رستے' وہ پگڈنڈیاں کہاں بہہ گئیں۔ تب میں نے سوچا کہ اس بستی میں داخل ہونے کے دو راستے تو مجھے میسر ہیں۔ میرے خواب' میری کہانیاں' پھر میں یہاں اجنبی رستوں میں کیوں خراب ہو رہا ہوں۔ جو بستی خواب اور افسانہ بن جائے۔ پھر اسے اسی عالم میں رہنا چاہیے' سو میں فوراً ہی پلٹ لیا۔

دانپور کی طرف جاتا تو بھی یہی ہونا تھا۔ ادھر نہیں گیا تو اب اطمینان سے تصور کرتا ہوں کہ دانپور میں سب گلیاں' سب گھر جوں کے توں ہیں۔ اسی طرح شاد آباد ہیں اور وہ خواب جیسا گھر۔ عقب میں کھڑی بلند و بالا املی چھت پر اسی طرح جھکی ہوئی ہے۔ صحن میں کھڑے نیم کے پیڑ نے اسی طرح صحن کے بڑے حصے کو ڈھک رکھا ہے اور وہ ہمارے بزرگ اسی طرح بر میں شیروانی' سر پر ترکی ٹوپی' ہاتھ میں لام کی شکل والا بید' اپنی سفید داڑھی کے ساتھ تیلیوں کے مونڈھے پر بیٹھے ہیں اور صحن سے متصل لمبے چوڑے احاطے میں اسی طرح مرغیاں چگتی پھر رہی ہیں۔ بطخیں شور مچا رہی ہیں۔ کبوتر چھتری پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ اچھا تو مجھے بتانا ہی پڑے گا کہ اس بستی سے میرا کیا تعلق ہے۔ تو پھر اپنے کچھ بزرگوں کا بھی ذکر کرنا پڑے گا۔ چلو جہاں اتنے ذکر اذکار کیے ہیں' بقدر نمک یہ ذکر بھی سہی۔ یہ بزرگ ہمارے دادا جان دلشاد علی تھے۔ دوسرے دادا صادق علی خان بہادری کے ٹھسے کے ساتھ آنریری مجسٹریٹ بنے ہاپوڑ میں بیٹھے تھے۔ اپنے دادا کو تو دیکھا نہیں' ان دو بزرگوں کو جو میرے والد کے ماموں ہونے کے ناطے ہمارے دادا تھے' خوب دیکھا۔ دونوں اپنے اپنے علاقے میں تھم کی طرح گڑے بیٹھے تھے اور بڑ کے پیڑ کی مانند اردگرد پر چھائے نظر آتے تھے۔ دانپور والے دادا ایسے عامل کہ آس پاس کے قصبات و دیہات میں جس کسی پر جن آ جاتے' وہاں جا کر حاضرات کرتے اور دم کے دم میں جنوں کا قلع قمع کر دیتے۔ وہ تو یہ کہیے کہ بزرگوں کا تھوڑا سا علم ہی انہیں ملا تھا' پورا کیسے ملتا۔ جب ان کے والد بزرگوار بستر مرگ پر تھے تو ایک ننگ دھڑنگ درویش جانے کس طرف سے نمودار ہوا۔ آ کر ان سے چمٹ گیا اور ان کا سارا علم سمیٹ کر لے گیا۔

میرے والد کو جدی علم میں سے کچھ نہیں ملا۔ ملتا کیسے' عمر بھر قرآن و حدیث میں غرق رہے۔ پیری فقیری کو خلاف اسلام جانتے تھے۔ پکے شیعہ تھے مگر مزاج وہابیانہ پایا تھا۔ مجلسوں میں اس لیے نہیں جاتے تھے کہ وہاں سوز خوانی ہوتی تھی۔ سوز خوانی پر انہیں وہی اعتراض تھا جو ان کے قول کے مطابق حضرت ناصر الملت کو اعتراض تھا اور پھر کس ذاکر کو سننے کے لیے جاتے۔ سب ان کی دانست میں منقولات میں گھوڑے دوڑاتے تھے' معقولات میں صفر تھے۔ خود مجلس پڑھنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ وعظ دینے کا جو شوق تھا مگر امام باڑے میں قدم اس وقت رکھتے جب اطمینان کر لیتے کہ سوز ہو چکے اور پڑھتے کیا تھے' نہ فضائل علی ابن ابی طالب' نہ خلافت کے مسئلہ پر بحث۔ اس مسئلہ پر بحث وہ اپنے سنی المذہب ممیرے پھپھیرے بھائیوں بھتیجوں کے ساتھ کرتے تھے۔ منبر پر بیٹھ کر ان کے موضوعات مختلف ہوتے تھے۔ زمین ساکن ہے یا گردش کرتی ہے' خدا ہے یا نہیں ہے' قرآن حادث ہے یا قدیم ہے یا پھر مسئلہ تناسخ یا سود کا مسئلہ اور پھر بیان ہے کہ لمبا کھنچتا چلا جا رہا ہے۔ سامعین ایک ایک کر کے کھسکنے لگتے۔ مجھے لگتا کہ آخر میں بس میں ہی ایک سامع رہ جاؤں گا اور بیان اسی شان سے جاری رہے گا لیکن آخری عمر میں جانے کیا سنک سوار ہوئی کہ جلالی وظیفہ پڑھنے بیٹھ گئے۔ اگر پورا

ہو جاتا تو ماموں کی ٹکر کے عامل ہوتے۔

ہمارے ہاپوڑ والے دادا جان ایسے کسی قصے میں نہیں پڑے۔ شرافت کے ساتھ سرکار انگلشیہ کی چاکری کر کے خان بہادر کا خطاب پایا۔ آخر میں آنریری مجسٹریٹ بن کر ہاپوڑ میں بیٹھے اور پورے خاندان کا ملجا و ماوی بن گئے۔ بیٹا (تصدق حسین) باپ سے بڑھ کر نکلا۔ خان بہادر کے ساتھ ادبی ای کا بھی خطاب حاصل کیا۔ جلدی ہی مرحوم ہو گئے۔

ارے یہ تو میں خاندانی تذکرہ کی راہ پر چل نکلا۔ تو دانپور اور ہاپوڑ دونوں موقوف اور ڈبائی کے متعلق تو میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ یہ بستی اب میرے حساب میں کسی اور اقلیم کا حصہ ہے۔ سو اس میں داخل ہونے کے راستے بھی اور ہیں۔ اوبڑ کھابڑ۔ یہاں میں سیدھے راستے پہ چل رہا ہوں مگر ایک گھر کا ذکر تو مجھے پھر بھی کرنا پڑے گا۔ بات یہ ہے کہ میں ابھی ابھی دلی میں خاک اڑا کر اور میرٹھ میں جھانک کر آ رہا ہوں۔ میرٹھ میں سب کچھ بدل گیا ہے' سوائے ریوڑیوں کے۔ دو ہی چیزوں کے دیکھنے اور چکھنے کی خواہش مجھے وہاں لے گئی تھی۔ اول ریوڑی' دوم میرٹھ کالج۔ بس تب سے میں اپنی طالب علمی کا زمانہ ساتھ لیے پھر رہا ہوں۔ وہ زمانہ ماضی ہوا۔ ہاں ایک کڑی ہے جو میرے اس زمانے کو آج کے زمانے سے ملاتی ہے۔ کرار صاحب مگر جب میں کرار صاحب کے متعلق سوچتا ہوں تو میرٹھ کالج بعد میں دھیان میں آتا ہے' پہلے ڈبائی کا وہ گھر یاد آتا ہے جسے ہم کھڑکی والا گھر کہتے تھے اور واقعی اس گھر کا دروازہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے دروازہ نہ ہو' بڑی سی کھڑکی ہو۔

اس گھر کے دروازے میں بالعموم سال بھر تالا پڑا رہتا۔ اصل میں اس گھر کے مکینوں نے پردیس کو آباد کر رکھا تھا۔

جب محرم کے دن قریب آتے تو میری والدہ جا کر یہ تالا کھولتیں۔ گھر کی جھاڑ پونچھ کرتیں۔ سفیدی پھیرنے کا انتظام کرتیں' خاص طور پر اس کوٹھڑی میں جہاں چاندرات کے آتے آتے علم سجائے جاتے۔ موم بتیاں روشن کی جاتیں۔ لوبان سلگایا جاتا۔ خاندان کی مجلسیں یہیں ہوتی تھیں اور اس خاندان کا معاملہ یہ تھا کہ شیعہ بس بقدر نمک تھے باقی سنی مگر اس طرح کے تنگ بھر تشیع بھی طبیعتوں میں شامل تھا۔ برس کے برس مجلس اور تعزیہ داری کے لیے مناسب رقم بھجوا دیتے اور اپنی تشیع والی ذمہ داری سے فراغت پا لیتے۔ خاندان کے اندر ہی شادی بیاہ کی وجہ سے کچھ چکبرے جوڑے بھی تھے کہ شوہر شیعہ' بیوی سنی۔ ایسے شوہروں میں سے اکا دکا کا شوہر سال کے سال اہتمام کرتے کہ بیوی کو گھر پر چھوڑتے اور بچوں کو لے کر محرم کے موقع پر آن موجود ہوتے۔ مقصود یہ ہوتا کہ اولاد کو محرم کے کلچر میں ایسا رچا بسا دو کہ وہ ماں کے اثر میں آ کر سنی نہ بن جائیں۔ سنی تو پھر بھی وہ بنتے تھے۔ بس اتنا ہی فرق پڑتا تھا کہ محرم دل میں گھر کر لیتا تھا۔ سال میں ایک مجلس کر دی اور کوئی منت مان لی۔ منت پوری ہو گئی تو سونے چاندی کا کوئی علم چڑھا دیا۔ مراد بھی پوری

ہوگئی' باپ کی روح بھی خوش ہوگئی۔

ہاں تو محرم کی سواری کے ساتھ پردیس سے سواریاں آنی شروع ہو جاتیں۔ اسی ہنگام ایک اکہ کھڑکی والے گھر کے سامنے آ کر رکتا۔ جو سواریاں اکے سے اترتیں' اس میں کچھ برقع پوش بیبیاں۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان۔ بر میں کرتا اور چوڑے پائنچوں والا پائجامہ۔ بال لمبے لمبے کہ گیسو دراز کہیں تو بجا ہوگا۔

ایک بوڑھی بی بی نے مجلس میں بیٹھے بیٹھے دور صحن میں کھڑے اس نوجوان کو غور سے دیکھا اور تعجب سے کہا ''یہ فاطمہ کا پوت ہے؟''

برابر والی بی بی نے کہا ''ہاں خالہ! یہ کرار ہے۔ تم نے اسے پہچانا نہیں۔''

''اس نے اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ ڈوبا بالکل لٹا دھاری بنا ہوا ہے۔''

''خالہ! کرار فلسفی ہوگیا ہے۔''

بڑی بی طنز بھرے لہجہ میں بولیں ''مہربان علی نے بیٹے کو یہی تعلیم دی ہے۔''

بڑی بوڑھیوں کے لیے وہ مہربان علی تھے' ہمارے لیے بانا تایا۔ بس ایک جھلک سی دھیان میں ہے۔ اس جھلک میں بھی ان کا انگرکھا نمایاں ہے۔ انگرکھے میں نے دو ہی دیکھے۔ یہ انگرکھا یا اپنے والد کا انگرکھا۔ مگر ٹھسے والا انگرکھا وہ تھا جو محرم کے محرم نظر آتا۔ جب لکھنو سے ایک مرثیہ خواں اصغر لکھنوی وارد ہوتے۔ بر میں سفید براق چکن کا انگرکھا۔ سر پہ اسی چکن کی دو پلو ٹوپی۔ گز بھر چوڑے پائنچوں والا لکھنوی طرز کا پائجامہ۔ منبر پر بیٹھ کر پہلے دولہا صاحب کو یاد کرتے۔ بتاتے کہ استاد ان پر کتنی شفقت کرتے تھے۔ جو مرثیہ پڑھتے' وہ بھی دولہا صاحب ہی کی تصنیف ہوتا۔ مرثیہ کیا پڑھتے تھے۔ ڈرامہ پیش کرتے تھے۔ رزم' بزم' مصائب' ہر بیان میں طاق اور ہر بیان اس شان سے کہ خود بھی جیسے کربلا پہنچے ہوئے ہوں اور ہمیں بھی ساتھ لے گئے ہوں۔ بیان کرتے تھے کہ تصویر کھینچ دیتے تھے کہ تلوار کیسے شقی کے خود پر پڑی۔ کس طرح فرق میں اتر کر تن تک گئی' تن سے گھوڑے کی پشت میں اتری۔ گھوڑے کی پشت سے اتر کر گاوزمین تک گئی۔ دولہا صاحب کے آتے آتے مرثیہ میں ساقی نامہ نے بھی تو جگہ پالی تھی۔ اصغر صاحب جب ساقی نامہ پر آتے تو بزم عزا' بزم مشاعرہ بن جاتی اور واہ واہ' سبحان اللہ' مکرر ارشاد کے شور سے امام باڑے کی چھت اڑتی نظر آتی۔ ساقی نامہ سے گریز' تلوار کی تعریف موقوف' گھوڑے کی مدح ختم' اب شہادت کا ہنگام ہے اور اصغر صاحب رزم و بزم سے گزر کر مصائب کے بیان پر پہنچ چکے ہیں۔

اصغر صاحب ایسا پڑھتے تھے تو دولہا صاحب کیسا پڑھتے ہوں گے۔ یہ مرثیہ خوانی تھی یا ڈرامہ کی پیشکش۔ ابتدائے عمر میں اصغر

صاحب کو کیا سنا کہ پھر کسی مرثیہ خواں کی مرثیہ خوانی نظروں میں جچی ہی نہیں۔ بخاری صاحب کی مرثیہ خوانی بھی اپنی خوبیوں کے باوصف بس غنیمت نظر آتی ہے۔

ارے ذکر کرار صاحب کا تھا' بیچ میں آ گئے اصغر صاحب۔ ابھی میں کرار صاحب سے پہلے تعارف کا ذکر کر رہا تھا۔ ذکر ان کے کرتے پائجامے کا تھا۔ پھر آگے چل کر دیکھا تو وہ کرتا پائجامہ خاکساروں والے کرتے' پائجامہ میں بدل چکا تھا۔ بیلچہ اس پر مستزاد۔ پھر میرٹھ کالج میں قدم رکھا تو ان کا استاد والا روپ دیکھا۔ چھٹیوں کے بعد جب کالج کھلتا تو مہینے بھر تک تو ان کی صورت ہی نظر نہ آتی۔ ان کے پیریڈ والے طلبہ بھٹکتے پھرتے۔ پتہ چلتا کہ ابھی واپس شہر ہی نہیں آئے ہیں۔ واپسی کے بعد بھی لازم نہیں تھا کہ پابندی سے کلاس لیں۔ پھر بھی طلبہ ان کے نام کا کلمہ پڑھتے تھے۔ ان کی غائب دماغی کے قصے سناتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ جتنے لیکچر دیتے' ان میں اگلی پچھلی ساری کسر پوری کر دیتے۔ سچ پوچھو تو اس کالج میں انگریزی ادب کے پروفیسر صحیح معنوں میں دو ہی تھے۔ ایک پروفیسر مکرجی' ایک کرار صاحب اور کرار صاحب کو میں نے پہلے مجلسیں پڑھتے دیکھا۔ اس کلاس میں بیٹھ کر انہیں انگریزی ادب پڑھاتے دیکھا۔ بالعموم انگریزی شاعری کا پیریڈ لیتے تھے۔ پھر بی اے کے بعد انہیں اردو پڑھاتے بھی دیکھ لیا بلکہ زیادہ قرب اسی زمانے میں حاصل ہوا۔ میرٹھ کالج میں اردو کا ایم اے نیا نیا جاری ہوا تھا۔ ابھی اس کے لیے لیکچرار کا تقرر عمل میں نہیں آیا تھا۔ یہ کلاس کرار صاحب کے سپرد کر دی گئی۔ گویا ہم نے اردو بھی انگریزی کے پروفیسر سے پڑھی۔

کرار صاحب اردو کی کلاس شام کو اپنے گھر پر لیتے تھے یہ گھر بھی خوب تھا۔ زنانہ حصہ تو مختصر ہی تھا۔ مردانہ بہت پھیلا ہوا تھا۔ کمرے میں کتابیں بکھری ہوئی۔ انہیں کے بیچ خاکساریت کا کھڑاک پھیلا ہوا۔ ہم بیٹھے انتظار کر رہے ہیں کہ کرار صاحب اس کھڑاک سے ذرا فراغت حاصل کریں اور ہماری کلاس لیں اور مجھے یہ اندیشہ ستاتا رہتا کہ کہیں اردو ادب اور بیلچہ آپس میں گڈمڈ نہ ہو جائیں۔

ویسے بیلچہ بھی اب اس گھر میں ایک انقلاب سے دوچار تھا۔ وہ زمانہ گزر چکا تھا جب اس گھر میں علامہ مشرقی کی کتابیں' کتابچے بکھرے نظر آتے تھے۔ اس زمانے میں علامہ کی جو کتاب اچک کر پڑھ سکتا تھا' پڑھ لی تھی اور اس زمانے میں تو کیفیت یہ تھی کہ کرار صاحب جو مجلسیں پڑھتے تھے' وہ بھی سمجھ لو کہ علامہ کے تذکرہ کا شیعہ ورژن ہوتی تھیں۔ عزاداران حسین پریشان ہوتے کہ یہ کیسی مجلس ہے کہ ہم امام مظلوم کے لیے دو آنسوؤں سے بھی گئے۔ نہ ذکر مصائب' نہ فضائل مولا علی ابن ابی طالب نہ جنگ خیبر و خندق۔ خیر وہ بھی تھے جو کہتے تھے کہ ایک مجلس بے گریہ بھی سہی۔ اچھی باتیں تو سننے کو مل جاتی ہیں۔ ویسے گریہ کے حساب سے دیکھا جائے تو کرار

صاحب ایک ناکام ذاکر ہیں۔ ان پر تو خود رقت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر آرٹ تعلق کے ساتھ ایک بے تعلقی مانگتا ہے۔ اگر اسٹیج پر ہیرو محبت کو ایکٹ کرتے کرتے سچ مچ محبت شروع کر دے تو ڈرامہ تو گیا۔ کرار صاحب کی ذاکری میں یہی خامی ہے۔

خیر تو ذکر یہ تھا کہ اب اس گھر میں بیلچہ خود ایک انقلاب سے یا بغاوت سے دوچار تھا۔ علامہ مشرقی کا بستر یہاں سے لپٹ چکا تھا۔ اب اس گھر کی حیثیت یہ تھی کہ علامہ سے جو نوجوان بھی بغاوت کرتا (اور بغاوتیں مسلسل ہو رہی تھیں) وہ سیدھا اس طرف کا رخ کرتا۔ ان دنوں یہاں دو نوجوان پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ ایک نوجوان بالعموم نل پر بیٹھا اپنا جوڑا جو اسے اگلے دن پہننا ہوتا' دھوتا نظر آتا۔ دوسرا باتیں کرتا دکھائی دیتا۔ وہ ردف خان تھے اور یہ یونس منصور' دونوں نے علامہ سے نئی نئی بغاوت کی تھی۔ یونس منصور نے علامہ سے بدک کر اچھرہ سے رسہ تڑایا اور لاہور سے بھاگ کر میرٹھ میں اس گھر پہ آ کر دم لیا۔ اب یہاں سے ایک ہفت روزہ ''الامین'' نکلتا تھا جو خاکسار تحریک کے باغیوں کا آرگن تھا۔ وہ ''الامین'' کے ساتھ جتا ہوا تھا۔

ایک روز میں نے دیکھا کہ گھر کا پھاٹک دھڑ سے کھلا اور ایک دراز قد شخص داخل ہوا۔ گورا چٹا۔ بر میں کھدر کا کرتا' تنگ موری والا پائجامہ۔ گلے میں تھیلا۔ علیک سلیک کرتے کرتے فرش پر نشست جمائی۔ تھیلا گلے سے اتار کر سامنے رکھا۔ کھول کر سامان پھیلایا۔ سامان کیا' کچھ پرانے تالے' چابیاں' ایک ہتھوڑی اور ایسے ہی کچھ اوزار۔ فوراً ہی ٹھوک پیٹ شروع کر دی اور ساتھ میں مسلمانوں کی حالیہ سیاست پر ایک لمبی گفتگو۔

میں نے جان لیا کہ اختر حمید خان ہیں۔ آخر ان کا ذکر اس گھر میں اور یہاں سے باہر بھی اتنا سن چکا تھا۔ استعفیٰ دے کر کلکٹری سے فارغ ہو چکے تھے۔ اب قفل سازی کو پیشہ بنا رکھا تھا۔ سابق آئی سی ایس حال قفل ساز۔ پرانے تالوں کی مرمت بہت اچھی طرح کرتے تھے۔ کیسا ہی کھٹ بگڑا تالا ان کے پاس لے جاؤ' ٹھیک کر دیتے تھے۔ ملت کے کھٹ بگڑے تالے کو بھی اپنے حساب بہت ٹھوکا پیٹا۔ اس کاروبار میں ان کی کامیابی مشکوک تھی۔ اب وہ جامعہ ملیہ کے لیے پر تول رہے تھے۔

اس کے بعد کہیں شاید 1970ء میں وہ لاہور آئے تھے۔ یونس منصور کے طفیل میں بھی ان سے مل لیا۔ اس وقت ان کا مضمون دوسرا تھا۔ بدھ مت پر رواں تھے۔ شاعری کے باب میں کہنے لگے۔ ''اردو میں دو ہی بڑے شاعر ہوئے ہیں۔''

''کون کون سے؟'' مجھے تجسس ہوا۔

بولے ''کبیر اور تلسی داس۔''

میں نے کہا ''کبیر کی حد تک تو بات سو فیصدی درست نظر آتی ہے مگر رامائن کو میں نے پڑھنے کی بہت کوشش کی۔ اس کی زبان تو

بالکل پلے نہیں پڑتی۔ آخر میں نے اردو بول چال کے بیچ ہی آنکھ کھولی ہے۔ یہ اردو ہوتی تو کچھ تو سمجھ میں آتی۔"

بولے "کسی انگریز سے پوچھ کر دیکھو۔ چاسر کی زبان اس کی سمجھ میں آتی ہے تو کیا چاسر کی زبان انگریزی نہیں ہے۔"

میں ذہنی طور پر قائل ہونے کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ فوراً قائل ہو گیا۔ ہاں ان دو ناموں میں میں نے ایک تیسرے نام کا اضافہ چاہا۔ میرا بائی کا۔ اس پر وہ آمادہ نہیں ہوئے۔ اسے وہ بڑے شاعروں میں شمار کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

ان دنوں مشرقی پاکستان کا آشوب چل رہا تھا۔ ملک کے حالات ابتر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ کہنے لگے "مجھے اندیشہ یہ ہے کہ زمانہ ایسا آ رہا ہے کہ ہم ایوب خان کے زمانے کو بہت اچھے زمانے کے طور پر یاد کریں گے۔"

مگر جب پچھلے برسوں میں کراچی میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت رجائیت پسند دکھائی دیے۔ موجودہ ابتری سے انہیں ایک نیا عہد طلوع ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں ٹھہرا قنوطیت پسند۔ ان کی یہ رجائیت مجھے بھلے وقتوں کے ترقی پسندوں کی رجائیت کی صدائے باز گشت محسوس ہوئی۔

ہاں تو ذکر کرار صاحب کا تھا اور دفتر الامین اور اپنی اردو کی کلاس کا۔ شہر کے کوئی وکیل صاحب آ نکلے' کوئی علامہ کا ستایا ہوا خاکسار آن دھمکا' کوئی پرانا شاگرد آن ٹپکا۔ کانگریس' مسلم لیگ' علامہ مشرقی کی نئی روش' رنگا رنگ موضوعات و مسائل زیر بحث ہیں۔ کرار صاحب جاری ہیں۔ ہم انتظار کر رہے ہیں کہ یہ لوگ جائیں تو ہماری کلاس شروع ہو۔ کلاس بہر حال شروع ہوتی تھی اور پھر کرار صاحب ہندوستان کی ساری سیاست کو یکسر فراموش کر کے ادب پر شروع ہو جاتے تھے۔ کلاسیکی ادب تک خوش' بہت خوش' خاص طور پر میر کی غزلیں انہیں بہت رجھاتی تھی۔ میری خواہش ہوتی تھی کہ وہ میر کے بعد راشد کے بھی قائل ہو جائیں مگر وہ تو سارے نئے ادب ہی سے بیزار تھے۔

ساقی پڑھتے پڑھتے انہوں نے الگ رکھا "اس بھلے مانس کو کیا ہوا ہے۔ جو اُس پر لکھے چلا جا رہا ہے۔"

"جی' محمد حسن عسکری تو نئے ادب کے ساتھ بہت بڑے نقاد ہیں۔"

"مگر بابا اردو میں جو اُس پر لکھنے کی تک کیا ہے؟"

اور ایک روز میں نے انہیں جا کر اطلاع دی کہ جس نقاد سے آپ جو اُس پر لکھنے کی وجہ سے خفا ہیں' وہ آپ کا شاگرد رہ چکا ہے۔ آج کل وہ میرٹھ ہی میں ہے۔"

کرار صاحب کے بار بار ذکر پر عسکری صاحب نے آخر ایک شام مجھے بتایا کہ انہوں نے انٹر میرٹھ کالج ہی سے کیا تھا اور وہ کرار

صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ پھر کرار صاحب سے ان کی ملاقات بھی ہوئی اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔

کرار صاحب انہی دنوں اردو کے اس زمانے کے نقادوں کو جیسے تیسے پڑھ رہے تھے۔ فراق کی ''اردو کی عشقیہ شاعری'' بھی پڑھ ڈالی۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے ''لگتا ہے کہ کوئی بھلا مانس انگریز اردو غزل پر بات کر رہا ہے۔''

عسکری صاحب سے بے تکلفی بڑھی تو ایک روز سادگی سے ان سے پوچھا ''عسکری تم نے مجنوں کی تنقید پڑھی ہے؟''

جی پڑھی ہے۔''

''احتشام حسین کو بھی پڑھا ہے؟''

''جی۔''

''اور آل احمد سرور۔ اس نقاد کو بھی پڑھا ہے۔''

''جی۔''

''اچھا؟'' کرار صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں حیرت کا اظہار کیا ''عسکری! تم بہت پڑھتے ہو۔''

ویسے عسکری صاحب کا اس فضا میں ایک اثر تو میں نے دیکھا۔ مسلم لیگ کی سیاست پر یہاں جو درشت تنقید ہوتی تھی' اس کے لہجہ میں اچھی خاصی نرمی آ گئی تھی۔ ادھر عسکری صاحب نے ''الامین'' میں لکھنا بھی شروع کر دیا تھا ''الامین'' کے مخالص خاکساری لہجہ کے بیچ مسلم لیگی لہجہ بھی در آیا۔

کرار صاحب نے پاکستان پہنچ کر پہلا پڑاؤ لاہور میں کیا۔ ایک رات داتا دربار میں گزاری۔ دوسرے دن راوی پار جا کر گاما پہلوان سے ملاقات کی۔ تیسرے دن کراچی چلے گئے۔

خیر کرار صاحب تو پاکستان آ گئے مگر مجھے میرٹھ کا ذکر تھوڑا اور کر لینے دیں۔ ارے ابھی تو مجھے ظ۔ انصاری کا ذکر کرنا ہے اور اپنے قیصر زیدی کا اور ہاں لیجئے بوم ہاپوڑی کو تو میں بھول ہی چلا تھا۔ میں جب کالج کی چھٹیوں میں ہاپوڑ جانے کے لیے لاری کے اڈے پر پہنچتا تو دیکھتا کہ ایک شخص گوری رنگت' سارا سر سفید' ہاتھ میں بہت سے کتابچے صدا لگا رہا ہے۔ بوم ہاپوڑی کا کلام لے لو۔ چماری نامہ ایک آنے میں۔ یہ شخص جو صدا لگا رہا ہے' خود بوم صاحب ہیں۔ اپنا کلام کتابچوں کی شکل میں خود چھاپتے ہیں۔ خود بیچتے ہیں۔ میرٹھ کا بچہ بچہ انہیں پہچانتا ہے۔ ایک گلی سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکوں بالوں نے بوم صاحب کو گھیر رکھا ہے۔ ''بوم صاحب چماری نامہ سنیں گے۔'' بوم صاحب نے جواب میں آنکھیں موند لیں اور لیجئے شروع ہو گئے۔

ان حسینوں نے اجاڑیں بستیاں
بوم سالا مفت میں بدنام ہے

مرے ڈسنے کو ظالم تو نے کیسے ناگ پالے ہیں
ترے اوپر بھی کالے ہیں تیرے نیچے بھی کالے ہیں

بوم صاحب باپوڑ میں چونگی کے محرر تھے۔ اچھا کماتے تھے مگر ہوا یہ کہ ایک چماری سے تحصیلدار صاحب کے ناجائز تعلق کا سکینڈل چلا تو موصوف نے چماری نامہ لکھ ڈالا۔ اس چکر میں نوکری گنوادی۔ اب میرٹھ کے لاری اڈے پر کھڑے ہو کر اپنے کلام کی بولی لگاتے تھے اور پیٹ بھرنے کا سامان کرتے تھے۔

اور ہاں قیصر زیدی۔ کیا بانکے آدمی تھے۔ میرٹھ میں اگر کوئی ایسا تھا جسے انٹلیکچوئل کہہ سکیں تو وہ یہ تھے کیا خوب سج دھج تھی۔ سدا ایک ہی لباس' گیروئے رنگ کے کھدر کا کرتا' اسی کھدر کا چوڑے پائنچوں والا پائجامہ۔ بال زلفوں والے مگر ہر چیز نفاست کے ساتھ۔ خوش شکل' خوش گفتار' اس غزل زدہ شہر میں وہ نظم آزاد کہنے والے واحد شاعر تھے۔ ایک افسانہ بھی لکھا تھا جو انہیں زبانی یاد تھا۔ جب سناتے تو اس کے لیے خاص اہتمام کرتے۔ چائے کی پوری کیتلی اپنے لیے الگ محفوظ کر لیتے۔ لیمپ بجھا دیا جاتا۔ پھر افسانہ شروع کرتے۔ جب افسانہ ختم کرتے تو فوراً ایک بیان شروع ہوتا۔ ''جب افسانہ ختم ہوا تو پردے کے پیچھے سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ زبیدہ بے ہوش ہو گئی تھی' عابدہ سسکیاں لے رہی تھی۔''

میں نے جب انہیں دیکھا تو وہ تعلیم سے فارغ ہو کر میرٹھ کا روڑا بن چکے تھے۔ خیال یہی تھا کہ نہ ملازمت کریں گے' نہ شادی کریں گے۔ نہ میرٹھ سے قدم باہر نکالیں گے مگر اچانک تینوں ہی کام ایک سانس میں کر ڈالے۔ کسی دوست کی شادی میں براتی بن کر گئے تھے۔ وہاں کوئی جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ پہلے انہوں نے دوست کو اور اس کے والدین کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ جب ان کی سمجھ میں بات نہ آئی اور پانی سر سے اونچا ہو گیا تو جوش میں آ کر اپنے آپ کو بر کے طور پر پیش کر دیا۔ انہیں دنوں جامعہ ملیہ میں جا کر استاد بن گئے۔ بس پھر دلی ہی کے ہو رہے۔ جب دلی سے میرٹھ آتے تو ڈاکٹر ذاکر حسین کے گن گاتے ہوئے آتے۔

لوگوں کے ناموں میں انہیں بالعموم کوئی مضحک پہلو نظر آ جاتا تھا۔ ایک روز کہنے لگے ''انتظار میاں ہمارا ایک بھانجا ہے۔ شاعری کرتا ہے' پتہ ہے اس نے تخلص کیا رکھا ہے ''تیغ'' ایک لمبا قہقہہ۔ پھر بتاتے کہ ''موصوف ابھی پڑھ رہے ہیں اور مجموعہ بھی چھپوا لیا ہے۔ الہ آباد میں پڑھتے ہیں' اس لیے تیغ الہ آبادی بن گئے ہیں۔''

پھر ایک روز بولے ''ظوئے کیسا نام ہے۔ کبھی ایسا نام سنا ہے۔ والدین نے ظل حسنین نام رکھا تھا۔ اس روایتی نام پر حضرت کو شرم آئی۔ ترقی پسندی کے جوش میں اسے مختصر کر کے ظوئے کر لیا۔ اب ظ انصری کے نام سے لکھتے لکھاتے ہیں۔ آئے ہوئے ہیں۔ چلو میں تمہیں ان سے ملاتا ہوں۔''

ظ انصاری ویسے تو میرٹھ ہی کے تھے مگر اس وقت وہ ایک مار میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ اپنے شہر کو ٹوہ کر دیکھ رہے تھے کہ اس میں ترقی پسند تحریک کو قبول کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ مجھ میں انہوں نے کوئی گن دیکھا ہوگا کہ ساتھ لگا لیا۔ شہر میں لخ لخ پھرتے تھے۔ ان کے ساتھ لگا ہوا میں پھرتا تھا۔ اردو کے نام تو یہاں بس کچھ غزل گو تھے۔ وہ ترقی پسندی کے نام سے بدکتے تھے۔ ہاں ہندی والوں کے حلقہ میں ظ صاحب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ دو ڈھائی ہفتے کی دوڑ دھوپ کے بعد بال آخر ایک تقریب کا اہتمام ہوا۔ ہندی کہانیاں، نظمیں پڑھی گئیں۔ لیجیے میرٹھ میں پی ڈبلیو قائم ہوگئی اور ترقی پسند تحریک کا ڈول پڑ گیا۔

تو اب تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ترقی پسند تحریک کی تنک سی خدمت میں نے بھی کی ہے۔ ظ صاحب مجھ سے خوش ہو گئے تھے مگر برس بعد جب پھر ان کا میرٹھ کا پھیرا ہوا تو انہوں نے بدقسمتی سے ایسے وقت میں ہمارے گھر میں قدم رکھا کہ عسکری صاحب پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہی کا ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ پھول گیا۔ ظ صاحب جلدی ہی اٹھ گئے اور اس طرح رخصت ہوئی جیسے کہتے جا رہے ہوں مانس گند، مانس گند۔

پھر اس کے بعد لاہور میں ان سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہ شاید ماسکو سے واپس آتے ہوئے ڈھائی تین دن کے لیے لاہور ٹھہرے تھے۔ ویسے تو وہ لیل و نہار کے دفتر میں سبط صاحب سے فراغت پا کر میری ہی طرف آئے تھے مگر میں انہیں ٹی ہاؤس لے گیا۔ بس وہاں صفدر نے انہیں لپک لیا۔ پھر وہ صفدر ہی کے مہمان بن گئے۔

اور اب مجھے جامعہ ملیہ کا میر سیمینار یاد آ رہا ہے۔ وہاں ظ صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ ان کی تقریر کچھ زیادہ ہی لمبی کھنچ گئی۔ میر پر بات کرتے کرتے اپنی ذات پر آ گئے۔ باقر مہدی نے کسمسانا شروع کیا۔ خیر ظ صاحب نے جلدی ہی اس عزیز کے لیے موقع فراہم کر دیا۔ کہنے لگے کہ ''میں اب اور کتنے دن زندہ رہوں گا' یہی کوئی دس برس۔''

باقر مہدی نے فوراً شور مچایا ''دس برس بہت ہیں۔ کم کرو' کم کرو۔''

اور لیجیے میر سیمینار ہی میں عمیق حنفی نے جگن ناتھ آزاد کے ساتھ جو کچھ کیا' وہ بھی سن لیجیے۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنے مقالہ میں میر اور اقبال کی شاعری میں مشابہتیں دریافت کی تھیں۔ سوالوں اور تبصروں کا سیشن شروع ہوا تو عمیق حنفی سٹیج پر آئے اور بولے کہ جگن

ناتھ آزاد نے اپنے مقالہ میں کوئی نئی بات نہیں کی۔ ناصر کاظمی نے اپنے میر والے مقالہ میں اقبال سے موازنہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے' ڈاکٹر صاحب نے اسے ہی دہرا دیا ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے جواب میں کہا کہ ''میں نے تو ناصر کاظمی کا مقالہ پڑھا ہی نہیں۔ کب شائع ہوا' کہاں شائع ہوا؟''

عمیق حنفی نے اپنے تیز لہجہ میں کہا کہ ''اگر آپ نے وہ مقالہ نہیں پڑھا ہے تو ایسا کیوں ہے کہ ناصر نے وہاں میر اور اقبال کے جو شعر اپنے استدلال کے ذیل میں پیش کیے ہیں' وہی آپ نے بھی نقل کیے ہیں۔''

مگر باقر مہدی کی سنئے۔ ہوٹنگ میں موصوف کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ شاید وہ جامعہ کا افسانہ سیمینار تھا۔ اس نشست کی صدارت ایک مسلمان وزیر کر رہے تھے۔ نام یاد نہیں آ رہا۔ انہوں نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ایک شعر میر کا بتا کر پڑھا۔ باقر مہدی نے فوراً شور مچایا۔ ''غلط' غلط۔ یہ شعر میر کا نہیں ہے۔''

وزیر موصوف نے اصرار کیا کہ یہ شعر میر ہی کا ہے اور کہا کہ ''جلسہ کے بعد ہم آپ سے ملتے ہیں۔ میں بتاؤں گا کہ یہ شعر میر ہی کا ہے۔''

جواب میں بولے۔ ''میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ آپ سے ملنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

باقر مہدی کہیں 1962ء یا 1963ء کے آس پاس لاہور آئے تھے۔ اس وقت ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھ پر اعتبار کر لیا اور اعتماد میں لے کر بتایا کہ انہوں نے جس حسینہ سے عشق کیا تھا' وہ ہجرت کر کے پاکستان آ گئی ہے اور لاہور میں ہے۔ اسے تلاش کرنا ہے اور ملنا ہے۔ عشق کے معاملات میں' میں نے دوستوں سے ہمیشہ تعاون کیا ہے۔ خیر تلاش کے مراحل تو انہوں نے اکیلے ہی طے کیے۔ جب اتا پتا مل گیا تب مجھ سے تقاضا کیا کہ میرے ساتھ چلو۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ ہمت بندھانے کی خاطر میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ ویسے جیسا انہوں نے بتایا تھا' ویسا ہی پایا مگر پتہ یہ چلا کہ آگ یکطرفہ لگ رہی تھی اور اس طرح سلگ رہی تھی کہ اس ماہ رو کو اس کی خبر ہی نہیں تھی۔

دوسری بار باقر مہدی آئے تو آگ بجھ چکی تھی۔ آگ سلگنے کے لیے آخر ایندھن بھی تو سپلائی ہوتا رہنا چاہیے۔ اب کے وہ کشور ناہید کے مہمان تھے۔ کشور نے اپنے دستور کے مطابق مہمانداری تو بہت کی مگر باقر مہدی ایک ہی فقرہ دہراتے رہے کہ موصوفہ سے ہماری ملاقات نہیں ہو پا رہی۔ یہ فقرہ کہتے کہتے ہی رخصت ہو گئے۔

بھلا ملاقات ایسے ہوا کرتی ہے۔ یہ کوئی انقلاب تھوڑا ہی ہے کہ نعرہ لگایا اور سمجھ لیا کہ حق ادا ہو گیا۔ اس کے آداب اور ہیں۔

باقر مہدی بمبئی میں رہتے ہیں۔ بمبئی تو مجھے بس ایک ہی حوالے سے یاد رہ گیا ہے۔ اس حوالے سے کہ یہاں میں نے ایک افسانہ نگار کے ہاتھ کی پکائی ہوئی ماش کی دال کھائی تھی۔ سریندر پرکاش نے مجھے یہی کہہ کر اپنے گھر بلایا تھا کہ میں ماش کی دال بہت اچھی پکاتا ہوں۔ آپ کھا کر خوش ہوں گے۔ میں کھا کر واقعی خوش ہوا۔ اس کے بعد میرے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ سریندر پرکاش افسانہ زیادہ اچھا لکھتا ہے یا ماش کی دال زیادہ اچھی پکاتا ہے۔

اس کے بعد سریندر سے میری دوسری ملاقات برلن میں ہوئی۔ وہاں ہاؤس آف ورلڈ کلچر کی طرف سے ایک اردو فیسٹیول کا اہتمام تھا۔ ادھر سے میں گیا تھا اور جمیل الدین عالی۔ لندن سے افتخار عارف آن پہنچے تھے۔ ہندوستان سے قرۃ العین حیدر، سریندر اور بلراج کومل۔

صبح منہ اندھیرے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ چائے کی ٹرے لیے سریندر کھڑے ہیں۔ ارے یہ کیا، یہ بیڈ ٹی ہے۔ بس پھر یہ طور بندھ گیا کہ روز صبح منہ اندھیرے دروازے پر دستک، سریندر چائے کی ٹرے کے ساتھ حاضر۔ میں دل میں سوچ کر خوش ہوا کہ کتنا سعادت مند افسانہ نگار ہے۔ ایسی سعادت مندی ہماری پرانی شعری روایت سے منسوب تھی۔ شاگرد استاد کا اور جونیئر سینئر کا کتنا ادب کرتے تھے۔ چلمیں بھرتے تھے۔ جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ کمبخت نئے زمانے نے تو ساری روایتوں کو ملیا میٹ کر دیا۔ نہ بڑوں کا ادب، نہ چھوٹوں پر شفقت۔ میں نے سریندر کے حق میں دعا کی کہ لمبی عمر پائے۔ کڑوے نیم سے بڑا ہو۔ ہاتھ میں ذائقہ اور قلم میں زور برقرار رہے۔ اسی طرح اچھی دال ماش پکاتا رہے اور اچھا افسانہ لکھتا رہے۔

اے لو میں پھر دوستوں کا ذکر لے کر بیٹھ گیا۔ سوچا میں نے یہ تھا کہ پچھلے برسوں میں ہندوستان کے جتنے سفر کیے ہیں، ان کی یادوں کو تازہ کیا جائے مگر یادیں اسی ہنگام جتنی قلمبند ہو سکیں، ہو گئیں۔ اب تو سب کچھ حافظہ کے عقب میں جو ایک مال گودام ہے، اس میں چلا گیا اور سفر کے قیمتی لمحات خوابوں میں ایسے رل مل چکے ہیں کہ خوابوں ہی کا حصہ بن گئے ہیں۔ میں ذہن دوڑا رہا ہوں، یادوں کو کھینچ کھینچ کر دھیان میں لا رہا ہوں۔ یادیں ہیں کہ شریر بچوں کی طرح مارے باندھے قریب آتی ہیں اور بھاگ جاتی ہیں۔ یہ بنارس نگری ہے۔ عالیہ کا میکہ۔ نوابوں والی گلی۔ عالیہ کی پھوپھی اماں کی حویلی۔ مغل باجی عزاخانے کا دیدار کراتی ہیں۔ پھر اداس ہو جاتی ہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ اب کے برس مولا کی سواری نہیں آئی۔ شب عاشور استاد بسم اللہ خان دستور کے مطابق اپنی شہنائی کے ساتھ آئے۔ شب بیداری کی مگر شہنائی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جب پو پھٹی اور ذوالجناح نکلنے کے لیے تیار ہوا تو استاد کو ٹہوکا۔ استاد۔ اب تو ذوالجناح نکلنے لگا ہے، کیا شہنائی نہیں بجے گی۔ استاد اداس ہو کر بولے، مولا کی طرف سے حکم نہیں آیا۔ بس پھر شہنائی کے بغیر ہی

ذوالجناح کی سواری نکلی۔ کتنی اداسی تھی سواری پر۔ مولا کی سواری پر۔ مولا کی سواری جو نہیں آئی تھی۔

اور میں سوچ رہا ہوں کہ اس عزاخانے سے سارناتھ کتنی دور ہے۔ کل مجھے وہاں جا کر گوتم بدھ کے استھان پر حاضری دینی ہے۔ اشوک کے پیڑ یہاں سے وہاں تک قطار باندھے کھڑے ہیں۔ ان کے پتے کیسے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں اور وہ گنبد بے در ایک بڑے گھیرے والا اونچا ستون اس کے اندر کیا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کوئی در نہ دریچہ نہ کنگرے نہ طاق۔ جہاں تہاں سوراخ ہیں جن میں سے طوطے آ جا رہے ہیں۔ آگے وہ مقام جہاں کبھی ہرن بن تھا اور جہاں گوتم بدھ نے گیان حاصل کرنے کے بعد پانچ جوگیوں کو مخاطب کر کے پہلا اپدیش دیا تھا۔

تو صاحبو ہم نے گوتم بدھ کے پہلے اپدیش کا استھان دیکھ لیا۔ چلو اب ایک دوسرا استھان بھی دیکھ لیں۔ شرادستی جہاں بدھ جی مہاراج برکھارت میں باس کیا کرتے تھے مگر اس کے لیے تو الہ آباد جانا پڑے گا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ وہاں شمس الرحمن فاروقی رہتے ہیں۔ انہیں میں نے پہلے تو دلی میں دیکھا تھا مگر پتھر اپنی جگہ پہ بھاری ہوتا ہے تو شمس الرحمن فاروقی اب الہ آباد میں اپنے استھان پہ آ کر بیٹھ گئے ہیں اور بھاری نظر آتے ہیں۔ میں نے ان کی انگلی پکڑی ہے اور شرادستی کی طرف اڑا چلا جا رہا ہوں مگر وہاں اب دیکھنے کو ہے کیا۔ اینٹوں کو دیکھو اور تصور کر لو کہ آگے پراچین کال میں یہاں یہ ایک نگری تھی۔ بدھ دیو جی برسات کی برسات یہاں براجتے تھے۔ اس سے اسے چار چاند لگ گئے۔ اب نہ وہ ہستی نہ وہ بستی۔ نہ چھوڑی وقت نے جس کی نشانی۔ تو آگے چلتے ہیں یعنی جب پراچین کال میں داخل ہو ہی گئے تو پھر جس انتہا تک جا سکتے ہو جاؤ اور یہاں انتہا تک جانے کی گنجائش موجود ہے۔

تو شمس الرحمن فاروقی آگے آگے ہم پیچھے پیچھے۔ لو رامائن کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اوبڑ کھابڑ اونچے نیچے اجاڑ رستوں پر چلے جاتے ہیں۔ جس رستے پر ہماری موٹر دوڑ رہی ہے اس راستے پر اس پراچین سمے میں رام چندر جی کا رتھ تخ تخ کرتا گنگا کے کنارے آیا تھا۔

آگے کی کہانی اس کنارے بیٹھے ایک پجاری نے سنائی۔ تب شری رام چندر جی شری گنگا جی کو دیکھ کے رتھ سے اترے اور گنگا جی کو ڈنڈوت پرنام کیا۔ پھر اشنان کیا اور مہا پوتر گنگا جل پیا۔ بس پرسن ہو گئے

رام لکھن سیہ روپ نہاری
کہیں پریم نگر نرناری
تے پت مات کہو سکھی کیسے

جن	پٹھے	بن	بالک	ایسے
تب	نکھا	دیت	ارا	انمانا
تر	سنسپا	منوہر		جانا
لے	رکھنا	تھے	ٹھاون	بتاوا
کہیو	رام	سب	بھانت	سہاوا

اچھی بات یہ ہے کہ اس مقام پر کوئی بڑا مندر تعمیر نہیں ہوا۔ مندر بن جاتا تو پھر یاتریوں' پجاریوں' جوگیوں' بیراگیوں کا بھیڑ بھڑکا ہوتا۔ قدامت کا احساس ملیامیٹ ہو جاتا۔ اب یہ مقام اپنے اجاڑ پن میں قدامت کی دولت کو سنگھوائے بیٹھا ہے۔ گنگا چپ چاپ بہہ رہی ہے۔ برابر میں ایک اجڑی بجڑی دھرم شالہ۔ وہاں ڈھائی تین پجاری مجھے تو اتنے ہی نظر آئے تھے۔

تو لیجیے تھوڑی دیر رامائن کی فضا میں بھی سانس لے لیا۔ اب دیکھنے کو کیا رہ گیا۔ گنگا جمنا کا میل' سو وہ تو الہ آباد میں آ کر خلقت دیکھتی ہے۔ میں نے بھی یہ ملاپ دیکھ لیا۔

شمس الرحمن فاروقی کو دعائیں دیتے واپس ہوئے۔ شمس الرحمن فاروقی اس معاملہ میں کمال کے آدمی تھے۔ انہیں کے طفیل میں نے بائیس خواجہ کی چوکھٹ میں جا کر کتنی چوکھٹیں دیکھ ڈالیں ورنہ ہماری مار تو بس حضرت نظام الدین اولیا کی چوکھٹ تک تھی۔ بہت تیر مارا تو خواجہ بختیار کاکی کی چوکھٹ کو جا چھوا مگر وہ جو دور پرے ایک مبارک چوکھٹ ہے جسے میں موروں والی چوکھٹ کہتا ہوں۔ وہاں اگر فاروقی صاحب نے لے جاتے تو میں کہاں دیکھ پاتا۔ حضرت چراغ دہلی کی چوکھٹ۔ اس درگاہ پر موروں کا راج ہے۔ چراغ دہلی کی اس ایک ادا نے مجھے لوٹ لیا۔ ان کے ملفوظات (سراج المجالس) میں پہلے ہی قائل بلکہ کشتہ چلا آتا تھا۔

باقی دلی تو عالم میں انتخاب شہر تھا۔ اب بھی ہے۔ جتنا دیکھو اتنا ہی تھوڑا مگر میرا معاملہ یہ ہے کہ میں تھوڑا دیکھ کر بھی خوش اور مطمئن ہو جاتا ہوں۔ پہلے پھیرے میں شمیم حنفی نے مجھے جامعہ نگر کے پرے لے جا کر جمنا کا کنارہ' کچھ مور' کچھ بندر دکھائے۔ میں اسی میں خوش ہو گیا۔ اب بھی حافظہ میں وہ پیلا کھیت رچا بسا ہوا ہے جہاں گیندے کے پھولوں کے بیچ بیچ میں سے موروں کی لمبی گردنیں ابھری دکھائی دے رہی تھیں۔

میری یادوں میں کتنی یادیں ایسی ہیں جن کا کسی شخصیت سے' کسی تاریخی عمارت سے' کسی ادبی محفل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بس کسی پرندے کی اڑتی سی جھلک یا دور سے آتی ہوئی اس کی آواز۔ اورنگ آباد کی ساری باتیں بھول گیا۔ بس اس نگر کی کوئلیں یاد رہ گئی

ہیں۔ سراج اورنگ آباد کی قبر بھی بس اسی نسبت سے حافظہ میں ٹکی رہ گئی ہے کہ اس کے متصل ایک درخت پہ کوئلیں ہی کوئلیں' کوئل تو اکیلی پتوں میں چھپی کوکتی رہتی ہے۔ اس کی کوک سنو اور خوش ہو جاؤ۔ درشن وہ تمہیں دے گی نہیں مگر یہاں اس نے درشن بھی دیئے اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ ہمیشہ اکیلی نہیں ہوتی۔

اورنگ آباد تو میں اچنبا ایلورا کی دید کے چکر میں گیا تھا۔ ٹک دیکھ لیا' دل شاد کیا اور بھول گیا۔ اب وہ غار اور وہ بت اور وہ نقش کہ چٹانوں کے بیچ کہیں منور ہیں' کہیں اندھیرے میں گم ہیں۔ اب بس اس طرح یاد ہیں کہ جیسے ایک خواب دیکھا تھا۔ پورا خواب بھول گیا۔ جہاں تہاں سے اس کے کچھ منظر حافظہ میں اٹکے رہ گئے ہیں۔

ہر پھر کر پھر وہی دلی پھر وہی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ ریوتی کے گھر سے چلے شمیم حنفی کے گھر جا براجے۔ وہی گنے چنے چہرے یعنی وہی میاں زبیر رضوی' وہی میاں محمود ہاشمی' محمود ہاشمی کی اپنی دھج ہے۔ ہر وقت کلے میں پان کا بیڑا دبا ہوا۔ بہت لکھا مگر سنگھوانا نہ جانا۔ ایسے پرندے بھی تو ہوتے ہیں کہ انڈے دے کر بھول جاتے ہیں۔ یاد بھی رکھیں گے تو اس طرح کہ انڈوں کی گنتی یاد نہیں۔ خیر محمود ہاشمی اور عبید صدیقی کو تو میں نے اب میرٹھ کے خانے میں ڈال دیا ہے۔ وہی تو مجھے میرٹھ لے کر گئے تھے۔ سوچا تھا کہ پرانے کوچوں کی شکلیں نہیں پہچانی جاتیں۔ خیر نگر بازار' گھنٹہ گھر' ویلی بازار' سب شکل سے بے شکل ہو چکے ہیں اور صدر بازار' ارے اس علاقے کی کیا پوچھتے ہو۔ کتنا پرامن اور خوبصورت علاقہ تھا۔ اب اس کا حال ابتر ہے۔ میں نے تعلیم کے ابتدائی برس تو اسی نواح میں گزارے تھے۔ ہمارے چچا جان تھے فضل الرحمن' ان کے بیٹے ہمارے ہمجولی انیس الرحمن ان کے گھر رہتے تھے۔ اس کی پرسکون سڑکیں اس وقت تصور میں ابھری ہوئی ہیں۔ یہ سڑک جو اتنی خاموش ہے اور دور تک کوئی پیادہ کوئی سوار نظر نہیں آتا کونسی ہے اور یہ عمارت جیسے محل کھڑا ہو۔ یہ قصر مصطفیٰ ہے۔ مصطفیٰ خان شیفتہ سے اسے نسبت ہے۔ اب یہاں نواب اسماعیل خان رہتے ہیں اور یہ سڑک کہ دو رویہ گھنے درخت کھڑے ہیں۔ کمپنی باغ کی طرف جاتی ہے۔ اس سڑک پر کالی مخلوق کم بلکہ بہت ہی کم نظر آئے گی۔ جو نظر آئے گا' گورا نظر آئے گا۔ سفید نیکر' سفید قمیص' سفید کرمچ کا جوتا۔ ہاتھ میں سفید ریکٹ۔ قدم مارتے کمپنی باغ کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر ٹینس کھیلیں گے۔ کمپنی باغ میں داخل ہوں تو پھر کالی مخلوق کمیاب بلکہ نایاب۔ گورے گورے بچے چل پھر رہے ہیں۔ کھیل رہے ہیں۔ آیائیں ان کے ساتھ ہیں اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ وہ گوری مخلوق کہاں گئی اور وہ مصفا سڑکیں کہاں گئیں۔ اب تو یہاں کالی مخلوق کا بھیڑ بھڑکا ہے۔ ہاں یہیں کہیں تو وہ پارک تھی جہاں سے سن 57ء کی بغاوت شروع ہوئی تھی۔ سنا تھا کہ 1957ء میں آ کر کوئی یادگار کھڑی کی گئی تھی مگر عبید صدیقی اور محمود ہاشمی نے مجھے ادھر جانے کب دیا۔ مجھے میرٹھ کالج کی طرف

دھکیلا اور میں دھکلتا چلا گیا۔

کم از کم اس کوچے جہاں کا ہمارا کالج ہے' سکون برقرار ہے۔ بڑی اچھی بات ہے۔ کالج میں اس وقت کوئی گہما گہمی نہیں۔ بھلا کیوں؟ اس لیے کہ امتحان ہو رہے ہیں۔ دور لان میں کچھ کرسیاں بچھی ہیں۔ کچھ پروفیسر قسم کے لوگ بیٹھے ہیں۔ پتہ چلا کہ یہ پرنسپل صاحب ہیں' باقی ان کے حواری۔ پکار پڑتی ہے کہ اردو ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر صاحب ہوں تو وہ آئیں اور پاکستان سے آئے مہمان سے ملیں۔ لیجیے وہ آ گئے اور بہت گرمی میں بول رہے ہیں۔ ''دیکھیے پچھلی مرتبہ آپ دلی آئے۔ کس نے آپ سے کہہ دیا کہ میرٹھ کالج میں اردو ڈیپارٹمنٹ بند پڑا ہے۔ غلط کہا۔ میں نے یہ خبر پڑھی تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ آپ اس وقت تک جا چکے تھے۔ بند کب ہوا۔ ارے صاحب یہاں تو یوپی کے سب کالجوں سے زیادہ اردو کے طالب علم ہیں۔

''بھلا کتنے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایم۔ اے کی کلاسوں میں تیس' بی اے میں پچاس۔''

میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ ہندوستان میں اردو کی جو بھی صورت ہو' کم از کم ہمارے کالج میں تو اس کا حال اچھا ہی ہے اور خود کالج کا حال اچھا نظر آیا۔ چلیے میرٹھ میں کوئی کوچہ تو ایسا ہے جسے دیکھ کر مایوسی نہیں ہوئی۔ ہاں ایک کوچہ اور بھی ہے۔ سپٹ بازار کے اس طرف تحصیل کے پیچھے وہ جو ریوڑیوں کا کوچہ ہے' اس کوچے کی شناخت برقرار ہے۔ ریوڑی برقرار ہے۔ ریوڑی کا ذائقہ برقرار ہے تو پھر گویا میرٹھ بھی برقرار ہے۔

مگر میں یہ کیوں توقع کر رہا ہوں کہ میرٹھ کو میں ویسا ہی پاؤں گا جیسا اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ خیر نگر کے نکڑ پر ٹال اسی طرح برقرار ہو گی' اسی طرح وہاں لکڑیاں چر رہی ہوں گی اور تل رہی ہوں گی۔ اسی طرح وہاں لاریوں کا اڈا ہو گا اور اسی طرح بوم ہاپوڑی پکار رہے ہوں گے ''بوم ہاپوڑی کا چماری نامہ آ گیا۔ دو آنے میں۔'' کوٹھی جنت نشان' مصطفیٰ کیسل' نادر علی بلڈنگ' سب عمارتیں اسی طرح ہوں گے۔ وہی ان کی شان ہو گی۔ زمانے نے بھلا کبھی چیزوں کو' آدمیوں کو' عمارتوں کو' گلی کوچوں کو ایک حال میں رہنے دیا ہے اور یوں بھی تو ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں بدلتا۔ پھر بھی آپ سوچتے ہیں کہ سب کچھ بدل چکا ہے۔ جب میں نے پاکستان جانے کے بعد پہلا پھیرا ہندوستان کا لگایا تو یہی ہوا تھا۔ زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا تھا۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو سال کے بعد میرا پھیرا ہوا تھا۔ جب میں نے ہاپوڑ میں قدم رکھا تو سب کچھ اسی طرح تھا۔ سارا نقشہ وہی مگر میں سمجھ رہا تھا کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ اصل میں ہاپوڑ کے ساتھ اب میرا رشتہ بدل چکا تھا۔

جب میں دو ڈھائی دن ہاپوڑ میں رہ لیا تو میں نے پھریری لی' چلو دلی۔ ہماری ہمشیرہ صاحبہ نے جو سنا تو خوفزدہ لہجے میں بولیں ''دلی۔ ارے تیرا دماغ خراب ہے۔ دلی میں تیرا کون بیٹھا ہے۔ ریوتی تو خود آ کر مل گیا۔'' اصل میں 1947ء والی دلی کی قیامت کو وہ ابھی بھولی نہیں تھیں۔ میں نے انہیں سمجھایا ''سرلا سے جا کر ملنا ہے۔''

''اس کے پیروں میں کیا مہندی لگی ہوئی ہے۔ وہ بھی ہاپوڑ کا پھیرا لگا جائے۔''

''اس غریب کو ہاپوڑ میں کوئی قدم رکھنے دے گا۔ آپ کو پتہ نہیں ہے۔ یہ شادی کیسے ہوئی ہے۔''

اس پر انہیں لاجواب ہونا ہی تھا۔ بہر حال انہوں نے امام ضامن باندھ کر اور قرآن کی ہوا دے کر مجھے رخصت کیا اور ہمارے بہنوئی صاحب نے ہدایت کی کہ جب گاڑی سے اترو اور سٹیشن سے نکلو تو سات مرتبہ نادعلی پڑھ لینا۔''

لیجئے ریل کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ شروع ہوگئی۔ دلی آ گئی مگر عجب احوال تھا۔ وہی جمنا کا پل' وہی لال قلعہ کی فصیل' وہی گاڑی کا ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ پل سے گزرنا۔ اسی طرح مسافروں کا ندی میں سکے پھینکنا اور شور مچانا جمنا میا کی جئے۔ مگر مجھے ایک عجب طرح کی اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس سارے گرد و پیش سے میرا رشتہ بدل چکا تھا۔ خیر اتنا میں نے ضرور کیا' جیب سے ایک پاکستانی سکہ نکال کر جمنا کی نذر کیا۔ یہ سوچ کر کہ اب جانے پھر کب جمنا سے ملاقات ہو اور اس کے بعد میں نے نادعلی پڑھنی شروع کر دی۔

ریوتی کے نئے ٹھکانے کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا لودی کالونی پہنچا۔ لیجئے فلیٹس تک تو پہنچ گیا مگر فلیٹوں کے اس بے انت سلسلہ میں ریوتی کے فلیٹ کو کیسے تلاش کیا جائے۔ سامنے برآمدے میں چند عورتیں بیٹھی کاڑھ بن رہی تھیں۔ میں نے جا کر ان سے پتہ پوچھا۔ انہوں نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس شک کی ذمہ داری میری اچکن تھی۔ ویسے تو وہ اگست کا مہینہ تھا مگر اس زمانے میں گرمی برسات جو بھی موسم ہو خالی کرتے پائجامے میں شرفا ڈیوڑھی سے قدم نہیں نکالتے تھے۔

خیر پتہ تو تھوڑے تامل کے بعد ان بیبیوں نے بتا دیا مگر پھر ہوا یوں کہ میں نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا اور سرلا سے خیر و عافیت کی بات ہو رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سرلا نے دروازہ کھولا تو سامنے انہیں عورتوں میں سے ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے کچھ پوچھا۔ سرلا نے جواب دیا۔ وہ شرما جی کے متر ہیں اور میرے بھیا ہیں۔

پھر اس نے کچھ پوچھا اور سرلا نے جواب دیا ''ہاں مسلمان ہیں مگر آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' روکھے سے لہجے میں کہا کہ اس بی بی کو جلدی ہی رخصت ہو جانا پڑا۔

ادھر میرے دل میں خوف سمانا شروع ہوا مگر خیر جلدی ہی ریوتی دفتر سے چھٹی کر کے آن پہنچا اور وہ خوف فوراً کے فوراً زائل ہو گیا۔

اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ اس پھیرے کے بعد پھر کیا ہوا کہ زمانہ گزر گیا اور قدم اس طرف کے لیے نہیں اٹھے۔ ایک جنگ آئی اور گزر گئی۔ خدا خدا کر کے رستے تھوڑے تھوڑے کھلے۔ پھر دوسری جنگ آن ٹوٹی۔ پھر رستے بند۔ بس اسی میں تیس بتیس سال گزر گئے۔ اس کے بعد کہیں دلی کے سفر کی صورت پیدا ہوئی۔

دلی اس عرصہ میں اور سے اور ہو چکی تھی۔ جیسے یہ گلی کوچے اور جیسے یہ امنڈتی ہوئی خلقت اور ہو۔ اور جب میں نے اس گھر میں قدم رکھا تو وہاں بھی ایک نئی تانتی ظہور میں آ چکی تھی۔ اس درمیان ریوتی کے یہاں دو بیٹے پیدا ہوئے۔ وہ بچوں سے جوان ہوئے۔ پھر ان کی بیاہ شادیاں ہوئیں۔ پھر ان کے یہاں بچے پیدا ہوئے تو اب گھر بھرا ہوا تھا۔ بیٹے' بہوئیں' پوتیاں' پوتے مگر جس کے دم کا یہ ظہور تھا' وہ ان کے بیچ موجود نہیں تھی' وہ بیکھنٹ سدھار چکی تھی۔

مگر یہ تو زندگی کا عمل ہے۔ اس کی اوبڑ کھابڑ چال ہمارے جذبات و احساسات کو کب خاطر میں لاتی ہے۔

لو اس گھر کے ذکر سے یاد آیا۔ ایک دوست کو تو میں بھول ہی چلا تھا۔ وہ سنگھ ہے۔ مت سمجھئے کہ وہ سکھ ہے۔ وہ عیسائی ہے۔ اس گھر میں جا کر اترتا ہوں تو مجھے اس کی یاد آتی ہے۔ بڑھتی عمر کسے نہیں ستاتی۔ اسے زیادہ ستا رہی ہے۔ لنگڑاتا لنگڑاتا آتا ہے۔ آتے ہی ریوتی کے خلاف ایک دفتر کھول دیتا ہے۔ ایک ایک اس کی برائیاں گناتا ہے۔ جب دل کی بھڑاس نکال لیتا ہے اور کہنے کو کچھ نہیں رہتا تو مطمئن واپس جاتا ہے۔

ہمعصر تو خیر ہوئے' اور یار دوست بھی ہوئے۔ مگر ایسے لوگ بھی تو ہوتے ہیں جو دم بھر کے لیے ملتے ہیں مگر آپ پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ تو مجھے اسی گھر کے حوالے سے ایک نوجوان ڈاکٹر یاد آ رہا ہے۔ ہوا یوں کہ مجھے جاڑے بخار نے آ لیا اور حالت بگڑتی ہی چلی گئی۔ چھوٹی بہو منیکا نے میری حالت غیر دیکھی تو موٹر میں ڈال اسی نواح میں ایک ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ایک سمارٹ سکھ نوجوان۔ منیکا جلدی جلدی تعارف کراتی ہے۔ ''یہ ہمارے بابو جی کے متر ہیں۔ پاکستان کے بہت بڑے لیکھک ہیں۔ لاہور سے آئے ہیں۔ انہیں یاں پہ یاترا ایوارڈ ملا ہے۔'' ڈاکٹر جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔ اپنے کام سے کام۔ دیکھتا ہے۔ حال پوچھتا ہے۔ نسخہ لکھ کر دیتا ہے۔ پرہیز بتاتا ہے۔ منیکا پرس کھول کر فیس کی رقم نکالتی ہے تو فیس لینے سے صاف انکار کر دیتا ہے'' ''یہ تو ہمارے مہمان ہیں فیس کیسے لوں۔'' پھر مجھ سے مخاطب ہوتا ہے۔ ''اصل میں میں ادھر ہی کا ہوں۔ خیر میں تو نہیں۔ میری تو پیدائش یہیں کی ہے۔ ہمارا

خاندان لائلپور میں رہتا تھا۔ بٹوارہ ہوا تو ماتا پتا یہاں آ گئے۔'' پھر منیکا سے مخاطب ہے ''شام کو مجھے حال ضرور بتانا۔ آٹھ بجے تک میں کلینک میں ہوں گا۔ پھر مجھے اپنی بہن کی طرف جانا ہے۔ میری بہن کا فون نمبر بھی لکھ لو۔ اس کے بعد گھر پر ملوں گا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو جس وقت بھی ہو یہ فون نمبر تمہارے پاس ہے۔ میں جہاں بھی ہوں مجھے فون کر کے بتانا۔''

اچھا ایسے ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر ہونا کیا ضرور ہے۔ بھلا آدمی کسی بھی روپ میں کسی بھی موڑ پر آپ کو مل سکتا ہے جیسے وہ سٹیشن ماسٹر تھا جس کا اڑتا اڑتا ذکر میں اپنے ایک سفرنامے میں کر چکا ہوں۔ شاید وہ بھسادل کا سٹیشن تھا۔ ایجنٹا کی یاترا سے فارغ ہو کر سٹیشن پہنچے تو پتہ چلا کہ ہماری نشستوں کا توریز رویشن ہے ہی نہیں۔ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ریلوے والے لفٹ دینے کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ آدھی رات ادھر آدھی رات ادھر۔ گاڑی آنے والی ہے۔ یہ گاڑی نکل گئی تو پھر ہمارا اللہ ہی حافظ ہے۔ اور سٹیشن ماسٹر نے روکھا جواب دے دیا ہے۔ ''کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔'' مگر تھوڑی دیر بعد اچانک اسے کچھ خیال آتا ہے۔ ''آپ لوگوں میں سے لاہور کا بھی کوئی ہے۔''

''میں ہوں۔''

''اچھا آپ لاہور کے ہیں۔ اچھا تو گوالمنڈی کا کیا حال ہے۔''

''گوالمنڈی شاد آباد ہے۔''

''اور ایف سی کالج؟''

''ایف سی کالج ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''اصل میں ہم گوالمنڈی میں رہتے تھے۔ ایف سی کالج میں پڑھا ہوں۔ آپ شاید جانتے ہوں اردو کے ایک کوی تھے پنڈت تلوک چند محروم۔ میں ان کا بھتیجا ہوں۔''

''سبحان اللہ۔'' میں نے کہا ''پھر تو دور کے رشتے نکل آئے۔ اور اب گاڑی میں جگہ نہ ملی تو ہم آپ ہی کے گھر چل کر بسیرا کریں گے۔''

''اچھا کچھ کرتا ہوں۔''

اپنے دفتر میں ہمیں لے جاتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر اپنے کسی افسر کو فون کر کے کچھ باتیں کرتا ہے۔'' پھر ہمیں نوید دیتا ہے کہ ''کام بن گیا۔ ہمارے ایک افسر نے اپنے فیملی کے لیے دو کوپے ریزرو کرائے تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ پاکستان کے کچھ مہمان ہیں۔ ان

کی سیٹیں ریزرو نہیں ہیں۔ اس نے اپنا ایک کوپے آپ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔"

خوب۔ اچھے لوگ کہاں نہیں ہوتے۔ یہ ہندوستان ہے۔ دور سے وہاں کے لوگ کیا نظر آتے ہیں۔ قریب جا کر کیا نکلتے ہیں۔ یہ فقرہ تھوڑی ترمیم کے ساتھ میں نے اپنے ایک دوست کی بیگم سے مستعار لیا ہے۔ یہ دوست کون ہے۔ اور اس کی بیگم کون ہے۔

میکاری یونیورسٹی کے آئن بیڈفورڈ نے لاہور میں گھومتے پھرتے الل ٹپ افسانوں کا ایک مجموعہ.....

"An Unwritten Epic and other Stories" خرید لیا۔ میری کہانیوں کے انگریزی ترجموں کا ایک انتخاب مرتبہ محمد عمر میمن۔ ان میں ایک کہانی "ایک بن لکھی رزمیہ" کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ آئن بیڈفورڈ کہانیاں پڑھتے پڑھتے اس کہانی پر اٹک گئے اور ایسے اٹکے کہ اس کا تجزیہ کرتے کرتے ایک پورا مقالہ لکھ ڈالا جو "جرنل آف کامن ویلتھ لٹریچر" میں شائع ہوا۔ اور اب اردو میں ترجمہ ہو کر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کی مرتب کتاب "انتظار حسین ایک دبستان" میں شامل ہے۔ ان سے پہلی ملاقات انہیں دنوں ہوئی تھی جب انہوں نے تازہ تازہ یہ کہانی پڑھی تھی اور اس کے مصنف کی تلاش میں تھے۔

پچھلے برسوں میں پھر لاہور کا دورہ ہوا تو آ کر ملے۔ کہا کہ میرے پاس دو خوش خبریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں نے آپ کی ساری کہانیاں ناول پڑھ ڈالے ہیں۔

میں نے پوچھا "وہ کیسے۔ آپ اردو تو جانتے نہیں۔ انگریزی میں جتنا ترجمہ ہوا ہے اتنا ہی پڑھا ہوگا۔"

کہا کہ "ان برسوں میں میں نے اردو سیکھ لی ہے۔"

"بہت اچھی خبر ہے۔"

"دوسری خبر۔ میں نے شادی کر لی ہے۔"

"یہ ہوئی خوشخبری۔"

"مگر کس سے کی ہے۔ میں ہندوستان میں اپنے تحقیقی کام کے سلسلہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہماری فیلڈ میں ایک تامل لڑکی بھی کام کر رہی تھی۔ بس اس سے میری شادی ہوگئی۔ وہ اسی ہفتے پہنچنے والی ہے۔ آپ اس سے ملنا چاہیں گے۔"

"یقیناً"

"مگر وہ مسلمانوں کے بہت خلاف ہے۔ کہتی ہے کہ یہ سب Fundamentalist ہوتے ہیں۔ پاکستان کو سمجھتی ہے کہ یہ FUNDAMENTALISTS کا ملک ہے۔ سو پاکستان کے بارے میں بھی اس کی رائے سخت مخالفانہ ہے۔"

میں نے کہا ''پھر تو آپ کی بیگم سے ملنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔''

''میں نے آپ کی کچھ کہانیاں اسے پڑھوائیں۔ آپ کو تو اس نے رعایتی نمبر دے دیئے۔ مگر مسلمانوں اور پاکستان کے بارے میں اپنی رائے پر شدت سے قائم ہے۔''

''کوئی مضائقہ نہیں۔ ملاقات ہونی چاہیے۔''

جب بیگم کو لے کر ملاقات کے لیے آئے تو تیسری خوشخبری سنائی۔ آتے ہی قہقہہ لگایا اور اطلاع دی ''ہماری بیگم کی رائے بدل گئی۔ اور آج ہی بدلی ہے۔''

''وہ کیسے۔''

کہا کہ ''ہم آج سارے دن لاہور میں گھومتے پھرتے رہے ہیں۔ پرانے شہر کی طرف نکل گئے۔ ایک نوجوان ہمارا گائیڈ بن گیا۔ بازار بازار لیے پھرا۔ جس بازار گئے' جس دکاندار سے ملے وہ یہ جان کر کہ ہماری بیگم ہندوستان سے آئی ہے بہت خوش ہوا۔ ہر ایک نے بہت آؤ بھگت کی۔ پھر ہم مسجد وزیر خاں دیکھنے کے لیے گئے۔ میں نے بیگم سے کہا کہ تم ہندو ہو۔ تمہیں وہ لوگ مسجد نہیں دیکھنے دیں گے۔ تو بتانا مت کہ ہندو ہو۔ مگر انہوں نے وہاں پہنچتے ہی مسجد کے امام صاحب سے کہا کہ میں ہندو ہوں' ہندوستان سے آئی ہوں۔ سنا ہے کہ یہ ایک تاریخی مسجد ہے' اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا ضرور دیکھو۔ ہاں اپنے جوتے باہر اتار دو۔ ایک لڑکے سے کہا کہ دیکھو یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی جوتیوں کا خیال رکھو۔ تو انہوں نے خوشی خوشی انہیں مسجد دکھائی۔ تو بس آج آج میں مسلمانوں کے بارے میں اور پاکستان کے بارے میں ان کی رائے بدل گئی۔''

اس پر مسز بیڈفورڈ بولیں ''بات یہ ہے کہ پروپیگنڈا بہت ہے۔ دور سے کچھ نظر آتا ہے۔ قریب جا کر دیکھو تو کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔''

اس سے میرا دھیان مرہٹی زبان کے ڈرامہ نگار وجے ٹنڈولکر کی طرف مڑنے لگا ہے۔ پچھلے ہی برسوں میں میں نے ان کے ایک دو ڈرامے پڑھے تھے۔ ایک ڈرامہ SILENCE, THE COURT IS IN SESSION اتنا بھلا لگا کہ اسے اردو میں ترجمہ کر ڈالا۔ لاہور کے ایک گروپ نے اسے سٹیج بھی کیا تھا۔ ڈھاکہ کے جس سیمینار کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے اس میں وہ آئے ہوئے تھے۔ اس طرح ان سے ملاقات کی تقریب پیدا ہوئی۔ بحث مباحثہ میں ذرا جو انہوں نے حصہ لیا ہو۔ سب بول رہے ہیں' یہ چپ بیٹھے ہیں۔ محفل میں شامل بھی' محفل سے بے تعلق بھی۔ آخری سیشن میں انہیں اپنا پیپر پڑھنا تھا۔ مگر ادھر وہ نشست شروع ہو رہی

تھی ادھر یہ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ''آپ کے تاثرات سے تو ہم محروم ہی رہے۔ اب اس سیشن میں آپ کو اظہار خیال کرنا تھا تو آپ جا رہے ہیں۔

بولے ''میری جو سمجھ میں آیا وہ میں نے لکھ کر ان کے حوالے کر دیا۔ پتہ نہیں وہ تحریر ان کے سیمینار کے مطلب کی ہے یا نہیں۔ بہر حال میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ باقی وہ جانیں ان کا کام جانے۔''

اور یہ تحریر کیا تھی۔ عنوان تھا: MUSLIMS AND I ''مسلمان لوگ اور میں۔'' بتایا تھا کہ میں نے ایسی سوسائٹی میں آنکھ کھولی جس میں مسلمان کا گزر ہی نہیں تھا۔ ان کے متعلق پروپیگنڈا بہت تھا کہ بہت وحشی' جاہل اور خونخوار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں ان کے تصور سے خوف کھاتا تھا۔ مگر پھر یہ ہوا کہ سکول میں میری کلاس میں ایک قصائی کا لڑکا تھا۔ اس سے دوستی ہو گئی۔ دوستی اتنی بڑھی کہ میں نے اس کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ اس کے ماں باپ کو دیکھا۔ سب ہی بہت اچھے لوگ نظر آئے۔

تو یہ تھا وجے ٹنڈولکر کا مسلمانوں سے پہلا تعارف۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کے تصور میں مسلمانوں کا امیج بدلتا چلا گیا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اننت مورتی یاد آنے شروع ہو گئے ہیں۔ کنڑ زبان کے ناول نگار۔ لمبا قد' بھرا بھرا جسم' کھچڑی ڈاڑھی' گندمی رنگ' بات کس رسانیت سے کرتے ہیں اور کس توجہ سے سنتے ہیں۔ کھٹمنڈو میں دیکھا کہ اصغر علی انجینئر کی باتیں کچھ زیادہ ہی توجہ سے سن رہے ہیں۔ اور اصغر علی انجینئر کی تو ہر بات گویا اسلام کے کسی تصور کسی خیال کی تشریح تھی۔ اور اننت مورتی ہیں کہ ان سے سوال کیے جا رہے ہیں اور جو وہ کہتے ہیں اسے پورے دھیان سے سنتے ہیں۔ مجھے تجسس ہوا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ سو میں نے اننت مورتی جی کو ذرا کریدا۔ تب وہ کھلے ''بولے کہ آج کل میں قرآن پڑھ رہا ہوں۔ میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ یہ اسلام کس قسم کا فینومینا ہے۔ آخر ہندوستان میں اتنے مسلمان بستے ہیں۔ مجھے یہ سمجھنا چاہیے۔''

سمجھتے سمجھتے وہ اب اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر تک کے بارے میں ان کی رائے اچھی خاصی ہمدردانہ ہے۔ یہ کہ وہ بہت متعصب بادشاہ تھا' یہ ماننے میں انہیں تامل ہے۔ دلیل پہ لاتے ہیں کہ بنارس یونیورسٹی کے بیچ ایک پرانی لاٹھ کھڑی ہے۔ اس پر اورنگ زیب کی طرف سے ایک حکمنامہ کندہ ہے جو یہ ہے کہ کسی مندر کو ڈھانے کی کوشش نہ کی جائے۔

بات یہ ہے کہ یوں تو ہندوستان میں جو پچھلے برسوں میں آنا جانا ہوا اس میں کتنے ہندی اور دوسرے ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں مگر جو بات اننت مورتی کی شخصیت میں دیکھی وہ کسی میں نظر نہ آئی۔ ارے ان کی تو کھچڑی ڈاڑھی میں بھی ایک کشش ہے۔ بلکہ ان کی شخصیت میں جو دلاویزی ہے وہ آدھی اس ڈاڑھی کی مرہون منت ہے۔ انہیں کے اصرار پر تو میں نے

آصف فرخی کو ساتھ ملا کر ساہتیہ اکیڈیمی کے لیے پاکستانی افسانوں کا پچاس سالہ انتخاب کیا تھا۔ ڈھاکہ کے سیمینار میں میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اگر آپ جنوبی ایشیا کی قوموں کے بیچ افہام و تفہیم کے خواہاں ہیں تو کوئی ادارہ ترجمہ قائم کیجیے جو اس خطہ کی زبانوں کے ادب کو ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری زبان میں ترجمہ کرے۔ اس بات کو انہوں نے پکڑ لیا اور مجھ سے کہا کہ پتہ نہیں یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ تم میرے کہنے پر ساہتیہ اکیڈیمی کے لیے پاکستانی افسانوں کا ایک انتخاب کر دو۔ اکیڈمی اسے اردو کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کروا کے شائع کرے گی۔ اس وقت تک وہ ساہتیہ اکیڈیمی کے کرتا دھرتا تھے۔ چیئرمین یا نائب چیئرمین جو بھی ہوں۔ مگر میں تو ان کی ڈاڑھی کا ذکر کر رہا تھا۔ ان کی ڈاڑھی کیسی خوب اور مرغوب ڈاڑھی ہے۔ بہت گھنی بھی نہیں۔ ایسی چھدری بھی نہیں۔ نہ بہت کالی نہ بہت سفید۔ سفیدی اور سیاہی دونوں ایک اعتدال کے ساتھ۔ مطلب وہی کہ کھچڑی ڈاڑھی۔

اصل میں ڈاڑھیاں بھی تو رنگ رنگ کی ہوتی ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ ڈاڑھی تعصب اور تنگ نظری کی چغلی کھائے اور ایسی گاڑھی ہو کہ ہمیں آپ کو کھانے کو آئے۔ اب میں شناساؤں دوستوں کی ڈاڑھیاں جو جو مجھے یاد آتی جاتی ہیں گنی شروع کرتا ہوں۔ سدھیر کی ڈاڑھی' الوک بھلہ کی ڈاڑھی' غلام محمد شیخ کی ڈاڑھی' محمد عمر میمن کی ڈاڑھی' اصغر علی انجینئر کی ڈاڑھی۔ وہ جو بنیاد پرستانہ ڈاڑھی ہوتی ہے جھاڑ جھنکاڑ قسم کی' جس سے وحشت ٹپکتی ہے اور دلوں میں دہشت بیٹھ جاتی ہے اس کی جھلک ان میں سے کسی ڈاڑھی میں بھی نظر نہیں آئے گی۔ سدھیر سے تو کھٹمنڈو ہی میں گیتا نجلی کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی۔ جب میں نے گیتا نجلی کی انگلی کی سیدھ میں نظر دوڑا کر گوری شنکر کے درشن کر لیے یعنی دل بادل میں غرق اس پربت کو جو گوری شنکر سے منسوب ہے اور ان دونوں کے ساتھ مندر مندر گھوم لیا تو جان لیا کہ اب ہم ان کے اور وہ ہمارے دوست ہیں۔ اسی منڈلی میں اپنی طرز کے مصور اور اپنے رنگ کے آدمی غلام محمد شیخ بھی تھے۔ ان سے بھی گاڑھی چھننے لگی۔ وہیں اصغر علی انجینئر سے بھی گاڑھی چھننی شروع ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ کھٹمنڈو کے سیمینار میں ڈاڑھیاں بہت تھیں۔ ٹیگورین ڈاڑھی سے لے کر اصغر انجینئر کی مسلمانی ڈاڑھی تک۔

الوک بھلہ نے اپنے چھریرے بدن اور چھریری ڈاڑھی کے ساتھ لاہور کا ایک پھیرا لگایا تھا جب وہ تقسیم کے ہنگام لکھی ہوئی کہانیوں پر کام کر رہے تھے۔ چلتے چلاتے میری بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ میری کہانیوں پہ ایسے ریجھ جائیں گے کہ ترجمہ پہ ترجمہ کرتے چلے جائیں گے۔

اور محمد عمر میمن جن کی مختصر بھوری ڈاڑھی کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ مجھے تو کبھی اس ڈاڑھی سے کسی تعصب کی بو نہیں آتی۔ ہمیشہ

اس سے خوشگوار مہک ہی آئی۔ مگر جب انہوں نے لاہور آ کر حلقہ ارباب ذوق میں اپنا مقالہ پڑھا تو تین شیعہ انقلابیوں نے وہاں کچھ اور سونگھا۔ میمن نے کہا یہ کہ شیعہ روایت کے پس منظر میں میرے ناول ''بستی'' کا ایک تجزیہ پیش کر ڈالا۔ اور شیعہ روایت کی انہوں نے توجیہہ اس طرح کی کہ واقعہ کربلا سے اس گروہ کے یہاں ایک احساس مظلومی پیدا ہو گیا اور عمل کی جگہ گریہ وزاری' نے لے لی۔ اتفاق سے اس جلسہ میں تین ایسے دانشور موجود تھے' آغا سہیل' رضی عابدی' اشفاق نقوی جن کی مارکسیت میں اب امام خمینی کے انقلاب کا ذائقہ بھی شامل ہو گیا تھا' یعنی ان کا انقلابی مزاج دو آتشہ ہو گیا تھا۔ انہیں شیعیت کی یہ تعبیر بالکل نہیں بھائی۔ انہیں گمان ہوا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس نے امام بن تیمیہ پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اسی اثر میں شیعوں کو اس نے دیکھا اور سمجھا ہے حالانکہ واقعہ کربلا تو اپنے جلو میں ایک انقلاب لایا تھا جس سے اس گروہ میں ایک انقلابی روح پیدا ہوئی۔

یہ دانشور جب محمد عمر میمن کے استدلال پر گرم و سرد ہو رہے تھے تو انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا اور کہا کہ آپ نہیں بول رہے۔ میں کیا بولتا۔ میں نے اپنے نہ بولنے کی وجہ بھی انہیں مختصراً بتا دی تھی۔ ایک تو یہ کہ میری جذباتی تربیت تو انیس و دبیر کے مرثیوں کے سائے میں ہوئی ہے

''آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے''

مرثیے کے ایسے مقامات پر میں سر دھنتا ہوں م۔ جوش صاحب کے مرثیے مجھے مرثیے نظر نہیں آتے۔ واقعہ کربلا کے ساتھ انقلاب کا نعرہ جوش صاحب کی طرف سے آئے یا علی شریعتی کی طرف سے میرے حلق سے نہیں اترتا۔ انسان بالآخر بیدار ہو گا اور پکارے گا کہ ہمارے ہیں حسین۔ یہ بات مجھے بالکل اپیل نہیں کرتی۔ خود انسان کی بیداری کا معاملہ مشکوک ہے۔ جتنا بیدار ہوا ہے اس سے کونسی فلاح کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ یہی ہو گا نا کہ مزید بیدار ہوا تو مزید ایٹم بم بنائے گا' یا ایٹم بم سے بھی بڑھ کر کوئی بم شے۔

دوسری بات۔ افسانہ نگار ہو یا شاعر ہو اسے نقاد کے ساتھ جرح نہیں کرنی چاہیے۔ اس کا کام لکھنا ہے۔ باقی قارئین جانیں اور نقاد جانیں کہ وہ اسے کس طرح پڑھتے ہیں اور کیا معنی ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ مگر مجھے جلد ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا اور پھر میں نے چپ سادھ لی۔ اور اپنے دفاع کا کام اپنے ہمدردوں کے لیے چھوڑ دیا۔ یہ اس موقعہ پر ہوا تھا جب میں نے دہلی یونیورسٹی میں جا کر استادوں اور طلباء کی محفل میں اپنا افسانہ ''یاں آگے درد تھا'' سنایا تھا۔ اس کہانی میں تقسیم سے پہلے کی ایک صورتحال ہے کہ ایک کالج میں طلباء آپس میں شیر و شکر ہیں مگر

رفتہ رفتہ سیاسی پارٹیوں کے اثرات وہاں پہنچتے ہیں۔ کالج کے بیچ ایک درخت ہے۔ ایک دن ایک پارٹی کا جھنڈا وہاں لہراتا نظر آتا ہے۔ اگلے دن وہ جھنڈا اتر جاتا ہے اور دوسری پارٹی کا جھنڈا اس کی جگہ نظر آتا ہے۔ پھر وہ بھی اتر جاتا ہے۔ تیسری پارٹی کا جھنڈا لہراتا دکھائی دیتا ہے۔ بس اس کے ساتھ کالج کی فضا کشیدہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

چھوٹتے ہی ایک اعتراض آیا ''سب سے پہلے کانگریس کا جھنڈا اس درخت پر نصب کیا جاتا ہے۔ کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ فتنہ فساد کانگریس کی طرف سے شروع ہوا۔''

بس پھر اللہ دے اور بندہ لے۔

کہانی لکھتے وقت یہ نکتہ بیشک میرے ذہن میں نہیں تھا۔ مگر کیا پتہ ہے کہ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال چھپا بیٹھا ہو۔ میرے قلم نے مجھے بتائے بغیر اس خیال کو وہاں سے لپک لیا۔ آخر افسانہ نگار کا قلم ہر بات افسانہ نگار کے شعور سے پوچھ کر تو نہیں لکھتا۔ وہ تو شعور اور غیر شعور کی سرحد پر دوڑتا رہتا ہے۔

تو پہلے معترضین کی یورش مجھ پر ہوئی۔ پھر دو گروہ بن گئے اور آپس میں لڑنے لگے۔ نارنگ صاحب' ریوتی' ڈاکٹر شارب ردولوی سب باری باری اپنی استدلالی مہارت کو بروئے کار لائے اور میرا دفاع کیا۔ مگر کسی کی بات نہیں سنی گئی۔ ایسے میں ایک خوش رو' خوش پوش' خوش گفتار بی بی کھڑی ہوئی اور منہ سے ایسے پھول برسائے کہ بھڑکتی آگ دیکھتے دیکھتے بجھ گئی۔ کوئی اپنے نجات دہندہ کو بھولا کرتا ہے اور بالخصوص اس صورت میں کہ نجات دہندہ ایک خوش رو خوش گفتار خاتون ہو۔ یہ تھیں شمع فتح علی۔ اگلے پھیرے میں ان سے مڈھ بھیڑ ہوتی تو انہوں نے مجھے اپنا ناول دیا تھا۔ ''TARA LANE''۔ وہ میں نے پڑھ لیا۔ اگلے پھیرے میں ان سے مڈھ بھیڑ ہوئی تو انہوں نے اپنی نئی کتاب مجھے عنایت کی۔ یہ میرا بائی کے بھجنوں کا انگریزی ترجمہ تھا۔ اس کے بارے میں میں نے ان سے وہیں کہہ دیا تھا کہ ''کتاب بہت اچھی لگ رہی ہے۔ مگر میرے لیے اسے پڑھنا مشکل ہوگا۔''

وجہ؟ وجہ یہ ہے کہ میرا بائی کو انگریزی میں پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ انگریزی میں منتقل ہو کر بھجن نظم بن جاتا ہے' بھجن نہیں رہتا۔ کبیر اور میرا بائی' ان کے انگریزی ترجمے جب بھی نظر آئے میں نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ مجھے ضد ہے کہ ان شاعروں کو اگر پڑھنا ہے تو انہیں کی زبان میں پڑھنا ہے۔ بیشک وہ زبان مجھے بس آدھی پردھی سمجھ میں آتی ہو۔ ارے جہاں سمجھ میں نہیں آئے گا وہاں علی سردار جعفری سے مدد لے لیں گے۔ ''کبیر بانی'' اور ''پریم وانی'' یہ دو کام انہوں نے کمال کے کیے ہیں۔ اردو والوں کے لیے کبیر اور میرا بائی کو سہل بنا دیا۔ دوہا کے پھیرے میں ان سے نیاز حاصل ہوا تو میں نے ان دو کاموں پر انہیں جی بھر کر

خراج تحسین پیش کیا۔ بہت خوش ہوئے کہا کہ ایسا ہی کام میں نے غالب کے سلسلہ میں کیا ہے اور میر کے سلسلہ میں کر رہا ہوں۔ غالب کے کام کی اس وقت میرے پاس ایک ہی جلد ہے۔ دوسروں سے نظریں بچا کر تمہیں دوں گا۔ وہ جلد انہوں نے چپکے سے مجھے عنایت کی۔ میں نے اسے سر آنکھوں سے لگایا۔ کبیر اور میرا بائی کو انہوں نے اردو والوں کے لیے آسان بنایا تھا۔ اسی نہج پر غالب کو ہندی والوں کے لیے سہل بنایا ہے۔

علی سردار جعفری، ترقی پسند تحریک کی شاندار یادگار

''آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم''

عمر کے ساتھ آگ ٹھنڈی ہوئی۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں۔ ہاں طبیعت میں اعتدال آ گیا ہے۔ لہجہ نرم ہو گیا ہے۔ سو مجھے اچھے لگنے لگے ہیں۔

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

آوارہ یادیں کہاں کہاں لیے پھریں۔ ہر پھر کر وہی لاہور، پھر اس کے وہی صبح و شام، شامیں تو بہت برتیں، مگر صبحوں کا بھی تو اپنا ایک عالم ہوتا ہے۔

منہ اندھیرے کبھی اٹھ کر دیکھو
کیا تر و تازہ ہوا ہوتی ہے

ایسی ہی ایک صبح تھی۔ میں جیل روڈ سے گزر رہا تھا۔ باغ جناح کی طرف جا رہا تھا۔ ایک موٹر تیزی سے میرے برابر سے گزری۔ تھوڑی دور جا کر ریورس گیر لگا۔ میرے قریب آ کر رکی۔ ایک صاحب نے منہ نکال کر پوچھا ''آپ شاید انتظار حسین ہیں۔''

''جی۔''

''یہ بتایئے آپ کا جو افسانہ ''فراموش'' ہے اس کا مطلب کیا ہے۔''

میں پریشان ہوا۔ اچانک پکڑا گیا تھا۔ موصوف عجلت میں تھے اور جلدی جواب چاہتے تھے۔

میری پریشانی دیکھ کر بولے ''دیکھئے اب تو یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ میں اصل میں ڈاکٹر ہوں۔ یہ افسانہ ہمارے کورس میں تھا۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا تھا۔ خیر یہاں سے کورس پورا کر کے میں امریکہ چلا گیا۔ اب واپس آیا ہوں اور سروسز ہسپتال میں ہوں۔ وہیں جا رہا ہوں۔ آپ نظر آ گئے تو میں نے سوچا لگے ہاتھوں پوچھ ہی لیا جائے کہ اس افسانے کا مطلب کیا ہے۔''

میں نے کہا ''چھوڑیئے۔ آپ کا وہ مشکل وقت گزر ہی گیا۔ اب اس کا مطلب پوچھ کر کیا کریں گے۔''

بولا ''یہ بھی ٹھیک ہے۔ ویسے کیا آپ محکمہ تعلیم سے متعلق ہیں۔''

''نہیں۔''

''پھر یہ افسانہ نصاب میں کیسے شامل ہو گیا۔''

''ایسے کام سفارش سے بھی تو ہو جاتے ہیں۔''

میری یہ بات اس نے بہت سنجیدگی سے سنی اور سوچ میں پڑ گیا۔ پھر آہستہ سے بولا ''پھر کوئی بڑی سفارش ہو گی۔'' یہ کہہ کر گاڑی سٹارٹ کی اور تیزی سے گزر گیا۔

''فراموش'' پر موقوف نہیں۔ اس سے پہلے ایک اور افسانہ ''کایا پلٹ'' شاید انٹر کے کورس میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے بھی طلباء اور طالبات کے لیے ایسی ہی مشکلات پیدا کی تھیں۔ مگر مجھے جتنے فون آئے وہ سب طالبات کے تھے۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ طلباء کو زیادہ پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ ایک افسانہ اگر سمجھ میں نہیں آیا تو نہ آئے۔ ایسا کونسا بھاری فرق پڑ جائے گا۔ مگر طالبات کے استفسار کا سلسلہ چلتا ہی رہا۔ کسی بھی صبح کسی طالبہ کا فون آ جاتا ''یہ آپ نے جو ''کایا پلٹ'' لکھا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔''

ایک طالبہ سے میں نے پوچھا ''آپ نے اپنی استانی سے کیوں نہیں پوچھا۔''

''جی پوچھا تھا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ میری سمجھ میں تو یہ کہانی آئی نہیں۔ اس کا لکھنے والا اسی شہر میں کہیں رہتا ہے۔ اس کا اتا پتہ معلوم کرو اور اس سے مطلب پوچھ لو۔''

ہاں صبحوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک صبح اسی طرح باغ جناح کی طرف جا رہا تھا کہ ایک سائیکل سوار قریب سے گزرتے گزرتے رکا۔ سائیکل سے اتر کر میرے قریب آیا ''انتظار صاحب' آپ ایک لاہور نامہ میرے کہنے سے بھی لکھ دیجئے۔ بہت ضروری ہے۔ ایک ہفتے کے بعد لاہور میں بہت بڑا زلزلہ آئے گا۔ پورا شہر ڈھے جائے گا۔ لوگوں کو بتایئے کہ انہوں نے جتنے پرندوں کو قید کر رکھا ہے ان سب کو رہا کر دیں۔ پھر یہ زلزلہ ٹل سکتا ہے۔''

میں نے اسے بتایا کہ لاہور نامہ اب میں نہیں لکھتا۔ مشرق بند ہو چکا ہے۔ اس دفتر کو گائے چر گئی۔ گائے کو قصاب لے بھاگا۔

''اچھا۔ پھر کیا ہو سکتا ہے۔'' اس نے بہت مایوسانہ لہجہ میں کہا اور سائیکل پر سوار ہو آگے نکل گیا۔

کوئی ڈھائی تین مہینے کے بعد ایک صبح میں نے اسے دیکھا کہ سائیکل پر دوڑا چلا جا رہا ہے۔ میرے برابر سے گزرا۔ وہ تو گزرا

چلا جا رہا تھا۔ میں نے ہی اسے روکا۔ کہا کہ ''بھائی جس زلزلہ کی آپ نے خبر دی تھی وہ تو نہیں آیا۔''

بولا ''پتہ ہے کیوں نہیں آیا۔''

''مجھے کیا پتہ۔''

''ہوا یوں کہ جب آپ نے مجھے جھنڈی دکھا دی تو میں دوڑا ہوا پرانی انارکلی گیا۔ طوطوں سے بھرا ایک پنجرہ خریدا۔ فوراً ہی سب طوطوں کو اڑا دیا۔ دوسرے دن بھی یہی کیا۔ پھر تیسرے دن بھی۔ اس طرح زلزلہ ٹلا ہے۔ مگر پرندے اب بھی بہت سارے اس شہر میں پنجروں میں بند ہیں۔ میرے پاس اتنا کہاں ہے کہ روز پنجرے خرید خرید کر طوطے اڑاؤں۔ تو زلزلہ تو آنا ہے۔''

میں نے دل ہی دل میں اس شخص سے اتفاق کیا۔ ان گنت پرندے پنجروں میں قید ہیں۔ ان گنت درخت کاٹے جا چکے ہیں۔ پتہ نہیں کب اس شہر سے ان پرندوں اور درختوں کا حساب لے لیا جائے۔

پاکستان کے ابتدائی برسوں میں جب میں فیروز پور روڈ پر نہر کے متصل رہتا تھا تو جب بھی کسی صبح کو نور کے تڑکے آنکھ کھل جاتی میں نہر کی طرف نکل جاتا۔ وہاں ایک شخص اپنے کتے کے ساتھ ٹہلتا نظر آتا۔ ٹہلتا کم تھا۔ ٹہلنے والوں پر زیادہ نظر رکھتا تھا۔ اس زمانے میں نہر کے کنارے کنارے پھول کھلے بہت نظر آتے تھے۔ جہاں کسی سیلانی نے پھولوں کی طرف ہاتھ بڑھایا اس نے ہانک لگائی ''پھول مت توڑو۔'' اس کے ساتھ کتا بھونکنا شروع کر دیتا۔ سیلانی گھبرا جاتا۔

اس کتے سے میرا دھیان دو اور کتوں کی طرف جا رہا ہے۔ یہ 1948ء کا ذکر ہے۔ عسکری صاحب اور میں شام پڑے مال کی طرف نکل جاتے تو ادبدا کر ایک نوجوان سے مڈھ بھیڑ ہوتی۔ تھیرا بدن' لمبا قد' کھلتا ہوا رنگ۔ اپنی بھڑکیلی شرٹ اور ٹھاٹ دار پتلون کے ساتھ بہت سمارٹ نظر آتا تھا۔ اپنے ٹامی کو لے کر نکلتا تھا۔ مستقل اسے روکتا ٹوکتا چلتا۔ ہمارے قریب آ کر عسکری صاحب کو سلام کرتا اور پھر اپنے ٹامی سے باتیں کرتا آگے نکل جاتا۔

میں نے عسکری صاحب سے پوچھا کہ یہ کون نوجوان ہے۔

کہا ''اس کا نام انور جلال ہے۔''

اگلے چند برسوں میں اس سے اس طرح تعارف ہوا کہ شاعری کرتا نظر آیا۔ پھر افسانے میں خامہ فرسائی کرتا دکھائی دیا۔ پھر اس کا ایک ناول شائع ہوا۔ اور اچھا بھلا ناول تھا۔ پھر قلم کے ساتھ اس کے ہاتھ میں موقلم نظر آیا۔ اسی کے ساتھ اس کے نام کے ساتھ شمزا کا لاحقہ لگ گیا۔ اب وہ انور جلال شمزا تھا اور ادیبوں کے ساتھ کم اور مصوروں کی صحبت میں زیادہ دکھائی دینے لگا۔ ٹی ہاؤس سے کافی

ہاؤس کی طرف۔ کافی ہاؤس سے ٹی ہاؤس کی طرف۔ تھوڑا ادب زیادہ مصوری۔ اور مصوری کے بہانے باہر نکل گیا۔ مصوری میں اس کے کام کی خوشبو پاکستان تک آئی۔

زمانے بعد ایک سہ پہر میں نے ٹی ہاؤس میں قدم رکھا تو دیکھا کہ انور جلال بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھ کر چلایا ''یار میں اتنی دیر سے یہاں بیٹھا انتظار کر رہا ہوں۔ کوئی آشنا صورت نظر نہیں آ رہی۔ ناصر تو دنیا سے چلا گیا۔ باقی یار کہاں گئے۔''

''بس جیسے تم چلے گئے ویسے دوسرے بھی جس کے جہاں سینگ سمائے نکل گیا۔''

یہ اس کا شاید پاکستان کا آخری پھیرا تھا۔ پھر تو وہ آیا نہیں۔ اس کی خبر ہی آئی۔

دوسرے کتے کو میں نے دیکھا نہیں' اس کا ذکر عبادت صاحب سے سنا۔ یہ غلام عباس کا کتا تھا جس کا نام حلقہ ارباب ذوق کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جانا چاہیے۔ عبادت صاحب بتاتے تھے کہ 1947ء میں 3 جون کے اعلان کے بعد کتنے یار جو دلی کے حلقہ میں شریک ہوا کرتے تھے پاکستان چلے گئے۔ غلام عباس ابھی موجود تھے۔ شہر میں حالات بہت خراب تھے۔ کرفیو لگا ہوا تھا۔ آ گیا اتوار۔ غلام عباس کا گھر میرے گھر سے قریب ہی تھا۔ ان کا پیغام آیا۔ میں ان کے یہاں پہنچ گیا۔ کہنے لگے کہ آج اتوار ہے۔ حلقہ کا جلسہ نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کرفیو میں کون آئے گا۔ کہنے لگے کہ ہم اپنے گھر پہ جلسہ کیے لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مگر لوگ کہاں ہیں۔ بولے کہ دیکھئے میرے پاس نیا افسانہ پڑھنے کے لیے موجود ہے۔ آپ صدر بن جائیں گے۔ میں نے کہا ''اور سامعین کہاں سے آئیں گے۔''

اس پر عباس صاحب نے تھوڑا سوچا۔ پھر اندر گئے۔ اور اپنے کتے کو پکڑ کر لائے۔ بولے ''لیجئے سامعین کا انتظام بھی ہو گیا۔ ہمارا ٹامی ہمارا افسانہ سنے گا۔'' پھر اسے پچکار کر بٹھایا۔ کہا کہ ''ٹامی تمہیں میرا افسانہ سننا ہے۔''

سو میں صدر بنا۔ غلام عباس نے افسانہ پڑھا۔ ٹامی نے یہ افسانہ سنا۔ اس طرح 1947ء کے پرآشوب دنوں میں دلی میں حلقہ کا جلسہ ہوا۔

اب ایک بالکل مختلف قسم کی صبح یاد آ رہی ہے۔ صبح ہی صبح گھر سے نکلا اور جہاز میں جا بیٹھا۔ کشور ناہید ہمسفر ہیں۔ جرنیل ضیاء الحق کے دربار میں ہماری طلبی ہے۔ کس جرم میں۔ ابھی بتاتا ہوں۔

ادب سے اس پیشی کا تعلق نہیں ہے۔ یہ فلموں کا چکر ہے۔ اس زمانے میں کشور ناہید اور میں دونوں ہی فلم سنسر بورڈ کے رکن تھے۔ اس واسطے سے مجھے بس ایک ہی شخصیت اس وقت یاد آ رہی ہے سنتوش کمار کہ وہ بھی ان دنوں اس بورڈ کے رکن تھے اور جو

گاڑی انہیں لینے جاتی تھی وہ رستے میں سے مجھے بھی بٹھا لیتی تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھا اور سنتوش کمار نے پانوں کی ڈبیا کھولی۔ کس سلیقہ اور محبت سے پان پیش کرتے تھے۔ میں نے پان ناصر کے ساتھ بہت کھائے تھے۔ وہ زمانہ گزر گیا تو پان کھانا ہی چھوڑ دیا۔ اب سنتوش کمار کی صحبت میں پھر پان کھانے شروع کر دیئے تھے۔ بلکہ بہت سی فلمیں تو ایسی ہوتی تھیں کہ اگر سنتوش کمار کی پانوں کی ڈبیا اور چھالی الائچی کے بٹوے کا سہارا نہ ہوتا تو پتہ نہیں ہمارا کیا حال ہوتا۔ کیا باغ و بہار آدمی تھے اور کیسے بانکے سجیلے۔ میں نے شروع میں انہیں اس وقت دیکھا تھا جب 1948ء کے اوائل میں مسعود پرویز کی فلم میں جس کی کہانی منٹو صاحب نے لکھی تھی ہیرو کا رول ادا کر رہے تھے اور منٹو صاحب کہتے تھے کہ یہ نوجوان پاکستان کا دلیپ کمار بنے گا۔ یا اب دیکھ رہا تھا جب وہ اداکاری کے کاروبار سے فارغ ہو چکے تھے۔ مگر اسی طرح سرخ و سفید۔ وہی سفید براق کرتا پائجامہ۔ قریب سے اب دیکھا۔ احساس ہوا کہ بہت باغ و بہار شخصیت ہیں۔ فلم کے بارے میں وہ کہہ دیتے کہ ہاں تو پھر میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتا۔ جب ہی تو فلم کے پاس فیل کے سلسلہ میں سفارش میرے پاس کم کم پہنچتی تھی۔ انہیں پتہ تھا کہ جو دو پنچوں سنتوش کمار اور کشور ناہید کی رائے ہوگی وہی اس شخص کی بھی رائے ہوگی۔ بس اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اصل رائے کے اظہار کی وہاں گنجائش کہاں تھی۔ اس حساب سے تو مشکل ہی سے کوئی فلم اس لائق نکلتی کہ اسے پاس کیا جا سکے۔

مگر جس حوالے سے اس بورڈ کی منظوریوں کے خلاف شور مچا وہ تھا عریانی کا مسئلہ۔ شور مچا کہ فلموں میں عریانی بہت بڑھ گئی ہے اور بورڈ ہے کہ ان فلموں کو پاس کئے چلا جا رہا ہے اور ایسے زمانے میں جب جرنیل صاحب اسلامی اخلاق پر زور دے رہے ہیں۔ سو ایک دن جرنیل صاحب نے پورے بورڈ کو طلب کیا۔

عریانی کے باب میں میرا معاملہ یہ تھا کہ ادب کے حوالے سے جو میرا نقطہ نظر بنا تھا اس سے الگ تو میں یہاں موقف اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے تو اعتراض ہی اور تھا کہ پاکستانی فلمساز ابتذال پر اتر آتا ہے۔ وہ جو جسم کو دکھانے کے لیے ایک جمالیاتی شعور اور نزاکت احساس کی ضرورت ہے اس سے محروم ہے۔ ایک فلم میں مجھے ایک ایسا منظر نظر آیا تھا جو کسی حد تک اس شرط کو پورا کرتا تو اس کے حق میں البتہ میں نے شد و مد سے اپنی رائے پیش کی تھی۔ اور وہی رائے میرے لیے اب مصیبت بننے کو تھی۔ وہ منظر یہ تھا کہ ہیروئن جو روحی بانو تھی ایک سفید باریک ململ کی ساڑھی پہنے ہوئے ہے اور نہا رہی ہے۔ اب روحی بانو دوسری فلمی اداکاراؤں کی قسم کی تو اداکارہ نہیں تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک تہذیب ہوتی تھی۔ میں نے اس فلم کی کہانی کے سیاق و سباق میں اس منظر کو بامعنی جانا اور اس کی وکالت کی۔ سنتوش کمار اور کشور نے بھی تائید کر دی اور لیجئے فلم اس منظر کے ساتھ پاس ہو گئی۔

تو اب سنئے کہ جب ہمارا جہاز جہلم کے نزدیک پہنچا تو اعلان ہوا کہ اسلام آباد کا موسم خراب ہے۔ ہم واپس لاہور چلتے ہیں۔ لیجئے ہم جاتے جاتے واپس آ گئے۔ ائیر پورٹ دو گھنٹہ انتظار کیا۔ پھر جہاز چلا لیکن ابھی رن وے ہی پر تھا کہ اعلان ہوا کہ موسم اچھا ہو کر پھر خراب ہو گیا۔ مسافر لاؤنج میں جائیں اور مزید انتظار کریں۔

میں نے کشور سے کہا کہ یہ اچھا شگن نہیں ہے۔ قدرت کو یہ منظور نہیں کہ ہم جرنیل صاحب کے حضور پیش ہوں۔ اب ہم تیسری بار بھی جہاز میں بیٹھے اور وہاں جانے پر مصر ہوئے تو قدرت ہم سے خفا بھی ہو سکتی ہے۔ تو آؤ واپس گھر چلتے ہیں۔ سو ہم گھر چلے آئے۔

دوسرے دن وہاں پیشی بھگتنے والوں نے بتایا کہ اچھا ہی ہوا تم نہیں پہنچے۔ وہاں روحی بانو والا ٹوٹا بطور خاص دکھایا گیا تھا۔ جرنیل صاحب نے پوچھا ''اس سین کی منظوری کس نے دی تھی۔''

بورڈ کے افسروں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا ''بورڈ میں دو ادیب ہیں۔ انہوں نے اسے پاس کرنے پر زور دیا تھا۔''

''وہ کون ادیب تھے۔'' جرنیل صاحب نے غصے سے پوچھا۔

''کشور ناہید اور انتظار حسین۔''

''کہاں ہیں وہ۔''

''موسم کی خرابی کی وجہ سے جہاز لیٹ ہو گیا اس لیے وہ یہاں نہیں پہنچ سکے۔''

فلم سنسر بورڈ کی ایک سے زیادہ باریاں میں نے بھگتائیں۔ مگر اب دھیان کرتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مسلسل ایک ہی فلم دیکھتا رہا ہوں۔ ایک اردو کی فلم ایک پنجابی کی فلم۔ وہی ایک کہانی' وہی یکساں کردار' یکساں سچوایشنز اور اداکار بھی ہر پھر کر وہی۔ اردو فلم میں یہ لازم ٹھہرا تھا کہ ہیروئن کسی نہ کسی مرحلہ میں کوٹھے پہ ضرور پہنچے گی اور بحالت مجبوری پیروں میں گھنگھرو باندھ کر ناچے گی بھی۔ اور پنجابی فلموں میں ہیرو کے لیے لازم تھا کہ آٹھ دس دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ ان فلموں کو دیکھ دیکھ کر جی اتنا بھر گیا کہ اب کسی پاکستانی فلم کو دیکھنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔

جرنیل صاحب کے دور کی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ مگر بے نظیر بھٹو کے پہلے دور کی تو ایک بات کے سوا کوئی بات یاد ہی نہیں آ رہی۔ بس اس دور کے شروع ہوتے ہی ہمارے ادیبوں دانشوروں کی دنیا میں مزاحمتی ادب کا غلغلہ بلند ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ میرے سوا باقی سارے ہی لکھنے والے مزاحمتی ادب رقم کرتے رہے تھے۔ اور اب اس کا اجر ملنے کا وقت آ گیا تھا۔ سو جسے دیکھو اپنے رقم کردہ مزاحمتی ادب کو بغل میں دابے اسلام آباد کی طرف رواں دواں ہے۔ اور قسمت والوں کو اجر ملا بھی۔ بس یوں سمجھئے کہ جرنیل صاحب کا

دور محب وطن ادیبوں کا دور تھا۔ اب مزاحمتی ادیبوں کا زمانہ شروع تھا۔ مگر ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ ختم بھی ہو گیا

''جھونکا ہوا کا تھا ادھر آیا ادھر گیا''

پھر محب وطن ادیبوں کی چہل پہل شروع ہو گئی۔

خیر یہ زمانہ بھی مختصر رہا۔ جلد اس کی بساط لپٹ گئی۔ پھر پی پی کی حکومت آ گئی اور پھر مزاحمتی ادب کے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ پچھلا تجربہ سامنے تھا۔ سو اب کے وقت ضائع نہیں کیا گیا۔ فوراً ہی کام شروع ہو گیا۔

مجھے اس وقت کے ٹی وی سٹیشن پر برپا ہونے والا ایک جلسہ یاد آ رہا ہے۔ شہر کے سارے ادیبوں دانشوروں کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ اسلام آباد سے اسلم اظہر آئے بیٹھے تھے اور مشورہ طلب کر رہے تھے کہ ٹی وی کے پروگراموں میں نئے تقاضوں کے تحت کیا تبدیلیاں لائی جائیں۔ بس انقلابی دانشور شروع ہو گئے۔ ایک تقریر۔ دوسری تقریر۔ تیسری تقریر۔ سب تقریروں کا مضمون ایک ہی تھا کہ غیر انقلابی دانشوروں نے بہت گلچھرے اڑا لیے۔ اب ٹی وی پر ان کا داخلہ بند ہونا چاہیے۔ سارے پروگرام فوراً انقلابی سانچے میں ڈھل جانے چاہئیں۔ ویسے تو اس جلسہ میں اشفاق احمد بھی موجود تھے۔ مگر آج وہ کہیں پچھلی صف میں بیٹھے تھے اور گونگے کا گڑ کھا کر یہاں آئے تھے۔

''بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے''

ہاں اس کے بعد وہ ایسے کسی اجتماع میں نہیں دیکھے گئے۔ حقیقت پسندانہ بات یہاں شاید محمود ندیم نے کہی۔ کہا کہ آپ سمجھ رہے ہیں کہ انقلاب آ گیا ہے۔ انقلاب نہیں آیا ہے۔ بس استحصال کی فصیل میں ایک دراڑ پڑی ہے۔ مگر یار پھر بھی اپنی اسی رو میں بولتے رہے۔ انقلاب اکیڈمی آف لیٹرز میں بھی آ چکا تھا۔ پی پی کے پہلے اور دوسرے دور میں تو احمد فراز یہاں چیئرمین بنے ہوئے تھے۔ احمد فراز شاعر' مولا دولا قسم کے آدمی۔ کسی کام کے سلسلہ میں تردد کے قائل نہیں۔ مگر اب فخر زمان چیئرمین بن کر آئے تھے۔ فوراً ہی متحرک ہو گئے۔ لاہور وارد ہوئے اور فوراً ادیبوں دانشوروں کو ایک بڑے ہوٹل میں اکٹھا کیا۔ اپنے انقلابی منصوبے بتائے۔ ہم خیالوں سے مشورے مانگے۔ اور پھر اسی نہج پر تقریریں شروع ہو گئیں کہ جیسے سچ مچ انقلاب آ گیا ہے۔

اسی دوران کشور ناہید نے جلسہ میں قدم رکھا۔ وہ اسلام آباد سے آ رہی تھیں۔ باری باری لاہور کے دوستوں کے پاس جاتی تھیں اور کانا پھوسی کرتی تھیں کہ کم بختو تم یہاں کیا لینے آئے ہو۔

جب وہ سب دوستوں کو کچوکے دے کر اطمینان سے ایک گوشے میں جا بیٹھیں تو ایک کمبخت نے دوسرے کمبخت سے سرگوشی میں

کہا کہ ہم تو سچ مچ کمبخت ہیں کہ لینے میں نہ دینے میں مگر یہاں پہ آئے بیٹھے ہیں۔ مگر یہ کمبخت خود کیوں آئی ہے۔

دوسرا کمبخت بولا "تمہیں پتہ نہیں۔ اسے اب پاکستان نیشنل آف آرٹس کا انتظام سنبھالنا ہے۔"

تقریریں ہو رہی تھیں اور لمبے چوڑے انقلابی منصوبے پیش کیے جا رہے تھے۔ تب افضل رندھاوا نے جھرجھری لی۔ اور کہا کہ یہ سب منصوبے برحق۔ مگر ایک بات میں کہتا ہوں۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ جو کرنا ہے جلدی کر لو۔

مگر یاروں نے یہ بات ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑا دی۔ فوراً ہی ایک طویل المیعاد منصوبہ پیش ہوا۔ کہا گیا کہ پاکستان کی تاریخیں اب تک جو لکھی گئی ہیں سب غلط ہیں۔ پاکستان کی تاریخ از سر نو لکھی جانی چاہیے۔ سو فوراً ایک بورڈ تشکیل دیا گیا۔ بتایا گیا کہ پہلے یہ دانشور تحقیق کر کے مواد اکٹھا کریں گے۔ پھر مختلف جلدوں میں یہ تاریخ ایک انقلابی نقطہ نظر سے رقم کی جائے گی۔

"سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں"

بس اس کے فوراً بعد اکیڈیمی کے ملک گیر ادبی اجتماع کا غلغلہ بلند ہوا۔ ضیاء الحق کے زمانے کے ادیبوں کا میلہ کانوں سنا تھا۔ یہ میلہ اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا۔ پی پی کے جیالے موج در موج امڈے ہوئے تھے۔ انہیں میں رلے ملے سینکڑوں گمنام اور نامور ادیب بھی تھے۔

ویسے تو اس میلہ کا ایک بین الاقوامی اڈیشن بھی تھوڑے عرصے کے بعد آیا تھا۔ مگر میں نے ایک ہی میلہ پر قناعت کی۔

تابڑ توڑ نشستیں ہوئیں۔ ہر نشست میں مقالے اور تقریریں۔ مگر مجھے تو ایک ہی تقریر یاد رہ گئی ہے۔ ہاں اس سے پہلے بھی ایک تقریر ہوئی تھی۔ بات یہ تھی کہ سندھ سے یہاں سندھی ادیب بھی آئے بیٹھے تھے اور مہاجر ادیب بھی۔ سندھی ادیب اپنی باری لے چکے تھے۔ اب مہاجر ادیب اپنی باری لینے کے لیے آستینیں چڑھا رہے تھے۔ منتظمین نے ایک عقلمندی کی کہ بیچ میں کرار صاحب کو کھڑا کر دیا۔ انہوں نے ایسی تقریر کی کہ دونوں طرف جو آگ لگی ہوئی تھی وہ ٹھنڈی ہو گئی۔

اور اب ڈاکٹر مہدی حسن کو سنو۔ حسب دستور بہت جوش میں بول رہے تھے۔ تقریر کرتے کرتے حضرت علی کا ایک قول نقل کیا کہ لوگو! ڈرو اس شخص سے جس کے دونوں ہاتھ خالی ہوں۔ اور مہدی حسن نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے "لوگو دیکھ لو۔ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔"

مگر جیالے ذرا جو ڈرے ہوں۔ ہاں یہ سبق لیا کہ انقلاب برحق مگر آدمی کے دونوں ہاتھ خالی نہیں رہنے چاہئیں۔

یہ دور بھی ہوا کا جھونکا نکلا کہ ادھر آیا ادھر گیا۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے

اور اب کے تو ایسے گئے کہ ساتھ میں وہ جوان کا ایک رعب داب تھا وہ بھی چلا گیا۔ دونوں ہاتھ کسی کے خالی ہوتے تو اغیار ڈرتے۔ اب وہاں ڈرنے کے لیے کیا رہ گیا تھا۔

◆◆◆

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

کتنے برسوں بعد کل رات میں پھر اسی ٹولنٹن والے نکڑ پر کھڑا تھا۔ رات کے سفر کی واپسی میں ہمارا آخری پڑاؤ۔ یہاں آ کر ہذا فراق بینی و بینکم کا مضمون شروع ہوتا مگر اس وقت میں اکیلا ہوں۔ سواری کی تلاش ہے۔ اردگرد دیکھتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں۔ دن کے بھیڑ بھڑ کے میں ادھر سے گزرتے ہوئے کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ یہ رستہ اب کس حال میں ہے۔ اب جو ذرا رات بھیگنے لگی ہے اور بھیڑ بھڑ کا کم ہوا ہے تو خالی رستہ بول رہا ہے۔ ٹولنٹن مارکیٹ کا ان گنت دروں والا لمبا پتلا برآمدہ کیا تھا' اب کیا ہے۔ اور برآمدے کے آخری در میں جو ایک بوڑھا پنواڑی ایک دھیمی لو والے چراغ کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا' وہ کدھر گیا اور وہ ڈھائی تین تانگے جوان گھڑیوں میں یہاں ستایا کرتے تھے اور ساتھ میں سواری کا انتظار بھی کرتے رہتے' وہ کیسے غائب ہو گئے۔ رکشائیں تو یہاں ان دنوں نظر نہیں آتی تھیں اور ہاں وہ جو سامنے والے نکڑ پر گلے میں مفلر لپیٹے چھڑی کے سہارے کھڑے مولانا حالی نظر آیا کرتے تھے مگر خیر وہ تو صرف ناصر کو نظر آتے تھے۔

رات کی ان خاموش' مطلب یہ کہ نسبتاً خاموش گھڑیوں میں (ورنہ خاموشی تو جیسے اس نگر سے رخصت ہو چکی ہے) یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا پورا رستہ جیسے مجھ سے کچھ پوچھ رہا ہے' اسے پوچھنا بھی چاہیے کہ کتنوں برسوں سے اس نے ان قدموں کی آہٹ نہیں سنی جن سے وہ اپنی سناہٹی راتوں کے بیچ رفتہ رفتہ کتنا مانوس ہو گیا تھا مگر مجھے بھی تو اس سے پوچھنا چاہیے کہ اس نے اپنے نشانات کو کہاں گم کر دیا۔ فٹ پاتھ پر جہاں تہاں چراغ کی مدھم روشنی میں بیٹھے ہوئے پان سگریٹ والے کس کھوہ میں جا چھپے اور وہ جو اس کے دائیں بائیں منور چائے خانے تھے' وہ کدھر گئے۔ کافی ہاؤس' چینیز' ڈین' گرڈینیا' بلیو رستوران' سٹینڈرڈ' شیراز' کیفے اورینٹ' سٹفلز' لارڈز' میٹرو سب ہی حرف مکرر کی مثال مٹ گئے تھے جیسے ایک پوری تہذیب تھی کہ غروب ہو گئی۔

چیخوف نے اپنے بھائی کو خط لکھتے ہوئے اس کی ادبی کاوشوں پر بہت سی باتیں کیں۔ آخر میں لکھا کہ ''میں تمہیں یہ باتیں کچھ اس وجہ سے بھی لکھ رہا ہوں کہ تمہیں یہ احساس نہ ہو کہ تم اکیلے ہو۔ تخلیقی سرگرمی میں تنہائی بہت دکھ دیتی ہے۔''

ٹھیک کہا مگر ایک بات گوتم بدھ نے بھی کہہ رکھی ہے اگر اپنے سے بہتر یا کم از کم اپنے برابر کا سنگھی نہ ملے تو پھر یاتری کو چاہیے کہ ہمت سے قدم اٹھائے اور اکیلا یاترا کرے کہ مورکھ کے ساتھ تو سنگت ہو نہیں سکتی۔''

خیر میں نے تو اچھی سنگت ہی میں یاترا شروع کی تھی۔ لاہور آ کر بھی یہ ہوا کہ جب میں نے یہاں آ کر ڈیرا کیا تو سنگھی ساتھی ملتے ہی چلے گئے۔ میں اپنے شروع کے دنوں کو دھیان میں لاتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں یہ سوچ کر کہ اس شہر کی تپتی دوپہریں اور سناٹی راتیں ان دنوں تخلیق کے درد سے کتنی دھڑکتی نظر آتی تھیں۔ سنگھی ان دنوں کتنے تھے۔ ہر ایک کی دیوانگی کا اپنا طور تھا۔ شب زندہ دار ناصر کاظمی' گم سم شاکر علی' علم کے بوجھ سے بھاری مظفر علی سید' فلسفہ اگلتے شیخ صلاح الدین' انگلی سے ہوا میں عورت کا پیکر تراشنے میں منہمک حنیف رامے ایڈرا پاؤنڈ کے وظیفہ میں غرق سعید محمود ٹی ہاؤس کے ساتھ چپکے ہوئے شہرت بخاری اور احمد مشتاق۔ اس وقت یہی لگتا تھا کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔ یہ اپنی وضع کے پکے اور اپنی دیوانگی میں سچے نہ اپنے تکیے سے اٹھیں گے' نہ اپنی دیوانگی چھوڑیں گے۔

مگر زمانے کو قرار کہاں۔ ہر صحبت آخر کے تئیں صحبت چند روزہ ثابت ہوتی ہے۔ چار گھڑی یاروں کا میلہ' پھر خاموشی۔ یاروں کی منڈلی بکھرتی چلی گئی۔ ارد گرد قریب و دور نظر دوڑاتا ہوں' مشکل سے کوئی نظر آتا ہے۔

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

خیر ساتھ کے جو بیمار جان سے گزر گئے' ان کا جانا تو قضا کی طرف سے ٹھہر گیا تھا۔ باقیوں کو کیا ہوا' کوئی گوشہ نشین ہوا' کسی کو زمانے کی ہوا اڑا کر پردیس لے گئی۔ کسی کو سیاست کا بھیڑیا منہ میں دبا کر لے گیا۔ کوئی لقمہ ملازمت بن گیا۔ بیماروں نے کس کس راستے آزار سے چھٹکارا حاصل کیا۔

کتنی دفعہ گمان ہوا کہ میں اپنے آزار کے ساتھ اکیلا رہ گیا ہوں۔ مورکھوں کے ساتھ سنگت ہو نہیں سکتی تھی۔ خیر جوئندہ یابندہ' کچھ نئے بیمار نظر آئے۔ سوچا کہ انہیں سے رشتہ استوار کروں مگر کوئی بیمار' دوسرے بیمار کا بدل نہیں ہو سکتا۔ پھر یوں بھی ہے کہ آدمی کو اپنی پہلی محبت بہت عزیز ہوتی ہے۔ بعد میں دل پر جتنے بھی وار ہوں' گمان یہی رہتا ہے کہ وہ جو ہم نے شروع میں عشق کی چوٹ کھائی تھی' اسی نے ہمیں بنایا بگاڑا ہے تو مجھے بھی یہی گمان رہتا ہے کہ میں نے بہت خوشبو دیوانگی کی انہیں جاگتی راتوں اور تپتی دوپہروں سے اڑائی ہے جو بیت چکی ہیں اور ان دیوانوں سے جو ان راتوں اور دوپہروں کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور احساس ہے کہ شاید پاکستان کی بہترین راتیں اور بہترین دوپہریں وہی تھیں۔ پاکستان کی راتوں اور دوپہروں' صبحوں اور شاموں کا سنہری زمانہ کہہ لیجیے یعنی پاکستان کا سنہری زمانہ۔ کتنی جلدی یہ زمانہ گزر گیا۔ پھر ہماری راتیں پریشان اور دوپہریں اذیت ناک ہوتی

چلی گئیں اور صبحوں اور شاموں کا رنگ پھیکا پڑتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی شاید دیوانگی کا دور بھی ختم ہو گیا کہ ایک ایک کر کے سب ہی غائب ہو گئے۔ جانے کس کھوہ میں جا چھپے۔ اب میں انہیں کہاں ڈھونڈوں۔ ان کے سارے ٹھکانے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ حیران ہوں کہ وہ سب چائے خانے وہ شادآباد ریستوران ایسے مٹے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ جیسے ایک تہذیب تھی کہ مٹ گئی چائے خانوں کا بند ہو جانا' تہذیبی اعتبار سے تو یہ کوئی اچھا شگن نہیں ہے۔ ہاں یاد آیا کہ مال روڈ کا ایک پوش ریستوران اب سے تھوڑے برسوں پہلے تک چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے والوں کی ایک ٹولی کا ٹھکانا بنا ہوا تھا۔ حبیب جالب' اکادکا صحافی' کوئی دانشور' کوئی نمبر 2 سیاستدان' بس بیٹھے ہیں' چائے پی رہے ہیں اور بحث کر رہے ہیں۔ ریستوران کے مالک و منیجر نے جب یہ دیکھا کہ یہ ٹولی نہ لنچ کا آرڈر دیتی ہے' نہ ڈنر کا تکلف کرتی ہے۔ خالی چائے اور لمبی نشست۔ اس نے ریستوران میں نیا دستور نافذ کیا کہ خالی چائے سرو نہیں ہو گی۔ صرف لنچ اور ڈنر کا آرڈر والوں کو سرو کیا جائے گا۔ لیجئے مال پر جو یاروں کا آخری ٹھکانہ تھا' وہ بھی گیا۔ غالب نے یہ بلاوجہ نہیں کہا تھا کہ

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

بے شک جیسا کہ ہمارے مصلحین کہہ گئے ہیں قوموں کی ترقی کا راز ذوق عمل میں پوشیدہ ہے لیکن ذوق عمل اس انتہا تک تو نہیں جانا چاہیے کہ فرصت کے رات دن بالکل ہی غائب ہو جائیں۔ علامہ اقبال برحق مگر ایک بڑی سچائی غالب کے بیان میں بھی پوشیدہ ہے۔ جوش عمل سے سرشار قوم کے بیچ ایسے ٹھالی ٹھسکے لوگ بھی تو ہونے چاہئیں کہ بس بیٹھے ہیں اور تصور جاناں میں غرق ہیں یا لیٹے ہوئے ستارے گن رہے ہیں اور کمر بند میں گرہیں لگاتے چلے جا رہے ہیں یا چائے خانے میں بیٹھے چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا رہے ہیں اور بحث کر رہے ہیں' فلسفہ بگھار رہے ہیں یا پت جھڑ دیکھ رہے ہیں اور اداس بیٹھے ہیں۔ ایسے ہی لوگ تو تہذیب کے ضامن ہوتے ہیں۔ کسی معاشرے سے ایسے افراد کا غائب ہو جانا اور ان کے ٹھکانوں کا غارت ہو جانا اس معاشرے کے لیے کچھ اچھا شگون نہیں ہے۔ جب چائے خانے غائب ہو جائیں اور فاسٹ فوڈ ریستوران تیزی سے کھلتے چلے جائیں اور امنڈتا ہوا نیا ٹریفک گھاس اور پھولوں کے تختوں کو روند ڈالے اور درختوں کو نگلتا چلا جائے تو جان لیجئے کہ وہ روایتی شہر جس کی اپنی ایک تہذیب اپنی ایک بو باس ہوتی ہے' وہ رخصت ہوا اور اب ایک نئے شہر کی نمود اور ایک نئے کمرشل کلچر کی آمد آمد ہے۔

دربیان مشروبات و ماکولات

بارے شہر لاہور کی بو باس کا تھوڑا سا بیان ہو جائے۔ اس حوالے سے کہ اس روایتی شہر کے اپنے کھانے' اپنے ذائقے کیا تھے اور کس طرح بدلتے چلے گئے۔ اس کا احساس تو سب سے پہلے اپنے گھر ہی کے دسترخوان سے ہوا۔ میں بتا رہا تھا کہ میرے یہاں آنے کے بعد خاندان کے جو دو نگ یہاں پہنچے' وہ میرے دو بھانجے تھے۔ انصار اور منوں (حسن ظہیر) منوں ابھی تعلیم کے مراحل طے کر رہا تھا۔ انصار نے زندگی کا باقاعدہ آغاز کر دیا تھا۔ شادی ہو چکی تھی۔ جو دلہن بیاہ کر لایا' وہ پنجاب کی مٹی تھی اور بٹالہ کی بیٹی۔ یہ ہمارے خاندان میں پنجاب کا پہلا نفوذ تھا' پھر تو یہ نفوذ بڑھتا ہی چلا گیا۔

ایک روز کھانے کی میز پر شلجم گوشت کی ڈش دیکھ کر جی خوش ہوا مگر لقمہ منہ میں گیا تو جیسے گڑ منہ میں گھل گیا۔

''عائشہ یہ تم نے کیا پکایا ہے؟''

''ماموں! یہ گھونگھلو گوشت ہے۔''

''گھونگھلو گوشت تو ہے مگر میٹھا کیوں ہے؟''

''اے لو میٹھے کے بغیر بھی کہیں گھونگھلو گوشت پکتا ہے۔''

پھر کچھ شادیوں میں آنا جانا ہوا۔ شادی کا جو کھانا بھی کھایا' اس میں باقی کھانوں کے ساتھ پالک گوشت کی ڈش مقرر نظر آئی جیسے یہ شادی کے دسترخوان کا لازمی جزو ہے۔ اس ایک ڈش نے پنجاب کے ولیمہ کو یوپی والوں کے ولیمہ سے کتنا الگ ذائقہ دے دیا تھا۔

گرمیوں کے موسم میں ان دنوں دوپہر کو جس ریستوران میں بھی قدم رکھتے بیرا کھانے کا آرڈر بعد میں لیتا' پہلے نمکین لسی کا بھرا جگ لا کر میز پر رکھ دیتا۔

صبح کے ناشتے میں لاہور کے چٹورے حلوے پوری کی طرف لپکتے تھے یا سری پائے سیر ہو کر کھاتے تھے۔ ایک روز مظفر نے ذکر کیا کہ دلی کا ایک نہاری والا یہاں آیا ہے۔ لوہاری کے اندر ایک گلی میں اس نے اپنی دکان جمائی ہے۔ پھر فوراً ہی پروگرام طے کیا کہ کل صبح چل کر دیکھتے ہیں کہ کیسی نہاری بناتا ہے۔ لیجئے اگلی صبح منہ اندھیرے کہ ابھی چڑیوں نے چہکنا شروع کیا تھا ہم جاڑے میں کپکپاتے مارا مار کرتے گلی گلی جھانکتے لوہاری کی اس گلی میں پہنچے۔ نہاری کی دیگ دم میں آ چکی تھی۔ تندور پر نان لگ رہے تھے۔ اکا دکا گاہک بیٹھا تھا۔ ہم بھی جا شامل ہوئے۔ نہاری واہ واہ' نان سبحان اللہ۔ نان تو خیر لاہور والوں کی بھی غذا میں شامل ہے مگر دلی کے نان کا ذائقہ الگ ہوتا ہے۔ مظفر دلی کی زبان کے چٹخارے کا پہلے ہی قائل تھا' اب دلی کی نہاری کے ذائقہ کا بھی قائل ہو گیا۔ اس نے جانا کہ دلی کا یہ نہاری والا بھی میرا من دلی والے کا بھائی بند ہے۔ بس پھر ایک طور پر بندھ گیا کہ جاڑوں کے موسم میں تھوڑے تھوڑے

وقفہ کے بعد صبح سویرے منہ اندھیرے سوں سوں کی آوازیں نکالتے سٹ پٹ کرتے اس گلی میں پہنچتے اور سیر ہو کر نہاری کھاتے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا' دلی والے کے گاہکوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ ہمیں وہاں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا۔

پاکستان کے وہ ابتدائی برس آئے گئے ہو گئے۔ اس زمانے کی بہت سی باتوں کے ساتھ یہ نہاری بھی میرے لیے بھول بسری چیز بن گئی۔ اچانک ایک دن نعیم طاہر کی طرف سے دعوت ملی کہ صبح ہمارے گھر آؤ۔ نہاری کا پروگرام ہے۔ میں وہاں پہنچا اور نعیم طاہر بتا رہے تھے کہ وہاں بہت لمبی قطار لگتی ہے۔ ہم رات ہی کو اپنا برتن قطار میں لگوا دیتے ہیں۔ صبح اذان کے وقت آدمی جاتا ہے اور نہاری لے کر آتا ہے۔ کیسی ہے۔ بہت لذیذ ہے۔ بے شک لذیذ تھی۔ وہی نہاری وہی نان لیکن اس وقت سے اب تک دلی والے کے گاہک بے تحاشا بڑھ گئے تھے اور پھر لوہاری کی اس گلی سے ایبٹ روڈ پر سید امتیاز علی تاج کی کوٹھی میں آتے آتے اور ڈائننگ ٹیبل پر سجتے سجتے ذائقہ میں تھوڑا فرق تو پڑنا ہی تھا۔ آئندہ چل کر اور فرق پڑنا تھا کہ شہر میں اب دلی کی نہاری قبول عام کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ کھاتے پیتے لوگ ملازم کو منہ اندھیرے وہاں بھیج کر نہاری منگواتے' دوستوں کو ناشتے پر مدعو کرتے' دوست نہاری کھاتے اور ہونٹ چاٹتے۔

نہاری کا قبول عام یہ رنگ لایا کہ پھر لوہاری کی اس گلی کی قید نہیں رہی' نہ دلی کے نہاری والے کی شرط رہی۔ کھانے پینے کے جس بازار میں بھی جاؤ' منجملہ اور غذاؤں کے ایک دکان نہاری کی بھی نظر آنے لگی۔ پھر یہ ذائقہ پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی پہنچا اور مقبول ہوا۔ حق یہ ہے کہ پاکستان میں دلی کی دو ہی چیزیں چلیں یا دلی کی نہاری چلی یا جمیل الدین عالی چلے مگر نہاری تو مقبولیت کے اس نشہ میں اپنے ادب آداب ہی بھول گئی۔ نہار منہ سے اس کا جو لازمی رشتہ چلا آتا تھا' وہ غتر بوت ہو گیا۔ اب چٹوروں کے دستر خوان پر دوپہر جاؤ تو نہاری' رات جاؤ تو نہاری اور جب گلی گلی نہاری بک رہی ہو تو اس کا اپنا ذائقہ کہاں سلامت رہے گا مگر شعر و ادب ہو یا نہاری' مقبولیت کے بعد تو یہی کچھ ہوتا ہے۔

تو تقسیم کے بعد لاہور شہر کے ذائقوں میں ایک انقلاب یہ آیا۔ خیر یہ کونسا ایسا انقلاب تھا۔ روایتی شہر کے ذائقوں کے بیچ ایک اور بڑے روایتی شہر سے آئے ہوئے ذائقے نے اپنی جگہ بنائی اور اس طرح بنائی کہ چٹورے اپنے سری پائے کو بھول گئے۔ ذائقوں میں انقلاب تو اب آیا ہے اور انقلاب سا انقلاب۔ نمکین لسی کا جگ ریستورانوں کی کھانے کی میزوں سے دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا۔ اب اس کی جگہ ٹیم اور سیون اپ کی بوتلیں نظر آتی ہیں۔ ان بوتلوں کی تہذیب کا آغاز کوکا کولا سے ہوا تھا۔ کوکا کولا چھٹی دہائی کے آغاز کے

ساتھ اس شہر میں داخل ہوا اور پورے شہر کو اپنی رو میں بہا کر لے گیا۔ یہاں تک کہ ستوؤں والوں نے اپنے ستوؤں کو ستو کولا کہہ کر اور شکر کا شربت بیچنے والوں نے اپنے شربت کو شکر کولا کہہ کر بیچنا شروع کر دیا۔ ایک نکڑ پر تخم بالنگے کا شربت بکا کرتا تھا۔ کولائی انقلاب کے بعد اس نے بھی ایک گتے پر تخم بالنگا کولا لکھ کر اپنے ریڑھے پر سجا لیا۔ انہیں دنوں پاکستان میں مصر کے جمال عبدالناصر کا دورہ ہوا۔ اس شہر میں بھی ان کا ورود ہوا۔ انجمن حمایت الاسلام کی تقریب میں پہنچے تو تواضع کرنے والوں نے فوراً کوکا کولا کی بوتل پیش کی۔ جمال ناصر نے کوکا کولا کی بوتل کو دیکھا۔ پھر پرے سرکا کر کہا کہ اپنے ملک کا کوئی مشروب پلایئے۔

مگر ملک کے مشروب تو لسی سمیت سب ہی پس منظر میں چلے گئے تھے۔ جو بک رہے تھے ان کے ساتھ بھی بیچنے والوں نے کولا کا لاحقہ لگا لیا تھا۔ صرف خالی پانی کی سبیل اس لاحقہ سے بچی رہ گئی تھی۔ آگے مال پر جہاں لارڈز تھا اور جہاں ہم وقت بے وقت براجا کرتے تھے اس کے آس پاس ایک چارپائی پر ایک اپاہج بوڑھا لیٹا نظر آتا۔ جب مئی کا مہینہ آتا تو یہ چارپائی سڑک کر فٹ پاتھ کے متصل آ جاتی اور فٹ پاتھ پر اس چارپائی کے آگے کورے مٹکوں کی ایک قطار نظر آتی۔ ٹھنڈے پانی سے بھرے مٹکے۔ آتے جاتوں کو یہ بوڑھا خود پانی پلاتا

''پانی پیو یہ نعمت رب جلیل ہے''

مگر شہر میں کوکا کولا کے سٹال پھیلتے جا رہے تھے۔ اس رو میں لسی ستو کولا' شکر کولا' تخم بالنگا کولا سب ہی بہہ گئے۔ ساتھ میں سبیل بھی بہہ گئی۔ بوڑھا مر گیا۔ اس کے ساتھ یہ سبیل بھی گئی۔ شہر کی باقی سبیلیں بھی گئیں اور یہ مصرعہ بھی گیا

''پانی پیو یہ نعمت رب جلیل ہے۔''

سبیل تو روایتی شہر کی نشانی تھی۔ نئے کمرشلائزڈ شہر میں سبیل یعنی پانی مفت' پیاسوں کو پانی پلاؤ اور ثواب کماؤ' پیسہ نہیں ثواب۔ یہ تو انمل بے جوڑ چیز تھی۔ سو سبیل کا باب اب بند ہونا ہی تھا۔

سبیل ختم۔ اب کوکا کولا کے سٹال شہر میں پھیلتے جا رہے تھے۔ کوکا کولا تیزی سے آیا' تیزی سے نئے سے پرانا ہوا۔ جب نیا پرانا ہو گیا تو اس کی برادری سے نئے نئے مشروبوں کی نمود ہوئی۔ ہر مشروب نے چندے خوب چمک دکھائی۔ چمک اک ذرا ماند ہوئی تو دوسرا مشروب آن موجود ہوا۔ سیون اپ' ٹیم' پیپسی' ان سب کو کوکا کولا ہی کی آل اولاد سمجھو۔

پہلے نئے مشروب آئے۔ پھر نئی نئی غذائی اشیاء آئیں۔ برگر آیا' پیزا آیا' زبان کا ذائقہ پینے اور کھانے دونوں ہی معاملوں میں ایک انقلاب سے دوچار تھا۔ اس پر مجھے ابن انشاء یاد آ گیا۔ پہلے تو میں نے اسے ترقی پسند شاعر کے طور پر جانا تھا۔ سو میرے حسابوں

جیسے اور ترقی پسند شاعر ویسے ابن انشاء بھی ایک ترقی پسند شاعر اور آدمی بھی جیسے اور ترقی پسند ویسے وہ۔ یہ تو رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہ شاعر بھی تھوڑی اور طرح کا ہے اور آدمی بھی تھوڑی اور طرح کا۔ ویسے ہماری افہام و تفہیم شعر و ادب کے دائرے سے نکل کر ہوئی۔ رنگا رنگ' خوانچوں کے بیچ ہم نے ایک دوسرے کو جانا۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں اور دھیان میں لاتا ہوں کہ آغاز کس خوانچے سے ہوا تھا۔ شاید گول گپے کے خوانچے سے۔ شاید یوں ہوا تھا کہ میں ان ذائقوں کو یاد کر رہا تھا جن سے میں ہجرت کے طفیل محروم ہوا۔ ابن انشاء سنتا رہا' پھر بولا ''تم نے لاہور میں کبھی گول گپے کھائے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے پانی کے بتاشے''

''ہاں ہم انہیں گول گپے کہتے ہیں۔ تو میرٹھ ہاپوڑ میں تم نے پانی کے بتاشے بہت کھائے۔ چلو میرے ساتھ میں تمہیں یہاں کے گول گپے کھلاتا ہوں۔''

ٹی ہاؤس سے اٹھ کر ابن انشاء کے ساتھ چلتا ہوا میں مال کے اس نکڑ پر پہنچا جہاں اب الفلاح کی اونچی عمارت کھڑی ہے۔ تب یہاں یہ عمارت نہیں تھی۔ ایک گھنا پیپل کا پیڑ تھا اور کھلی ہوئی جگہ۔ یہاں ایک گول گپے والے نے اپنا خوانچہ سجا رکھا تھا۔ یہاں ابن انشاء کے ساتھ کھڑے ہو کر میں نے گول گپے کھائے اور مطمئن واپس ہوا۔ پہلی مرتبہ میں نے اپنے آپ کو ایک ترقی پسند ادیب کے ساتھ متفق الرائے محسوس کیا۔

زبان کا ذائقہ شاید آدمی کے انداز نظر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ سو مجھے جلدی ہی پتہ چل گیا کہ ابن انشاء ترقی پسند ادیب ہوا کرے مگر ہم ادب سے باہر چیزوں کو ایک ہی طرح سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح سے جسے ترقی پسندوں کے محاورے میں زوال پسندی کہتے ہیں۔ سو جب 1953ء کے مقامی مارشل لاء میں صفائی کی مہم چلی اور لاہور شہر کی سڑکیں خوانچوں سے پاک صاف ہوتی چلی گئیں تو میں نے ابن انشاء کو کہ اب کراچی جا چکا تھا' اس واقعہ سے مطلع کیا۔ اب میں وہ خط پڑھتا ہوں جو ابن انشاء نے جواب میں لکھا تھا۔

''جان من۔ میں آج بہت دنوں کے بعد دفتر آیا ہوں۔ دفتر آنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ تمہارے خط کا جواب لکھ رہا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ لاہور کی قدر تم ہی نے پہچانی ہے۔ لاہور سے کوئی درویش یہاں آتا تھا تو میں اس سے یہی پوچھتا تھا کہ بھائی لاہور کہ ایک شہر تھا عالم میں انتخاب' اس کا کیا حال ہوا۔ وہ خوانچوں والے کہاں گئے۔ شب گردی کرنے والے ادارہ مزاجوں کے شب و روز کیسے گزر رہے ہیں۔ چھولوں اور کلچوں والوں کا بازار تو مارشل لاء نے سرد کر دیا ہوگا۔ سینماؤں کا بھیڑ بھیڑ کا' قلفیوں

والوں کی آوازیں' تانگوں والوں کی تانیں' چائے خانوں کی رات گئے کی محفلیں' یہ سارا شیرازہ بکھر گیا ہوگا تو لوگ آخر وہاں سانس کیسے لیتے ہوں گے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ جو آیا اسے لاہور کی تعریف میں رطب اللسان پایا۔ اس نے سڑکوں کی صفائی' لوگوں کے نظم وضبط اور دودھ دہی کی ارزانی کا حال ہی سنایا۔ میں اب سوچتا ہوں۔ میں نے غلط آدمیوں سے لاہور کا مزاج پوچھا۔ پیارے یہ لاہور کی تباہی بہت بڑا موضوع ہے۔ یہ ایک شہر آشوب کا موضوع ہے..... میرا مذاق Decadent سہی لیکن میں نے مدت ہوئی چیزوں کا تجزیہ کرنا چھوڑ دیا ہے اور اب بڑے مزے سے گزرتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہمی' ادہام پرست' خبطی' سنکی' ازادہ رو وارستہ مزاج میں ہمیشہ سے تھا....."

خیر یہ دور جلدی گزر گیا۔ گئے ہوئے خوانچے واپس آ گئے اور جب انشاء لاہور آیا تو ہم نے چیئرنگ کراس جا کر اسی نکڑ پہ سیر ہو کر گول گپے کھائے اور اب دستور یہ ہوا کہ انشاء کا جب لاہور کا پھیرا ہوتا' شام کو ٹی ہاؤس سے مجھے اکھاڑنا' اسی نکڑ پر پہنچنا اور گول گپے کھانا۔

یہ دستور لمبا نہیں کھینچ سکا۔ مارشل لاء کے زمانے میں مال روڈ کو صفائی کی جو ہوا لگی تھی' وہ بے اثر تو نہیں جا سکتی تھی۔ لاہور ترقی کرتا چلا جا رہا تھا اور پرانے ذائقوں والے خوانچے مختلف سڑکوں کے نکڑوں سے غائب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ آخر چیئرنگ کراس کے نکڑ پہ سجے گول گپوں کے خوانچے کی بھی باری آ گئی۔ یہاں اب ایک فلک بوس عمارت کی نیو پڑ رہی تھی۔ گول گپوں کے خوانچے کو رخصت ہونا ہی تھا۔

وہ گرمیوں کی شام تھی۔ ابن انشاء کے آنے پر میں ٹی ہاؤس سے اس کے ساتھ نکلا لیکن مال پہ چہل قدمی بے معنی نظر آ رہی تھی کہ اب وہ خوانچہ بڑھ چکا تھا جو اس سڑک پر ہماری منزل مقصود ہوا کرتی تھی۔

انشاء نے چلتے چلتے کہا "یار پیاس لگ رہی ہے۔"

"پھر کوکا کولا پئیں۔" میں نے تجویز پیش کی۔

"نہیں میں کوکا کولا نہیں پیا کرتا۔ ان نئے Drinks میں مجھے مزا نہیں آتا۔"

"مزا تو مجھے بھی نہیں آتا مگر اور کیا پئیں۔ ستو کا مٹکا اس سڑک سے اٹھ چکا ہے۔ تخم بالنگے کے شربت والا بھی اب ریگل چوک میں نظر نہیں آتا۔"

"تم نے شربت بادام پیا ہے؟"

''نہیں۔''

''چلو میں تمہیں پلاتا ہوں۔''

ہم دونوں مال سے مڑے اور بیڈن روڈ سے ہوتے ہوئے میکلوڈ روڈ پر آ گئے۔

''یہ دکان ہے۔ یہاں شربت بادام لاجواب ہوتا ہے۔''

میں نے شربت بادام پیا اور انشا پرداد کے ڈونگرے برسائے کہ کیا دکان دریافت کی ہے۔ پھر یہ دستور ٹھہرا کہ گرمیوں کے دنوں میں جب انشاء کا پھیرا لاہور کا لگتا تو رات کو واپسی میں انشاء کا ساتھ میں میکلوڈ روڈ کے اس نکڑ تک دیتا جہاں شربتوں کی یہ دکان تھی۔ انشاء شربت بادام ایک گلاس پلا کر مجھے رخصت کرتا۔

''یار بات یہ ہے کہ میں دیہات کا آدمی ہوں۔ ذائقہ بھی میرا وہی ہے۔ ساگ' مکئی کی روٹی' لسی اسی قسم کی چیزیں جو دیہات میں استعمال ہوتی ہیں' مجھے اچھی لگتی ہیں۔ نئی شہری غذاؤں میں مجھے لذت نہیں ملتی۔''

یاروں نے گھر بیٹھے بیٹھے اپنے شہروں میں اپنے قصبوں میں رہتے ہوئے اپنے ذائقے بدل لیے اور باہر سے آئی ہوئی لذتوں کے لیے پسند پیدا کر لی۔ ابن انشاء نے دنیا جہاں کی خاک چھان ڈالی۔ مشرق اور مغرب کے ملکوں کے سفر کیے' وہاں کی ڈشیں چکھیں لیکن ذائقہ وہی دیہاتی رہا۔

ذائقہ کے معاملہ میں چونکہ میں بھی خالص دیسی آدمی ہوں' اس لیے ابن انشاء سے اس سطح پر میرا بہت جلدی اتحاد ہو گیا مگر رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ ایک اور ذائقہ بھی ہمارے درمیان مشترک ہے۔ لفظوں کا ذائقہ۔ اس ذائقہ کے معاملہ میں بھی ان انشاء بالکل دیسی آدمی تھا۔ وہی دیسی قسم کی نثر جو میر امن نے لکھی تھی یا مولانا محمد حسین آزاد نے یا سرشار نے ابن انشاء کو متاثر کرتی تھی۔ لہجے اور لفظ لیتا تھا جتنی گول گپے کھا کر یا شربت بادام پی کر لیتا تھا۔ بس اسی ذائقہ نے اسے ہمارے زمانے کا صاحب طرز نثر نگار بنا دیا۔

اردو صحافت میں نثر کا باب مولانا چراغ حسن حسرت کے ساتھ بند ہو گیا تھا۔ ابن انشاء نے اسے پھر کھول دیا اور ایسے کھولا کہ یہ باب پچھلے باب سے کسی صورت ہٹیا دکھائی نہیں دیتا۔ نثر کیا خوب لکھی مگر زیادہ اخبار میں لکھی۔ شاید ابن انشاء کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی نثر اس کی شاعری کے ساتھ گڈمڈ نہ ہو جائے۔ ایک گفتگو میں کہا کہ ''کالم نگاری میری ازدواجی زندگی ہے۔ شاعری میرا عشق ہے۔ ''تو ابن انشاء کی کوشش ہی نظر آتی ہے کہ بیوی اور محبوبہ الگ الگ رہیں۔ ایک کا سایہ دوسری پر نہ پڑے۔ سو بقول خود ''کبھی سنجیدہ نثر نہیں لکھی اور کبھی مزاحیہ شعر نہیں کہا۔''

نثر نگار ابن انشاء ایک ہنستا مسکراتا شخص تھا۔ شاعر ابن انشاء جوگ پر مائل ایک اداس روح۔ ترقی پسندی کا رنگ جوں جوں چھٹتا گیا' جوگ پر مائل اس اداس روح کی اداسی گہری ہوتی گئی مگر عجب اداس روح تھی۔ بس شاعری میں اپنے درشن کراتی تھی۔ ویسے اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا تھا۔ نہ اس کی نثر میں نہ اس کی بات چیت میں۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا کہ میری دلچسپی کی چیزیں تین ہیں۔ شرلک ہومز' کھانا اور سونا اور اب تم پوچھو گے کہ تمہارا آخر نظریہ حیات کیا ہے۔

چلو پوچھ لیا' پھر بتا دو۔

جواب دیا' میرا نظریہ حیات ہے۔ آرام' اول آرام اور بعد میں بھی آرام۔ اس لیے میں سونا پسند کرتا ہوں اور اس کا قائل ہوں کہ آنے والے کل میں جو تمہیں کرنا ہے' اسے آج پر مت ٹالو۔

تو موصوف کو سونے سے بہت دلچسپی تھی' وہ اپنے نظریہ حیات کے واسطے سے تھی اور کھانے سے رغبت۔ کہنے لگا کہ میرا ذائقہ بالکل دیہاتی ہے۔ جس طرح جاہل اپنی جہالت میں مگن رہتا ہے۔ میں اپنے دیہاتی ذائقہ میں مگن ہوں۔

مگر اب ہمارے ذائقے ایک انقلاب سے دوچار ہیں۔ پہلے کوکا کلچر آیا اور ہمارے رنگا رنگ شربتوں کو' ستوؤں کو' لسی کو بہا کر لے گیا۔ اب پیزا کلچر کی نمود ہے۔ گزرے زمانے کی ایک مثل یاد آئی۔ رام نے ایک بیٹا دیا' وہ بھی مسلمان کا۔ پوری کچوری کھاتا نہیں۔ ٹکڑا مانگے نان کا..... یہ ان نئے نویلے ہندو نوجوانوں کا احوال ہے جو اپنے روایتی کھانوں سے بیزار تھے اور مغلئی دسترخوان پر لہلوٹ تھے۔ کم و بیش یہی صورت احوال اب پاکستان میں پیدا ہو چکی ہے۔ نئی تانتی' نئے ذائقوں پر ریجھی ہوئی ہے۔ ہمارے سارے مغلئی غیر مغلئی پنجابی' پشاوری کھانے ایک طرف اور پیزا دوسری طرف۔ پیزا ہٹ کھلتے چلے جا رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان میں میکڈانلڈ آن پہنچا ہے۔ کھانوں کی پرانی تہذیب کو سلام' اب فاسٹ فوڈ کلچر کی نمود ہے۔ روایتی شہر اب اپنے آخری دموں پر ہے۔ میں گھر میں بند بیٹھا ہوں۔ میرے گھر کے باہر جیل روڈ پر پھاوڑا بج رہا ہے' کلہاڑا چل رہا ہے۔ پرانی سڑک کھدر ہی ہے۔ نئی شاہراہ کا ڈول پڑ رہا ہے۔ درخت کاٹے جا رہے ہیں۔ پرندے کتنے اس نواح سے اڑ گئے۔ کتنے اڑ جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ کچھ وضع دار چڑیاں ہیں جو پرانی وضع کو نبھا رہی ہیں۔ صبح ہی صبح نمودار ہوتی ہیں۔ توس کے تھوڑے ریزے جو میں پیش کر سکتا ہوں کر دیتا ہوں۔ وہ چگتی ہیں' تھوڑا چوں چوں کرتی ہیں۔ پھر جلدی ہی پھر کر کے اڑ جاتی ہیں۔ دیکھا چاہیے کہ یہ چڑیاں اس وضع کو کب تک بناتی ہیں۔

مجھے دیکھو کہ میں اس نئے ابھرتے نقشہ میں پرانے چائے خانوں کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں اور ان یاروں کو جو یہاں بیٹھ کر دنیا و مافیا

سے بے تعلق ہو جاتے تھے۔ کھانا کھایا' کھایا نہ کھایا مگر چائے کا دور جاری رہنا چاہیے۔ جب کسی چائے خانے کا پتہ نشان نہیں ملتا تو گھوم پھر کر ٹی ہاؤس' کم از کم اس زمانے کا ایک نشان تو باقی ہے۔ یادِ فراق محبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع کہ بس ٹمٹما رہی ہے

''وہی نقشہ ہے دل اس قدر آباد نہیں''

اتنا بھی غنیمت ہے۔ اکا دکا دیوانہ اب بھی نظر آ ہی جاتا ہے۔ ایک آدھ سچ مچ کا پاگل بھی ہاں اس زمانے میں زیادہ ہوتے تھے۔ سچ مچ کے پاگل بھی زیادہ نظر آتے تھے۔ ایک کو تو ہم نے اپنی نظروں کے سامنے پاگل دیوانہ ہوتے دیکھا۔ ڈاکٹر سلیم واحد سلیم اچھے بھلے آدمی تھے۔ اچھی بھلی غزل کہتے تھے۔ ایک دو کام کی کتابوں کے ترجمے بھی کر رکھے تھے۔ توزک جہانگیری کا ترجمہ تو مجھے اب تک یاد ہے۔ اچھا کیا تھا۔ اپنے کلینک سے فارغ ہو کر ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شب ٹی ہاؤس پہنچتے تھے جس پر انجم رومانی نے کچھ شعر بھی کہے تھے۔ آغاز یوں ہوتا تھا

''آتا ہے ساڑھے آٹھ بجے ڈاکٹر سلیم''

عارف عبدالمتین کے ساتھ یارانہ تھا۔ انہیں کے ساتھ چائے پیتے اور بحث کرتے نظر آتے تھے۔ بس دیکھتے دیکھتے دماغ چل بچل ہو گیا اور ایسا چل بچل ہوا کہ ٹی ہاؤس چھوڑا' ٹی ہاؤس والوں کو چھوڑا۔ سب سے متنفر دور دور ہراساں و پریشاں پھرتے تھے۔ سب پر شک کہ سی آئی ڈی والے ہیں اور میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ رات گئے جب ہم چلتے چلتے مال سے دور کے کسی کوچے میں جا نکلتے تو اچانک کسی موڑ پر کہیں قریب سے ایک غصیلی آواز سنائی دیتی' سالے خفیہ والے اور اس کے ساتھ ایک مغلظ گالی۔ انہیں گمان گزرتا کہ ہم انہیں کا پیچھا کرتے کرتے اس کوچے میں آئے ہیں۔ پھر ایک دن کوچے سے گزرتے ہوئے عجب منظر دیکھا۔ کیا دیکھا کہ تالیاں بجاتے قہقہے لگاتے' لڑکوں کا ایک غول ڈاکٹر سلیم کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اچانک انہوں نے ایک اینٹ اٹھائی اور پلٹ کر مغلظ گالیاں دیتے ہوئے اینٹ کھینچ کر ان کی طرف پھینکی۔ لڑکے سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ اب لڑکے آگے آگے بھاگ رہے تھے اور ڈاکٹر سلیم اینٹ لیے ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

ان دنوں ٹی ہاؤس کے عین سامنے پیپل کے پیڑ تلے ایک نلکا تھا۔ ایک پاگل مال کے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے نل کو دیکھ کر ٹھٹکتا۔ پانی پیتا' اپنے سفید بگلا تہمد اور کرتے پر پڑی ہوئی اصلی یا فرضی چھینٹ کو محنت سے دھوتا۔ اس پاگل کو صفائی اور پاکیزگی کا خبط تھا۔ جب اس کام سے فارغ ہو جاتا تو ٹی ہاؤس کی طرف رخ کرتا۔ جو بھی ادیب نظر آتا' اس کا منہ چڑاتا اور بڑبڑاتا ہوا تیزی سے آگے چلا جاتا۔

انہیں برسوں کا ذکر ہے کہ ایک سفید فام لڑکی کاٹی ہاؤس میں ورود ہوا۔ حسین مہ جبیں مگر پٹڑی سے اتری ہوئی ایک بڑی سی گٹھڑی کمر پر لادے کوچہ کوچہ ماری پھرتی۔ تھکی ہاری ٹی ہاؤس میں داخل ہوتی۔ گٹھڑی کمر سے اتار کر میز پر رکھتی اور چائے کا آرڈر دیتی۔ چائے پیتی' پھر گٹھڑی کاندھے پر لاد کر ٹی ہاؤس سے اٹھتی اور آگے نکل جاتی۔

اب یہاں ایک کھسکے ہوئے جنٹلمین دیکھے جاتے ہیں۔ جون' جولائی کی سخت گرمی میں گرم سوٹ پہنے ہیٹ لگائے وارد ہوتے ہیں۔ ایک بڑا سا سوٹ کیس ساتھ میں ہوتا ہے۔ چائے پی' ویٹر سے تبادلہ خیال کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک ہیں جنہوں نے یہاں مستقل چھاؤنی چھائی ہے۔ لمبے لگ لگ' بدن چرخ ایسا کہ ہڈی ہڈی گن لو۔ گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے ہر سے ہر موسم سوٹ میں ملبوس۔ نہ کسی سے بولنا بات کرنا نہ کسی کی طرف دیکھنا۔ اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں۔ جانے دیار امریکہ میں کیسی گھڑی میں اس فرنگن نے جس سے عمر بھر کا پیمان وفا باندھا تھا۔ کنارہ کیا کہ پھر دل کو کسی گھڑی صورت قرار نہیں آیا۔ اب اس کے خیال میں بیٹھے لکیر پیٹتے ہیں اور امریکہ کے صدر کے نام عرض داشتیں لکھتے ہیں اور انصاف مانگتے ہیں۔ عرض داشتیں بھیجتے' زمانہ گزر گیا۔ ادھر سے جواب آج تک نہیں آیا۔

تو جو تھوڑا بہت پیسہ کہیں سے ملتا ہے' وہ ڈاک میں صرف ہو جاتا ہے۔ کھانا پینا ٹی ہاؤس کے ذمے ہے۔ اس انتظام میں بس ایک ہی دفعہ کھنڈت پڑی تھی۔ موصوف کو چپ بیٹھے بیٹھے خفقان ہوا تو بولنا شروع کر دیا۔ زبان جب کھلی تو ایسی کھلی کہ ٹی ہاؤس کی انتظامیہ کو بیروں کو کھری کھری سنا ڈالیں۔ بیروں نے جواب میں کھانے کے وقت آنکھیں دکھائیں۔ ایک وقت کا کھانا نہ ملا تو دیوانے نے ہوش پکڑا۔ پھر کبھی زبان نہیں کھولی۔ کھانے کے وقت کھانا' چائے کے وقت چائے۔ خفقان ہوا تو اٹھ کھڑے ہوئے۔ جدھر منہ اٹھا نکل گئے۔ کوچہ گردی سے تھک گئے تو پھر اپنی تھان پر آن بیٹھے۔

ایک مراقی کرڈکشنری کے مطالعہ کا مراق ہے۔ چائے سامنے رکھی ہے اور ویبسٹر ڈکشنری کھلی ہے۔ کس عرق ریزی کے ساتھ اس ڈکشنری کا مطالعہ کیا۔ سال ڈیڑھ سال میں جب ایک ایک لفظ کے معنی پڑھ لیے تو پھر دوسری ڈکشنری سنبھال لی۔ اب آکسفورڈ ڈکشنری زیر مطالعہ ہے۔

باقی رہی یہاں آنے والی ادبی مخلوق تو وہ ٹولیاں جن کے واسطے سے ٹی ہاؤس آگے جانا جاتا تھا' اب کہاں۔ کیسی کیسی ٹولی آئی اور ہنس بول کر چلی گئی۔ کیا کیا صورت تھی کہ یہاں نمودار ہوئی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کتنی خاک کی تہہ میں چلی گئیں۔ کتنی اس رنگ سے بدلیں کہ اب پہچانی نہیں جاتیں۔ اب اور ٹولیاں ہیں اور ان کے لچھن ہیں۔ رنگ رنگ کے شاعر' رنگ رنگ کے افسانہ نگار'

ناول نگار۔ جتنے شاعر ہیں' سب صاحب دیوان ہیں۔ ایسے بھی ہیں کہ ان کے دیوانوں کی گنتی گنو تو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گنی جائیں اور ان کی گنتی پوری نہ ہو اور افسانہ نگار ناول نگار ایسے کہ دونوں بغلوں میں مجموعے دبے ہوئے جو سامنے آیا' اسے ایک عدد مجموعہ نذر کر دیا۔ وہ زمانہ گیا جب نوخیز لکھنے والے جھجکتے ٹی ہاؤس میں قدم رکھتے تھے۔ پھر کوئی کسی بڑے کی انگلی پکڑ کر حلقہ ارباب ذوق میں پہنچتا۔ رفتہ رفتہ وہ دن آتا کہ اس کی تحریر کسی بھلے ادبی رسالے میں جگہ پاتی۔ اس زمانے کے رسالے کے ایڈیٹر بھی تو سخت گیر ہوتے تھے۔ یہ نہیں کہ جو تحریر موصول ہوئی' آنکھیں بند کر کے چھاپ دی۔ یہ تو تب ہوتا ہے جب رسالہ کی بڑائی اس میں سمجھی جاتی ہے کہ وہ ضخیم ہو۔ رسالہ میں چھپنے کے بعد بھی لکھنے والے کو کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ تب کتاب چھپتی تھی۔ مطلب یہ کہ قطرے پہ گہر ہونے تک کتنی کچھ گزر جاتی تھی۔ اب قطرہ راتوں رات گہر بنتا ہے۔ راتوں رات صاحب تصنیف۔ ٹی ہاؤس میں اتوار بھنڈار کھلتا ہے۔ توشہ بنتا ہے۔ یار لوگ خالی ہاتھ آتے ہیں۔ شعر و افسانے کے نئے مجموعے بغل میں داب کر لوٹتے ہیں۔ ایک اتوار کی شام میں نے یہاں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب اس شان سے داخل ہوئے کہ پیچھے پیچھے ایک ملازم جس کے سر پہ ایک گٹھر تھا۔ انہوں نے ایک خالی میز دیکھ کر گٹھر وہاں رکھوایا اور کھولا۔ پتہ چلا کہ یہ کتابوں کا گٹھر تھا۔ ہر میز پر جا کر وہاں بیٹھے ہوؤں کو ایک ایک کتاب نذر کی۔ جب ساری کتابیں بٹ گئیں تو اطمینان سے واپس چلے گئے۔

ایک ادیب شہر۔ ٹی ہاؤس کی پرانی ہڈی' چھٹی دہائی کا اینگری ینگ مین۔ جوانی ڈھل گئی۔ غصہ برقرار ہے۔ مہینے کے مہینے انگارے اگلتے ہیں۔ ایک رسالہ میں ملفوف کر کے ٹی ہاؤس میں تقسیم کر جاتے ہیں۔ یہ مہینے کی پہلی اتوار کا پروگرام ہے۔ اگلی اتوار کو اپنی نئی شاعری کا مجموعہ چھاپ کر لاتے ہیں اور تقسیم کر جاتے ہیں۔ اس سے اگلے ہفتے نیا ناول لے کر آتے ہیں۔ اس سے اگلے ہفتے کسی مغرب کے شاہکار کا ترجمہ۔ انتھک لکھتے ہیں۔

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھن کی پوری ہے کام کی پکی

اچھا برا موٹا باریک پیسے چلے جاتے ہیں۔ نیکی کر کر کے منوں ٹنوں کے حساب سے دریا میں ڈال چکے ہیں۔

ایک بی بی اتوار کی اتوار نمودار ہوتی ہیں۔ خاموشی سے تھوڑا وقت بیٹھیں چائے خود پی' دوسروں کو پلائی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہ ندرت الطاف ہیں۔ نام خدا جب جوان تھیں تو کافی ہاؤس میں بیٹھتی تھیں۔ شہر میں ان کی دھوم تھی۔ میں نے انہیں ایک کھیل میں دیکھا تھا' کیا چٹاخ پٹاخ بولتی تھیں۔ شباب کمبخت شتابی سے آیا۔ شتابی سے گیا۔ اسی رو میں وہ کافی ہاؤس سے نکلیں اور دور دیس نکل گئیں۔

واپس آئیں تو دیکھا کہ کافی ہاؤس بند ہو چکا ہے۔ ٹی ہاؤس کا رخ کیا۔ بس پھر یہیں کی ہو رہیں۔ کافی ہاؤس کے اکثر اجڑے ہوؤں کو ٹی ہاؤس ہی نے سینے سے لگایا تھا۔ انہیں بھی سینے سے لگا لیا۔ دھوپ تو ساری چلی گئی۔ دیوار گلستان پر اس کا کوئی نام و نشان نظر نہیں آتا۔ اس بھلے سمے کے ساتھی بھی چڑیوں کی طرح اڑ گئے۔ اب ٹی ہاؤس کی ایک میز سے نباہ کر رہی ہیں۔ کبھی کبھار افسانہ لکھتی ہیں اور اچھا لکھتی ہیں۔

اور لیجئے ایک بزرگ آتے ہیں' حاتم طائی کی صورت۔ سرخ و سفید' بھاری بھرکم' چھڑی ٹیکتے داخل ہوتے ہیں۔ یار انہیں دور ہی سے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ اپنے اپنے بل سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ یہ اے جی جوش ہیں۔ خوب آدمی ہیں۔ با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

''تلسی کھڑے بجار میں مانگیں سب کی کھیر''

اے جی جوش کا بجار ٹی ہاؤس ہے۔ ایک ایک میز پر جانا' تھوڑا بیٹھنا۔ پھر اگلی میز کا رخ کرنا۔ جس میز پر دم بھر کے لیے ٹک گئے' اس پر جتنی چائے پی گئی ہے' اسے ان کے حساب میں شامل سمجھو۔ ویسے فیاضی کی داستان ٹی ہاؤس سے آگے بھی چلتی ہے۔ دعوتوں کا اہتمام ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔ یار کھا کر خوش ہوتے ہیں۔ یہ کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔

اور وہ جو دیوار سے متصل نشست سے چپکے ایک بزرگ بیٹھے ہیں۔ چھریرا بدن' کمر قدرے جھکی ہوئی۔ جانے کب سے یہاں جمے بیٹھے ہیں۔ میں کتنے زمانے سے انہیں اسی نشست پر اسی انداز سے بیٹھا دیکھتا آ رہا ہوں۔ شاید اتنے زمانے سے بیٹھے بیٹھے انہیں تھوڑی پھپھوندی بھی لگ گئی ہو۔ یہ اسرار زیدی ہیں' نہ منہ سے بولتے ہیں' نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ پھر بھی ان میں کوئی جادو تو ہے کہ عقیدت مند دور دور سے کھینچ کر ان کے پاس پہنچتے ہیں۔ ان کی ٹیبل سمجھو تو آستانہ عالیہ ہے۔ بندگان درگاہ ٹی ہاؤس میں داخل ہو کر پہلے اس آستانے پر ماتھا ٹیکتے ہیں۔ پھر جس کا جو مشغلہ ہے' اس میں مصروف ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں جسے نظر بھر کر دیکھ لیتے ہیں' اسے حلقہ میں اقتدار مل جاتا ہے۔ اسی لیے حلقہ کے الیکشن کے دنوں میں ان کے گرد زیادہ جمگھٹا رہتا ہے۔

حلقہ ہنوز سانس لے رہا ہے۔ اور جب تک سانس تب تک آس۔ آسوں مرادوں والے اب بھی اس کے الیکشن میں سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ بلکہ اب زیادہ سرگرمی سے لیتے ہیں۔ تحریکوں اور انجمنوں کی بھی اپنی اپنی عمر ہوتی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین خوش قسمت تھی کہ بوڑھی ہونے سے پہلے گزر گئی۔ اب وہ ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔ حلقہ بدقسمت ہے کہ اسے یاروں نے مرنے نہیں دیا اور وہ ہنوز اس شرف سے محروم ہے۔ اب اس کا بسیرا بھی ٹی ہاؤس ہی میں۔

اور یہ جو عین وسط کی میز پر ایک شخص اٹنگا سا پائجامہ اور قمیص پہنے اکیلا بیٹھا ہے اور آنکھوں سے کتاب لگا رکھی ہے۔ وہ بھلا زاہد ڈار کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ سخت اکل کھرا۔ گنے چنے دوستوں کے سوا کوئی مخلوق میز پر آن بیٹھے تو اسے فوراً اٹھا دیتا ہے۔ وہ نہ اٹھے تو (ٹی ہاؤس میں یہ ڈھٹائی بھی چلتی ہے) خود اٹھ جاتا ہے۔ باہر جا کر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور انتظار کرتا ہے کہ کب وہ میز سے ٹلے اور واپس جا کر اپنی نشست سنبھالے۔ مگر لازم نہیں کہ وہ اجنبی ہو۔ کسی دوست پر بھی کسی دن یہ وقت آ سکتا ہے۔ دوستوں میں وہ کوئی کوئی ہے جو اس کے لیے بارہوں مہینے قابل قبول رہتا ہے۔ سو دوست بھی باری باری پر سونا نان گریٹا کی حیثیت اختیار کرتے رہتے ہیں۔ کوئی اجنبی اچانک دوست بن سکتا ہے اور اچانک کسی دوست کو اس میز سے دیس نکالا مل سکتا ہے۔ سو اس میز پر چھنٹ چھنٹا کر یہی کوئی تین ساڑھے تین تگ رہ گئے ہیں۔ مسعود اشعر، اکرام اللہ، شاہد حمید اور وہ بھی روزانہ نہیں اتوار کی اتوار پھیرا لگاتے ہیں۔ ہاں لڑکیوں کے لیے اس میز پر بہت جگہ۔ اور پتہ نہیں لڑکیوں کو زاہد ڈار میں کیا نظر آتی ہیں کہ جس نے اس سے ایک مرتبہ بات کر لی۔ پھر وہ بار بار اس طرف کا رخ کرتی ہے۔ مگر پھر اچانک غائب بھی ہو جاتی ہے۔ باقیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس سے کب فرنٹ ہو جائے۔

''تم تو اس سے بہت گھلے ملے نظر آتے تھے۔ اب اچانک وہ کیوں راندہ درگاہ بن گیا۔'' میں پوچھتا ہوں۔

''بہت اونچی آواز میں بولتا ہے۔ اس کی آواز مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔''

''مگر وہ تو پہلے بھی اونچی ہی آواز میں بولتا تھا۔''

''اب زیادہ اونچی آواز میں بولتا ہے۔''

''تم یہ نہیں کر سکتے۔'' ایک روز میں نے تجویز پیش کی کہ ''ٹی ہاؤس آنے کی بجائے جنگل کا رخ کرو اور کسی برگد کے سائے میں جا بیٹھو۔ وہاں تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ یکسوئی سے کتاب پڑھ سکو گے۔''

''ایسا ہی کرتا مگر یہ گوتم بدھ کا زمانہ نہیں ہے۔ دوسرے ہی دن پولیس مجھے را کا ایجنٹ بتا کر پکڑ لے جائے گی۔''

''مگر ٹی ہاؤس تم کس خوشی میں آتے ہو، تمہیں پتہ نہیں ہے کہ یہاں ادب کے نام پر ہر رنگ کا جناور آ کر گرتا ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے یہاں کس بھلے آدمی کو یکسوئی میسر آ سکتی ہے۔''

''میں یہاں خاموشی کی تلاش میں آتا ہوں۔''

خاموشی کی تلاش ٹی ہاؤس میں؟ میں حیرانی سے اسے دیکھتا ہوں۔ مجھے حیران ہونا چاہیے۔ مال روڈ کا یہ ٹکڑ جہاں ٹی ہاؤس واقع

ہے مال روڈ کے سب سے پرشور ٹکڑوں میں سے ہے باہر بھی شور اور اندر تو شور ہوتا ہی ہے اور ضیاء الحق کے زمانے سے اس کے شور میں ایک اور قسم کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس زمانے میں یاروں کو جب جلسہ کرنے اور دل کا غبار نکالنے کے لیے کہیں جگہ نہ ملتی تھی تو ٹی ہاؤس آ کر اس کی بالائی منزل میں جلسہ کرتے تھے۔ یوم مئی کا دانشوروں کا جلسہ سال کے سال یہیں ہوا کرتا تھا۔ تب سے ٹی ہاؤس جلسہ گاہ بھی ہے۔ کسی بھی شام یہاں جلسہ کرنے والوں کا بھیڑ بھڑ کا نظر آ سکتا ہے۔ حلقہ کا جلسہ بھی اب یہیں ہونے لگا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ ''تم باؤلے ہو گئے ہو۔ ٹی ہاؤس میں تمہیں خاموشی کہاں مل جائے گی۔''

مگر زاہد ڈار کی منطق یہ ہے کہ ہر شور کے وسط میں ایک خاموشی کا منطقہ ہوتا ہے۔ سو وہ روز دن ڈھلے گھر سے پیدل چل کر مال کی ٹریفک کے بے ہنگم شور سے گزر کر ٹی ہاؤس پہنچتا ہے اور عین وسط کی میز سنبھال کر سمجھتا ہے کہ وہ خاموشی کے منطقہ میں داخل ہو گیا ہے۔ پھر کتاب کھولتا ہے اور ارد گرد کے شور سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لے دے کے کتاب پڑھنا ہی اس کی مصروفیت ہے۔ اسی کے زور پر وہ اپنے آپ کو دنیا کا مصروف ترین آدمی تصور کرتا ہے۔ ضحاک کے کاندھوں پر دو سانپ پھنپھناتے رہتے تھے۔ روز صبح ان سانپوں کو دو انسانی کھوپڑیاں درکار ہوتی تھیں کہ یہی ان کی غذا تھی۔ یہ غذا نہ ملتی تو وہ ضحاک پر پھنکارتے تھے۔ زاہد ڈار کے کاندھوں پر بھی دو سانپ بیٹھے ہیں۔ انہیں غذا کے نام انسانی کھوپڑیوں سے نکلا ہوا وہ گودا درکار ہوتا ہے جسے کتاب کہتے ہیں۔ یہ سانپ اتنے ظالم ہیں کہ انہوں نے اس سے شاعری چھڑوا دی۔ کہتا ہے کہ شاعری میں وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔ اگر میں شاعری کرتا رہتا تو بہت سی کتابیں پڑھنے سے رہ جاتیں۔ عمر تھوڑی ہے اور کتابیں پڑھنے کے لیے بہت ہیں۔ سو میں نے بہت سوچا کہ شاعری چھوڑ دو اور صرف کتابیں پڑھو۔

کتابیں بے شک بہت ہیں۔ زاہد ڈار کے لیے بہت سے بھی زیادہ ہیں۔ ساری کتابیں تو اللہ کا کوئی بندہ نہیں پڑھ سکتا۔ سو ہر کتب بیں کو پڑھنے کے لیے کتابوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ زاہد ڈار کم از کم اردو کی کتابوں کی حد تک کسی انتخاب کا قائل نہیں ہے۔ اچھی بری جو کتاب ہاتھ پڑ جائے' پڑھتا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ یار تم خراب کتابیں بھی اس ذوق و شوق سے پڑھتے ہو۔ ہر خراب کتاب دیکھ کر پہلے بیزاری کا اظہار کرتے ہو' پھر اسے پڑھ ڈالتے ہو۔

کیا کروں' پڑھنی پڑتی ہیں۔

کیا مجبوری ہے؟

اصل میں اردو کی خراب کتابیں آخر اردو ہی میں لکھی گئی ہیں تو مجھے پڑھنی پڑتی ہیں۔

مگر کیوں؟

اس لیے کہ وہ اردو کی کتابیں ہیں۔

اچھی منطق ہے۔ اس منطق کا فائدہ سب سے زیادہ ان شاعروں کو پہنچتا ہے جو اپنے خرچ پر اپنا مجموعہ کلام چھپوا کر ٹی ہاؤس میں آ کر تقسیم کرتے ہیں۔ زاہد ڈار سے یہ سن کر کہ اس نے ان کا مجموعہ کلام پڑھا ہے' کتنے خوش ہوتے ہیں مگر جب رائے معلوم کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور رائے معلوم کی جاتی ہے تو اتنے ہی ناخوش بھی ہوتے ہیں۔ میرا جی کا یہ بیان وہ کتنے شوق سے دہراتا ہے کہ میری مادری زبان اردو ہے جو میری ماں نہیں بولتی۔ کہتا ہے کہ میری بھی مادری زبان اردو ہے جو میری ماں نہیں بولتی تھی۔

زاہد ڈار وقت کا بہت پابند ہے اور یہ چیز اسے ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کے پچھلے زمانے کے دیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ بھلا ناصر نے کبھی سوچا تھا کہ ٹی ہاؤس کتنے بج کر کتنے منٹ پر پہنچنا ہے اور کتنے بجے تک بیٹھنا ہے۔ ناصر کی زندگی میں گھڑی کا سرے سے کوئی دخل ہی نہیں تھا مگر زاہد ڈار پابندی کے ساتھ دن ڈھلے عین چھ بجے ٹی ہاؤس میں قدم رکھتا ہے۔ نو بجے یہاں سے اٹھ جاتا ہے۔ اس پروگرام میں اگر وہ ایک گھپلا نہ کرتا تو میں اسے ڈپٹی نذیر احمد کے بعد دوسرا ڈپٹی نذیر احمد بتاتا مگر اس مقام کو اس نے اپنی حماقت سے کھو دیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ نے بتایا ہے کہ پابندی سے روز دن ڈھلے ہارڈنگ لائبریری جانے کے لیے گھر سے نکلتے اور وقت کے ایسے پابند کہ ادھر گھنٹہ گھر نے چار بجائے' ادھر ڈپٹی صاحب نے لائبریری میں قدم رکھا۔ چاندنی چوک کے دکاندار انہیں دیکھ کر اپنی گھڑیاں درست کرتے تھے۔ انہیں گھنٹہ گھر سے بڑھ کر اس گھڑی پر اعتبار تھا جس کا نام نذیر احمد تھا۔ زاہد ڈار کو ایسا شرف حاصل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بیچ بیچ میں غوطہ جو کھا جاتا تھا۔ کتنے دنوں تک یاروں کو تجسس رہا کہ جب ٹی ہاؤس نہیں آتا تو پھر کہاں جاتا ہے۔ اب کی بات نہیں' پہلے کی بتاتا ہوں کہ اب تو رخ اور طرف ہے۔ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کہ یہ تمہارا زاہد ڈار جس شام ٹی ہاؤس نہیں آتا' اس شام کہاں جاتا ہے؟

میں نے کہا کہ شہر میں ایک ہی تو گھر ہے' وہیں جاتا ہے۔''

''وہ کونسا گھر ہے؟''

''کشور ناہید کا گھر۔''

یہ سن کر اس دوست نے سر پیٹ لیا اور کہا کہ

''اس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں''

میں نے اسے بتایا کہ جس شام تم نہیں آتے' اس شام دوستوں پر کیا گزرتی ہے۔ بولا' کیا کروں' مجبوری ہے۔ جب کشور ناہید کا پیغام آجاتا ہے' تو میرا جسم خود بخود اس گھر کی طرف حرکت کرنے لگتا ہے۔''

ہاں ایک بات میں غلط کہہ گیا۔ محض کتب بینی ہی اس کا مشغلہ نہیں ہے۔ دو روگ اس نے اور بھی پالے ہیں۔ عشق اور پیچش۔ پیچش کی خاطر وہ دس سال تک مسلسل ایک پینٹنٹ دوا لوموٹل استعمال کرتا رہا۔ میں نے ایک روز پوچھا ''کیا واقعی تمہیں پیچش ہے؟''

''تھی۔ اب نہیں ہے۔''

''کب تھی؟'' ''اب سے دس سال پہلے ہوئی تھی۔ لوموٹل کھائی' پھر نہیں ہوئی۔''

''تو پھر لوموٹل کیوں کھائے چلے جا رہے ہو؟''

''پھر بھی تو ہو سکتی ہے' تو لوموٹل کھا لیتا ہوں۔ میرا کیا بگڑتا ہے؟''

زاہد ڈار بغیر امراض کے نہیں رہ سکتا۔ جب رفتہ رفتہ اسے یقین ہو گیا کہ پیچش چلی گئی اور اب اس کے آنے کے امکانات نہیں ہیں تو اس نے اپنے لیے اور امراض کا اہتمام کیا۔ ایک آدھ مرض تو اسے شاید واقعی تھا۔ باقی اس نے اپنی نئی طبی تحقیق کی مدد سے دریافت کیے۔ شروع میں تو اس نے انور سجاد کی ڈاکٹری پر بھروسہ کیا تھا مگر انور سجاد سے جب بھی اس نے اپنی جس تکلیف کا بھی ذکر کیا' اس نے ایک ہی نسخہ بتایا کہ خوب پانی پیو' برطانیہ سے آنے والے رسالوں میں میڈیکل رپورٹوں کو پڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں تازہ ترین طبی تحقیقوں پر اسے عبور حاصل ہو گیا۔ تب اس نے ایک روز افسوس سے کہا کہ انور سجاد نے یورپ کے نئے تجرباتی ڈراموں کو تو بہت پڑھا' اس سے اسے کیا حاصل ہوا۔ اتنا ہی وقت اگر وہ وہاں کی نئی طبی تحقیقات کے مطالعہ پر صرف کرتا تو اس سے اس کی ڈاکٹری میں بھی تازگی آجاتی اور اس کے مریضوں کا بھی بھلا ہو جاتا۔

زاہد ڈار کی اپنے بارے میں ابتدائی تشخیص یہ تھی کہ اس کے گردے میں پتھری ہے۔ کشور ناہید تک یہ خبر گئی تو اس نے جھٹ اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ بیمار ادیبوں کو ہسپتال میں داخل کرانا اس کا ویسے ہی محبوب مشغلہ ہے اور یہ تو زاہد ڈار کا معاملہ تھا۔ وہاں اس کے پیشاب کے ٹیسٹ ہوئے' ایکسرے ہوا' الٹرا ساؤنڈ ہوا۔ کچھ برآمد نہیں ہوا۔ وہ پھر ٹی ہاؤس آ بیٹھا۔ تھوڑے دنوں بعد اسے اپنی ابتدائی تشخیص کی خامی کا احساس ہوا۔ اب اس کی تشخیص یہ تھی کہ اسے سوزاک ہے۔ کشور نے پھر اسے ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ پھر سارے ٹیسٹ ہوئے۔ پھر کچھ برآمد نہیں ہوا۔ ہسپتال سے نکل کر پھر ٹی ہاؤس آ بیٹھا۔ اب اس نے اپنی تازہ طبی معلومات کے زور پر یہ تشخیص کیا کہ اسے شوگر ہے مگر جب ٹیسٹ ہوئے تو ان میں کچھ نہیں نکلا۔ اپنے طبی مطالعہ پر اب اسے شک ہونے لگا تھا کہ ''ٹائم'' میں

ایک نئی طبی تحقیق کی رپورٹ اس کی نظر سے گزری۔ اس میں کہا گیا تھا کہ شوگر کی ایک قسم ایسی ہے جس کا کسی ٹیسٹ سے پتہ نہیں چلتا۔ تب اس نے جانا کہ اسے اس قسم کی شوگر ہے جو ہر قسم کے ٹیسٹ کو غچہ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

باقی رہی عشق کی بات تو پہلے میں نے یہ سمجھا تھا کہ شاعری بے شک اس نے نئی کی ہو آخر مغرب کی اتنی ساری نئی شاعری پیئے بیٹھا ہے مگر عاشق وہ میر و غالب کے زمانے کا ہے اور وفاداری بشرط استواری اس کا شیوہ ہے۔ جب اچانک اس کے جسم نے اور ہی طرف حرکت کرنی شروع کر دی تو اسے بھی میں نے اسی روایتی عشق کا شاخسانہ جانا۔ سوچا کہ زاہد ڈار واسوخت لکھ رہا ہے مگر رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ یہ خالی واسوخت نہیں۔

مگر اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ زاہد ڈار کو یہ غم بھی تو کھائے جاتا ہے کہ اوزون کا غلاف پھٹ گیا ہے مگر کاروں والوں کو اے سی' فریج' ڈیپ فریزر والوں کو اس کا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ اوزون کا غلاف بالکل ہی پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ کم از کم ٹی ہاؤس کی حد تک اس نے روک تھام کی ہے۔ کسی مخیر نے یہ سوچ کر کہ ٹی ہاؤس ادیبوں کا ٹھکانا ہے' وہاں اے سی لگانے کی پیشکش کی تھی۔ زاہد ڈار نے مخالفت کی کہ ائیر کنڈیشنڈ ہونے کے بعد ٹی ہاؤس تو ٹی ہاؤس نہیں رہے گا۔ اپنی مہم میں وہ کامیاب رہا۔ اے سی کی پیشکش پر شکریے کے ساتھ معذرت کر لی گئی۔

لیجیے مجھے ایک اور ٹی ہاؤس یاد آ گیا۔ وہ مسز اندرا گاندھی کے اقتدار سے پہلے کا زمانہ تھا۔ میں دلی گیا تو بلراج منیرا نے کہا کہ دلی میں بھی ایک ٹی ہاؤس ہے۔ آؤ ہم تمہیں اپنا ٹی ہاؤس دکھاتے ہیں۔

کناٹ پیلس کے بیچ ایک چائے خانہ' بالکل ٹی ہاؤس۔ وہی نقشہ' اسی قدر آباد۔ ارے یہ تو دیوندر ستیارتھی۔ اپنی سفید ٹیگور ین داڑھی اور سفید لمبی زلفوں کے ساتھ میز پر اپنی پوتھی کھولے بیٹھے ہیں اور یہ کون بزرگ ہیں۔ تعارف ہوا' ہنس راج رہبر۔ دعا سلام کے فوراً بعد نوٹس دیا کہ میں نے دو پمفلٹ لکھے ہیں' انہیں تم جا کر پاکستان والوں کو دکھاؤ گے۔ ایک پمفلٹ میرے ہاتھ میں پکڑایا۔ کہا کہ ''اس میں' میں نے مہاتما گاندھی کو ایکسپوز کیا ہے۔'' پھر دوسرا پمفلٹ پکڑا دیا۔ ''اس میں' میں نے نہرو کو ایکسپوز کیا ہے۔'' پھر تاکید کی کہ بس یہ دونوں پمفلٹ پاکستان والوں کے لیے لے جاؤ۔

میں سٹپٹایا۔ پھر دست بستہ عرض کیا ''رہبر صاحب آپ نے بہت بھاری ذمہ داری میرے سر پر ڈال دی ہے۔ میں اس کا اہل نہیں' معافی چاہتا ہوں۔''

دوسری مرتبہ دلی گیا تو اس دوران اندرا گاندھی آندھی دھاندی آئیں اور ایمرجنسی کا داغ دامن پہ لے کر چلی بھی گئیں۔ میں نے

یاروں سے کہا کہ چلو تمہارے ٹی ہاؤس بھی جھانک لیں۔

''ٹی ہاؤس اب کہاں۔'' منیر نے افسوس سے کہا ''اندرا جی کی ایمرجنسی اسے کھا گئی۔''

میں حیران ہوا۔ ''اچھا' مگر کیوں؟''

''اندرا جی کو شک تھا کہ یہاں بیٹھ کر دانشوران کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ سو وہ عمارت ہی ڈھا دی گئی۔''

میں ہکا بکا کہ اچھا ایمرجنسی میں یوں بھی ہوا۔ پھر تو یہ ایمرجنسی ہمارے مارشل لاؤں سے نمبر لے گئی۔ ایوب خان کے زمانے میں تو لیل و نہار میں ایک اداریہ بھی آ گیا تھا کہ ان ٹی ہاؤ میں بیٹھنے والے دانشوروں کی کیا زبانیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ پھر بھی ٹی ہاؤس چلتا رہا۔

ہاں ان زمانوں میں تو ٹی ہاؤس چلتا رہا مگر اب چلتا رہے تو جانیں۔ چائے خانوں کی تہذیب ہی مٹ گئی۔ چائے خانے گئے۔ چائے خانوں کے ساتھ چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانے والے گئے۔

''اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر''

کہاں نظر آئیں گے۔ پیزا ہٹ میں؟ فاسٹ فوڈ ریستوران میں؟ توبہ کرو۔ اس وقت برما کی عوامی آنگ سان سیو کائی' کی کتاب ''لیٹرز فرام برما'' میرے سامنے کھلی رکھی ہے۔ اس مقام پر جہاں اس نے رنگون کی ٹی شاپس کا ذکر کیا ہے۔ بتا رہی ہے کہ رنگون میں ٹی شاپس کو یا چائے خانوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہے کہ ٹی شاپ سٹنگ کا محاورہ چل پڑا ہے۔ ادیب اس سٹنگ کے بہت رسیا ہیں۔ ان کی یہ سٹنگ کبھی ایک غیر رسمی ادبی میٹنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور کبھی شعر و شاعری کی محفل بن جاتی ہے۔ طلبہ اور دوسرے نوجوان یہاں آ کر بیٹھتے ہیں اور پوپ میوزک سے لے کر سیاست تک ہر موضوع بکھانتے ہیں۔ آنگ سان سیو کائی کا کہنا ہے کہ رنگون میں ٹی شاپ اور ریستوران کے درمیان ایک خط امتیاز ہے اور یہ خط امتیاز صرف اتنا نہیں ہے کہ ٹی شاپ میں چائے سستی ملتی ہے اور ریستوران میں چائے کی قیمت زیادہ ہے۔ اس سے بڑھ کر فرق روایت کا ہے۔ ٹی شاپ میں بیٹھنے والے طلبہ ان نوجوانوں کے' ان طلبہ اور طالبات کی روایت کے پیرو ہیں جن کی سرگرمیوں کی وجہ سے دوسری جنگ عظیم سے پہلے کے زمانے میں رنگون یونیورسٹی تحریک آزادی کا مرکز بن گئی۔ ریستوران میں بیٹھنے والے نوجوانوں کا مطمع نظر اعلیٰ ملازمت کا حصول ہوتا ہے۔

مبارک ہے رنگون شہر جہاں ٹی شاپ کلچر برقرار ہے اور اس واسطے سے انٹلکچوئل گفتگو کی' سیاسی بحثوں کی' ادبی بحث مباحثے کی روایت برقرار ہے۔ لاہور شہر کے زوال پر غور کرو کہ یہاں کے ریستورانوں نے اپنی چائے خانے والی روایت کو ختم کر کے سارا زور ڈنر اور لنچ پر دیا اور اپنے آپ کو اونچے ریستوران بنا لیا۔ اس کے ساتھ ہی انٹلکچوئل گفتگو' ادبی بحث مباحثے اور سیاسی تبادلہ خیال کی

روایت جیسے اس شہر سے رخصت ہوگئی ہو۔

ارے کس کس بات کو، کس کس چیز کو یاد کریں
روئے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجئے

کیا کچھ تھا جواب نہیں ہے۔ پاکستان میں زندگی کس مقام سے شروع ہوئی تھی اور اب کس مقام پر کھڑی ہے۔ ذہنی اور فکری سرگرمی پہلے کتنی تھی' اب کتنی رہ گئی ہے۔ اس کی جگہ فروغ کس چیز نے پایا۔ نعرہ بازی نے۔ فکر سے عاری نعرہ۔ ہم نے اپنے باون برسوں میں یہی کچھ کمایا ہے' گنوایا کیا کیا ہے۔ ارے کیا کروگے پوچھ کر۔ بس اتنا سن لو کہ عید بقرعید پر جب میں نماز پڑھنے مسجد میں جاتا ہوں تو پہرے میں یہ فریضہ ادا کرتا ہوں۔ ہر برس پہرہ پچھلے برس سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اس برس گیا تو دیکھا کہ ایک مسلح گارڈ مسجد کے باہر تعینات ہے۔ کچھ سپاہی پستول تانے چھت پر مستعد کھڑے ہیں۔ مملکت اسلامیہ پاکستان میں اب سب سے زیادہ غیر محفوظ مقام مسجد ہے۔ کس پاکستان میں ہم نے صبح کی تھی۔ کس پاکستان میں اب شام کرتے ہیں۔

پھر بھی یاروں کی ہمت ہے کہ جوش وخروش سے اکیسویں صدی کے استقبال کی باتیں کرتے ہیں۔ اللہ جانے اکیسویں صدی ہمارے لیے کیا روکڑ لے کر آ رہی ہے مگر عجب ہوا کہ ہم انتظار کر رہے تھے کہ اکیسوی صدی کی سواری باد بہاری کا مگر اس صدی کی سواری کے پہنچنے سے پہلے چودھویں صدی آن پہنچی اور اب مجھے اپنی نانی اماں یاد آ رہی ہیں۔ کیسی کیسی ہوشربا کہانی ان سے سنی۔ اب کوئی کہانی سالم یاد نہیں۔ ان کہانیوں کے ٹکڑے نوالے حافظہ میں تیرتے رہتے ہیں۔ کسی رات یوں ہوتا کہ کہانی موقوف۔ چودھویں صدی کا قصہ چھیڑ دیتیں۔ بتانے لگتیں کہ اس کمبخت صدی میں کیا کچھ ہوگا۔ آدمی آدمی کو کھائے گا' گائے گوبر کھائے گی' کنواری برما نگے اور عجب بات ہے کہ میری نانی اماں نے چودھویں صدی کے بارے میں جو بتایا تھا' وہی مہابھارت میں کلجگ کے ذیل میں بتایا گیا ہے۔ پتہ نہیں یہ چودھویں صدی ہے یا کلجگ ہے۔ زمانہ بہرحال کالا پڑتا چلا جا رہا ہے۔ اور سر پہ ایک تلوار لٹک رہی ہے۔ بلکہ محاورے کو چھوڑو اور کہو کہ سروں پہ ایٹم بم گرج رہا ہے۔ جانے کب کس مورکھ کی کل اینٹھ جائے اور یہ دھم سے ہم پہ پھٹ پڑے۔ القارعہ ما القارعۃ۔ اور تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یہ دھماکہ ہے کیسا۔ تصور کرو اس دن کا جب آدمی ایسے ہو جائیں گے جیسے پتنگے بکھرے پڑے ہوں اور پہاڑوں کی یہ صورت ہو جائے گی جیسے دھنکی ہوئی روئی۔ کمبخت زمانہ تو کالا پڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔ سفیدی تو بس اب مرغی کے انڈے جتنی باقی رہ گئی ہے۔

◆◆◆

پس نوشت یعنی زیرے کی پڑیا

یادوں کی اس کتاب کی اشاعت نے ایک عجیب صورتحال پیدا کی۔ ایک سوال کا جواب مجھے بار بار دینا پڑا۔ افسانوں کے سلسلہ میں تو میرا موقف یہ چلا آتا ہے کہ جو پوچھنا ہے خود افسانوں سے پوچھو۔ عطر انست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ مگر یہ افسانوں کا نہیں یادوں کا مجموعہ تھا۔

سوال ہر پھر کر وہی ایک ''یہ آپ نے کیسی آپ بیتی لکھی ہے۔ بچپن کا ذکر ہے ہی نہیں نہ اس بستی کا جہاں آپ پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ یہ کیسی آپ بیتی ہے۔''

''بھائی یہ آپ بیتی نہیں ہے۔''

''پھر کیا ہے۔''

''کچھ یادیں ہیں' کچھ باتیں ہیں؟''

اور یادوں کا یہ سفر بھی ایک خاص تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ ان تاریخی لمحوں سے جب گائے سینگ بدل رہی تھی اور میں اس بھونچال میں اپنی بستی چھوڑ کر اس نئے دیس کی طرف گرتا پڑتا چلا آ رہا تھا جس کا نام پاکستان ہے۔ اور اب پاکستان کو بنے ہوئے پچاس برس ہو رہے تھے اور میری ہجرت کو بھی جس کے بیچ میں نے ایک لکھنے والے کی حیثیت سے آنکھ کھولی۔ تو میں نے اس ہنگام اپنے اس نئے جنم کی بھی گولڈن جوبلی منا ڈالی۔ سو اگر یہ آپ بیتی ہے تو بھی آدھی آپ بیتی۔ جسے واقعی آپ بیتی کہنا چاہیے وہ کیسے لکھوں۔ پھر تو مجھے اس بستی میں واپس جانا پڑے گا جو مجھ سے چھوٹ چکی ہے۔ وہ بستی تو اب میرے حسابوں کھوئی ہوئی جنت ہے۔ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسے یاد کر کے بس کہانیاں ہی لکھی جا سکتی ہیں۔ سو میں نے لکھیں۔ مگر یہ کہانیاں لکھتے ہوئے میں نے اپنی جان کو ایک روگ لگا لیا۔ اچھا میں پہلے یہ بتاتا چلوں کہ جب میں نے لکھنے کا آغاز کیا تھا تو اس وقت ہماری دنیائے ادب میں ایک بیماری کا بہت چرچا تھا۔ وہ موذی بیماری جس کا نام آتشک ہے۔ آتشک کی بیماری ان دنوں ترقی پسندوں کے لیے زوال پسندی کا استعارہ بنی ہوئی تھی کس حقارت سے وہ بادلیئر کا حوالہ دیتے تھے۔ فرانس کا وہ زوال پسند آتشک زدہ شاعر بادلیئر۔ ترقی پسند محاورے میں یوں سمجھو کہ زوال پسندی اور آتشک نے مل کر جو ایک دوسرے کا ضمیمہ تھے شاعری میں وہ گل کھلایا تھا جسے خود بادلیئر نے بدی کے

پھول کا نام دے رکھا تھا۔

میں اس موذی بیماری کا ذکر ان دنوں بہت سنتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ ایک بیماری میرے اندر بھی پل رہی ہے۔ اس بیماری کی تشخیص بھی میرے ترقی پسند دوستوں ہی نے کی اور ترحم اور تحقیر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دنیائے ادب کو بتایا کہ یہ شخص نوسٹلجیا کا مریض ہے۔ آتشک کو اس وقت کی ہماری دنیائے ادب نے بادلیئر کے واسطے سے جانا تھا' نوسٹلجیا کی بیماری کو اس حقیر بیمار کے واسطے سے جانا۔ میں بادلیئر سے برابری کا دعوی کرنے کی جرات تو نہیں کر سکتا مگر اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ نوسٹلجیا بھی کوئی معمولی بیماری نہیں ہے۔ بادلیئر کا مقام و مرتبہ برحق' مگر میری زوال پسندی بھی کوئی ایسی غیر دقیع نہیں ہے۔

شاید یہ میری نوسٹلجیائی ذہنیت کا کرشمہ ہے کہ اب مجھے پاکستان کا ابتدائی زمانہ پاکستان کی ادبی تاریخ کا سنہری دور نظر آتا ہے۔ کیا خوب زمانہ تھا کہ تخلیقی جوش بھی نظر آتا تھا اور نظریاتی لڑائیاں بھی ہو رہی تھیں۔ یعنی ابھی عسکری صاحب نے ادبی جمود کا اعلان کیا تھا نہ ادب کی موت کی خبر بد سنائی تھی۔ وہ وقت ابھی دور تھا۔ ابھی تو گھروں سے نکلنے اور جانوں کے جانے کا غم تازہ تازہ تھا۔ دل گداز تھے۔ بات دل سے نکلتی تھی اور فوراً ہی دلوں میں اتر جاتی تھی۔ منٹو صاحب نے لاہور میں بیٹھ کر پہلا ہی افسانہ لکھا تھا کہ ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تحریر کی ہنگامہ آرائی اپنی جگہ ویسے بھی منٹو صاحب جس محفل میں جاتے کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور اٹھ کھڑا ہوتا۔ لیجئے مجھے حلقہ کی وہ نشست یاد آ گئی جہاں منٹو صاحب لاہور آنے کے بعد شاید پہلی مرتبہ شریک ہوئے تھے۔ وہ داستان سنا رہے تھے جب اپنے خلاف مقدمہ کی پیشی بھگتانے کے لیے وہ اور عصمت دونوں لاہور آئے تھے۔ سنانے لگے کہ پیشی بھگتانے کے بعد ہم دونوں انارکلی بازار گئے۔ عصمت چغتائی نے اپنے لیے جوتی خریدی۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے برجستہ پوچھا ''منٹو صاحب' جوتی کس نمبر کی تھی۔''

بس منٹو صاحب بکھر گئے۔

اصل میں مزاج میں گرمی بہت تھی۔ پارہ جلدی چڑھ جاتا تھا۔ مزاج کے خلاف ذرا کوئی بات ہوئی اور مزاج میں درہمی آئی۔ اسی لیے ان کے افسانے پر یار لوگ بات ذرا سوچ سمجھ کر کرتے تھے۔ مگر محفل میں سب مزاج آشنا تھی تو نہیں ہوتے تھے۔ حلقہ ہی کے ایک جلسہ میں ایک ناعاقبت اندیش نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی برتی اور افسانے پر کڑی تنقید کر ڈالی۔

منٹو صاحب نے برہمی سے معترض کو دیکھا ''برادر' تمہارا نام کیا ہے۔''

''انور شبنم دل۔''

''انور، شبنم، دل'' منٹو صاحب نے رک رک کر کہا۔ پھر بولے ''یعنی اکٹھے تین ناول۔ پہلے فیصلہ کرو کہ تم انور ہو یا شبنم ہو یا دل ہو، پھر افسانے پر بات کرنا۔''

''نقوش'' نے اردو افسانے پر ایک بحث کا اہتمام کیا۔ شہر میں موجود کیسا کیسا نامور افسانہ نگار اور نقاد باغ جناح کے ایک سبزہ زار میں چائے کی لمبی میز کے گرد جمع تھا اور افسانے پر گوہر افشانی کر رہا تھا۔ منٹو صاحب بھی موجود تھے۔ ان کے افسانے زیر بحث آئے۔ سب ہی نے باری باری اظہار رائے کیا اور ان کے افسانے میں کیسی کیسی باریکیاں اور خوبیاں دریافت کیں۔ منٹو صاحب بہت دیر سے بیٹھے تھے۔ اپنے بارے میں ہمعصروں کی رائے سن کر مطمئن ہوئے اور بیچ میں سے اٹھ کر چلے گئے۔ بس ان کے جاتے ہی ہوا کا رخ بدل گیا۔ کسی ایک نے ان کے افسانوں میں کسی خامی کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا۔ کسی دوسرے نے بات کو لپکا اور ڈیڑھ دو اور خامیاں گنا ڈالیں، بس پھر جھجک نکل گئی اور منٹو صاحب پر بے تکلف تنقید ہونے لگی۔

حلقہ کے حوالے سے عسکری صاحب کی سن لو۔ ویسے تو حلقہ کی نشستوں میں آتے نہیں تھے۔ مگر تین نشستوں میں ضرور شامل ہوئے۔ دو نشستوں میں اس طرح کہ اپنے دو مقالے پڑھے۔ تیسرے جلسہ میں صدارت کی تقریب سے شریک ہوئے۔ پوری زندگی میں یہ شاید ان کی پہلی اور آخری صدارت تھی۔ اور کیا خوب صدارت کی کہ حلقہ کی ساری روایت ہی کو ملیا میٹ کر دیا۔ حلقہ میں کوئی تحریر پڑھی جائے اور لکھنے والا داد بیداد سے محروم گذر جائے' یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ مگر یہاں بحث کے کچھ آداب تھے۔ جب مقالہ یا افسانہ ختم ہو جاتا تو صدر بحث کی دعوت دے کر تھوڑا انتظار کرتا۔ اور جب کوئی شروعات نہ کرتا تو حلقہ کے جو اوپننگ بیٹسمین تھے ان سے کسی ایک کو بطور خاص مخاطب کر کے اظہار خیال کی دعوت دی جاتی۔ تب وہ جھرجھری لیتا اور اس جھرجھری کے ساتھ بحث کرنے والوں میں گرمی پیدا ہوتی اور بحث گرمی پکڑتی چلی جاتی۔ مگر عسکری صاحب نے کیا کیا۔ جب مقالہ ختم ہوا تو روکھے سے لہجہ میں کہا ''کسی صاحب کو اس مقالہ کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔''

ذرا سے وقفہ کے بعد کہا کہ ''اچھا تو کسی کو اس مقالہ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔'' اور اس کے ساتھ ہی جلسہ کے ختم کا اعلان کر دیا۔ حلقہ والے ہکا بکا کہ یہ کیا ہوا۔ عسکری صاحب تو صدارت کا طوق گلے سے اتار کر فوراً ہی نکل گئے مگر ان کے جانے کے بعد چائے کی میز پر ان کے خلاف کتنا زہر اگلا گیا۔

عسکری صاحب اکل کھرے آدمی۔ محفلوں سے بدکتے تھے۔ صدارت تو دور کی بات ہے۔ مضمون پڑھنے کے بھی کم کم ہی روادار ہوتے تھے۔ لاہور میں رہتے ہوئے دو مرتبہ آ کر مضمون پڑھا۔ تیسری مرتبہ جب کراچی سے آئے ہوئے تھے تو امجد حسین

نے کہا کہ اس وقت حلقہ کے سیکرٹری تھے انہیں گھیرا۔ وہ آئے مگر دہلیز تک۔ وہیں سے پلٹ گئے۔ جلسہ اوپر وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں ہو رہا تھا۔ نیچے بلیک بورڈ پر پروگرام لکھا دیکھا۔

صدر الطاف گوہر

مقالہ محمد حسن عسکری

''اچھا تو الطاف گوہر کی صدارت ہے۔'' یہ کہتے کہتے پلٹے۔ سامنے ایک تانگہ گزرتا نظر آیا۔ اسے روکا اس لپک کر بیٹھے۔ ساتھ میں سعید محمود کو بھی بٹھالیا۔ اور یہ جا وہ جا۔ میں نے اوپر جا کر امجد حسین کے کان میں کہا کہ تمہارا مہمان تمہیں دغا دے گیا۔

یوم الجزائر کے جلسہ میں جو ادیبوں کی طرف سے ہوا وہ آئے ضرور۔ مضمون بھی لکھا۔ لکھنا ہی تھا' اس جلسہ کے تو وہ محرکین میں سے تھے۔ مگر مضمون پڑھا کسی دوسرے نے۔ خود کیسے پڑھتے۔ اس کے لیے تو سٹیج پر جا کر مائیک کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا۔ ایسا واقعہ تو انہوں نے زندگی بھر اپنے ساتھ گزرنے ہی نہیں دیا۔ عسکری صاحب بس قلم کاغذ کے مرد میدان تھے۔ جلسے جلوس سے بھاگتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ جلسہ جلوس کے قائل نہ ہوں۔ بہت قائل تھے جبھی تو الجزائر کی جدوجہد کے سلسلہ میں صرف مضامین لکھنے پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ ''لیل ونہار'' میں لکھتے لکھتے ادیبوں کی طرف سے یوم الجزائر منانے کے منصوبے میں سبط صاحب کے شریک بن گئے۔ پیش پیش رہے۔ سب میٹنگوں میں شریک رہے۔ مگر جب جلسہ کا وقت آیا تو پچھلی صفوں میں جا کر چھپ گئے۔ سٹیج پر آ کر گھن گھرج سے بولنا' نعرے لگانا یہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ تحریر میں بیشک نعرہ لگوالو۔ آخر انہوں نے پاکستانی ادب کا نعرہ لگایا ہی تھا۔ پاکستانی ادب کا نعرہ۔ پھر اسلامی ادب کا نعرہ۔ مگر نعرے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ عسکری صاحب پورے نہیں کر سکتے تھے۔ جن میں یہ صلاحیت تھی انہوں نے ان نعروں کو اچک لیا اور پھر ان نعروں کی اپنے رنگ سے تعبیر کی۔

لیجئے یہاں مجھے الل ٹپ ڈاکٹر سید عبداللہ یاد آ گئے۔ خوب بزرگ تھے۔ ایک نعرہ ان کے پاس بھی تھا۔ اردو کا نعرہ۔ ان کی تحقیق اور تنقید اپنی جگہ۔ مگر انہوں نے نعرہ لگانے کا بھی حق خوب ادا کیا۔ بیان بازی بھی کی۔ جلسے بھی کئے' جلوس بھی نکالے اور اردو کے نام پر کیسے کیسے ثقہ بزرگ کو سڑکوں پر لے آئے۔ جب دکانوں کے سائن بورڈ اردو میں لکھنے کی تحریک شروع کی تو پروفیسر حمید احمد خاں ان کے ساتھ تھے۔ ایک ایک دکاندار کے پاس گئے اور اسے قائل کیا کہ برادر اپنا سائن بورڈ اردو میں لکھو۔

سید صاحب نے جب دیکھا کہ حکومت تو ٹس سے مس ہی نہیں ہوتی۔ بیان جاری کرو' جلسہ کرو' جلوس نکالو' وہاں کانوں پر جوں ہی نہیں رینگتی اور اردو کے سرکاری زبان بننے کا معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ تب انہوں نے ایک نرالا منصوبہ بنایا۔ اردو کے حق میں

دستخطوں کے ایک میل لمبے جلوس کا منصوبہ۔ اس طرح کہ ایک محضر نامہ تیار کیا جائے دستخطوں سے لبریز اتنا لمبا کہ ایک میل کی خبر لائے۔ اندازلگایا کہ ایک میل لمبے محضر نامے کے لیے کتنے دستخط درکار ہوں گے اور حساب کر کے طے کیا کہ پچاس لاکھ دستخطوں کی ضرورت پڑے گی۔

ایک تن جلے نے کہا کہ سید صاحب پچاس لاکھ دستخط تو جمع کر لیں گے مگر ان دستخطوں کے لیے ایک میل لمبا کاغذ کہاں سے لائیں گے۔ یعنی نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا جی ناچیں گی اور واقعی رادھا جی نہیں ناچیں۔

مگر ایک جلسہ میں عجب ہوا۔ پاکستان نیشنل سنٹر میں جلسہ ہو رہا تھا۔ سید صاحب تقریر کر رہے تھے۔ یعنی اپنے محبوب موضوع اردو کے مسئلہ پر بول رہے تھے۔ سامعین میں سے اچانک ایک شخص کھڑا ہوا اور تیز تیز بولنا شروع کر دیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ہاں اس کا یہ اعلان صاف اور واضح تھا کہ اصلی مجاہد اردو میں ہوں۔ میں اردو کی حیثیت کو حکومت اور قوم سے منواؤں گا۔ سید صاحب حیران کہ یہ مجاہد اردو کس کھوہ سے برآمد ہوا ہے۔ مگر مجاہد اردو برآمد ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ مجاہد اردو لکھنا شروع کر دیا اور سر پر ایک ٹوپی منڈھ لی جس پر چاند تارا بنا ہوا تھا۔ اور پھر شہر میں ہونے والے ہر جلسہ میں نظر آنے لگا۔ خاص طور پر جہاں سید صاحب کو خطاب کرنا ہوتا۔ اسی طرح تقریر کے بیچ کھڑے ہو کر اردو پر پوری تقریر کر ڈالتا اور جلسہ میں کھنڈت ڈال دیتا۔ سید صاحب نے اردو کے لیے بہت مجادلے کیے تھے اور ہر مجادلے میں سرخرو ہوئے تھے۔ مگر اب حیران تھے کہ اس مجاہد اردو سے کیسے نبٹیں۔

لیجیے اس پر مجھے ایک اور مجاہد اردو یاد آ گیا۔ اسی شہر میں ساٹھ کی دہائی میں نمودار ہوا تھا۔ اس کی مار اردو بازار سے ٹی ہاؤس تک تھی۔ اصلی نام تو کچھ اور تھا۔ مگر اب اس نے اپنی مہم کے حساب سے اپنا نام رکھا تھا' الف الحراث۔ کوئی پوچھتا کہ الف الحراث کا مطلب کیا ہے۔ جواب دیتے کہ ہل کا پھل۔

الف الحراث کا موقف یہ تھا کہ اردو کے سارے محاورے' سارا روزمرہ غلط ہے۔ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ مصلح وہ خود تھے۔ کہتے تھے کہ بلی دودھ پی رہی ہے' یہ کیا بات ہوئی۔ غلط زبان ہے۔ کہنا یوں چاہیے کہ بلی دودھ لبڑ رہی ہے۔ شاخ سے آم توڑا۔ غلط بالکل غلط۔ آم شاخ سے توڑا نہیں جاتا' چونٹا جاتا ہے۔ سنگریزہ غلط ہے۔ اصلی لفظ ہے چھن۔ اور سراب۔ یہ سراب کیا ہوا۔ اس کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ اصلی لفظ ہے ہرن پیاس۔

الف الحراث خالی باتیں نہیں کرتے تھے۔ ایک تہلکہ خیز تصنیف کے ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ اس کا نام تھا۔ اردو حریفہ مکالمے۔

اس میں لفظوں اور محاروں کی اسی رنگ سے تصحیح کی گئی تھی۔ عجب توارد ہوا۔ انہیں دنوں افتخار جالب نے نئی لسانی تشکیلات کا شوشہ چھوڑا تھا۔ اور اس سے متاثر ہو کر ظفر اقبال نے اردو محاوروں اور لفظوں کو توڑ پھوڑ کر نئے نئے لفظ نئی نئی ترکیبیں گھڑی تھیں اور اپنی غزل میں کھپائی تھیں۔ یاروں کے لیے یہ نئی اردو تفنن طبع کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اسی ہنگام الف الحراث اپنی تصنیف لطیف 'اردو حریفہ مکالمے' کے ساتھ نمودار ہو گئے۔ میں نے ایک کالم لکھ ڈالا کہ لیجیے اب پتہ چلا کہ نئی لسانی تشکیلات کی تحریک کہاں سے پھوٹی ہے۔ اس کا ماخذ تو 'اردو حریفہ مکالمے' ہے۔ یعنی الف الحراث نئی لسانی تشکیلات کے مرد اول ہیں۔

اس کالم پر سب سے زیادہ غصہ الف الحراث کو آیا۔ مجھ سے آ کے لڑنے لگے۔ کہنے لگے کہ مرد تو مجھے قدرت نے بنایا ہے۔ مرد اول کہہ دینے سے تو میرے مقام و مرتبہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ میں نے کہا پھر آپ کو کس لقب سے یاد کریں۔ بولے کہ "آپ ہمیں عاہل نثرہ الف الحراث کے لقب سے یاد کیجیے۔"

میں نے کہا کہ بہت مشکل اردو ہے۔ اسے تھوڑا سا آسان بنائیے۔

کہا کہ "اچھا یوں کہیے شہنشاہ نثر الف الحراث۔"

پھر میں نے پوچھا کہ "آپ کی نئی کتاب کب آئے گی۔"

کہا کہ "بس آنے والی ہے۔ اس کا نام ہے خاطر غبار۔"

میں نے کہا کہ "یہ نام تو آپ کی اپنی اردو میں نہیں ہے۔"

بولے "یہ مت کہیے۔ یہ نام بہت جلیہ ہے۔"

"جلیہ کا کیا مطلب ہے۔"

بولے "مطلب یہ ہے کہ بہت کشش ناک ہے۔" پھر وضاحت کی کہ "مولانا ابوالکلام آزاد نے تو اپنی "غبار خاطر" میں ساری اردو ہی غلط لکھی ہے۔ میں نے اس کتاب میں اس کی بال پہاڑن کی ہے۔"

"بال پہاڑن' آپ کا مطلب ہے کہ تنقید کی ہے۔"

"تنقید" تحقیر آمیز انداز میں مسکرائے "غلط اردو۔ صحیح اردو ہے بال پہاڑن۔"

"بال پہاڑن آپ نے کس طرح کی ہے۔" میں نے پوچھا۔ بولے "بتاتا ہوں۔ مولانا نے لکھا ہے' چاند بی بی کی قبر۔ یہ تو جھونپڑے والی اردو ہے۔ بالکل غیر ادبی۔"

''پھر ادبی اردو میں چاند بی بی کی قبر کو کیا کہیں گے۔''

جواب دیا ''جدث لبوہ جلوب۔''

بس میں نے الف الحراث کے ہاتھ چوم لئے۔ ''سبحان اللہ۔ نئی لسانی تشکیلات کے اصلی موجد آپ ہیں۔ باقی یہ سب لونڈے آپ کے خوشہ چین ہیں۔''

الف الحراث کا ایک طریقہ اصلاح زبان یہ تھا کہ اگر محارہ ہندی آمیز ہے تو اسے مفرس معرب کر دیتے تھے۔ معرب مفرس ہوا تو اسے نامانوس سا ہندی رنگ دے دیا۔ وہ جو کسی نے کہا تھا کہ

''کہو اردو کو چت کر دیں کہو اردو کو پٹ کر دیں''

تو اس بزرگ کا طریقہ واردات یہ تھا کہ اردو چت ہے تو اسے پٹ کر دو۔ پٹ ہے تو چت کر دو۔

اصل میں یہ تو سودے کی بات ہے۔ اردو کی تھوڑا ہی ابدی ہے۔ سر میں جو بھی سودا سما جائے۔ لیجئے اس پہ مجھے عثمان علی خاں یاد آ گئے۔ خاندانی آدمی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کے خاندان سے تھے۔ مگر اس خاندان کے بزرگوں میں ایک بات دیکھی کہ ہر ایک کی اپنی ایک لٹک۔ سر میں کوئی نہ کوئی سودا سمایا ہوا۔ کوئی اردو کا سودائی۔ کوئی غالب کا متوالا۔ کوئی تحریک خلافت کا کشتہ۔ تو عثمان علی خاں کی بھی اپنی ایک چیٹک تھی۔ میری ان سے مڈھ بھیڑ بس میں ہوئی تھی۔ ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے اور پاکستان ٹائمز کے انتظامی شعبہ سے منسلک تھے۔ روز صبح کو بس سے دفتر جاتے تھے۔ انہیں اوقات میں میں نہر کے پل سے اس بس میں سوار ہوتا تھا۔ بالعموم وہ ڈبل ڈیکر ہوتی تھی۔ میں بالائی منزل میں جاتا تو دیکھتا کہ اگلی نشست پر عثمان علی خاں بیٹھے ہیں۔ ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی ہے۔ اس پر گتے کا ایک کتبہ نصب ہے۔ اس عبارت کے ساتھ

مسلمانو میرا نصب العین ہے

خلیفہ کے پیچھے جمعہ کی نماز پڑھنا

گم سم بیٹھے رہتے۔ مگر اچھرے سے آگے گزر کر جب بس کی یہ بالائی منزل کچھا کھچ بھر جاتی تو وہ جھرجھری لے کر اچانک کھڑے ہو جاتے۔ مسافروں کو مخاطب کرتے ''اے میرے مسلمان بھائیو! میرا اعلان آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ مگر آپ اخباروں کو جانتے ہی ہیں کہ ان کا کیا حال ہے۔ اس اتوار کو ایک اخبار نے میرا اعلان ضرورت رشتہ کے اشتہار کے نیچے چھاپ دیا۔ خیر میں نے اب سے اشتہار کی صورت میں چھپوا لیا ہے۔ جسے درکار ہو مجھ سے لے لے۔ اے میرے مسلمان بھائیو! میں کب سے

جمعہ کی نماز کو ترس رہا ہوں۔ نہیں پڑھ سکتا۔ جمعہ کی نماز تو خلیفہ کے پیچھے پڑھی جاتی تھی۔ خلیفہ کہاں ہے۔ پاکستان بن گیا۔ مگر میں ہنوز جمعہ کی نماز کو ترس رہا ہوں کیونکہ میرا نصب العین ہے خلیفہ کے پیچھے جمعہ کی نماز ادا کرنا۔"

تقریر کر کے بیٹھ جاتے اور بیگ سے اشتہار نکال کر آس پاس بیٹھی ہوئی سواریوں کے ہاتھوں میں تھمانے لگتے۔ کوئی کوئی دور سے اٹھ کر آتا اور خود ہی وہ اشتہار لے لیتا۔ میری ان سے علیک سلیک ہوتی۔ مگر میں ان کے دست مبارک سے یہ اشتہار حاصل کرنے کا شرف کبھی حاصل نہ کر سکا۔ میں تو اپنے دفتر جانے کے لیے ریگل کے بس سٹاپ اتر جاتا۔ اس وقت تک وہ مشتاقان اشتہار کے بیچ گھر چکے ہوتے۔

اورینٹل کالج میں ایک پروفیسر صاحب تھے۔ اب بھی ہیں۔ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ پروفیسر عبیداللہ۔ یوم اقبال کا جلسہ ہو رہا تھا۔ مغرب کا وقت آ گیا۔ مگر مقرر تھے کہ تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ انہوں نے بیچ میں کھڑے ہو کر با آواز بلند اذان دینی شروع کر دی۔ قریب کی نشست سے ایک آواز آئی

"مجھے ہے حکم اذاں لا اللہ الا اللہ"

ارے میں جلسوں کا ذکر کئے جا رہا ہوں' جلسہ گاہوں کو فراموش کر رہا ہوں۔ منڈوا نہ ہو تو تھیٹر کہاں ہوگا۔ کیا مضائقہ ہے کہ تھوڑا ذکر جلسہ گاہوں کا بھی ہو جائے۔ اصل میں جلسوں میں میرا زیادہ آنا جانا کالم نگاری کے حوالے سے تھا۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب میں نے "مشرق" میں لاہور نامہ' کے عنوان سے کالم شروع کیا۔ یہ ایوب خاں کا زمانہ تھا۔ ایوب خاں کے فیض سے لاہور میں دو جلسہ گاہیں وجود میں آئیں اور دونوں نے اس زمانے میں بہت رونق پکڑی۔ اسی زمانے میں پاکستان کونسل قائم ہوئی تھی۔ اس کی پہلی ڈائریکٹر فرخ نگار عزیز تھیں۔ الفلاح کی دوسری منزل میں کونسل کا دفتر بنا اور ساتھ میں جلسوں کے لیے ایک ہال۔ ان کے بعد قیوم نظر یہاں ڈائریکٹر ہوئے۔ وہ حلقہ ارباب ذوق والا اپنا تجربہ اپنے ساتھ لائے اور اچھے جلسے کرائے۔ ان کے بعد کشور ناہید اس ادارے میں رونق افروز ہوئیں اور اس کے جلسوں میں رونق پیدا کی۔ دوسری جلسہ گاہ اس زمانے میں بی این آر کے نام سے وجود میں آئی۔ بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن عہد ایوبی میں نمودار ہوا۔ اس کے زیر اہتمام ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس کے بیچ بی این آر آڈیٹوریم نے نمود کی۔ ایوب خاں کے زمانے تک یہاں بہت چہل پہل رہی۔ کتنے بزرگوں اور شہر کے نامور مقرروں مورخوں محققوں کو میں نے یہیں سے جانا۔ اے لو مجھے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی یاد آ گئے۔ کیا خوب بزرگ تھے اور کیا کمال کے تھے۔ بی این آر آڈیٹوریم میں سر عبدالقادر کی یاد میں جلسہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے مقالہ پڑھا اور عجب سوال اٹھایا۔ ایک شخصیت کا ذکر کیا کہ اس نے سر شیخ

عبدالقادر اور علامہ اقبال دونوں کو دعوت پر بلایا۔ جب کھانا پینا ہو چکا اور دستر خوان لپٹ چکا تو اس نے علامہ سے پوچھا کہ گستاخی معاف کیا آپ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے سوال کیا کہ آخر وہ کون شخص تھا۔ اس کا نام و پتہ معلوم ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ اسی سوال کی راہ تو علامہ کی شاعری میں وہ موڑ آیا کہ وہ اردو سے فارسی شعر کی طرف راغب ہو گئے۔

پھر انہوں نے ایک اور دعوت کا ذکر کیا جو خود علامہ اقبال نے کی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ جب علامہ سید سلیمان ندوی اس شہر میں وارد ہوئے تو علامہ نے اپنے یہاں ان کی دعوت کی۔

اب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے سامعین کے بیچ بیٹھے بیٹھے ایک جھرجھری لی اور لپک کر سٹیج پر آئے۔ کہا کہ آگے کی بات میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آگے کی بات انہوں نے اس طرح بتائی کہ وہ باورچی کون تھا جس نے کھانا پکایا تھا اور اس شام اس نے کون کونسے کھانے تیار کیے تھے۔ کس تفصیل سے انہوں نے باورچی کا ذکر کیا۔ معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کی شاعری کے بارے میں تحقیقات پر جتنی توجہ صرف کی ہے اتنی ہی اس باورچی کے بارے میں بھی تحقیقات پر دھیان دیا ہے۔ پھر انہوں نے وہ کھانے گنانے شروع کیے جو اس نے کمال ہنر سے اس شام تیار کیے اور دستر خوان پر سجائے۔

باورچی کا نام انہوں نے نہیں بتایا۔ بس ان کی تحقیق میں یہی ایک کھانچہ رہ گیا تھا۔ مگر جس پہلوان نے علامہ کو اکھاڑے میں زور کرائے تھے اس کا نام انہیں خوب یاد تھا۔ کسی دوسرے موقع پر اسی ایوان میں انہوں نے علامہ اقبال کی پہلوانی کا ذکر کیا۔ انہوں نے اپنی تحقیق سے اس پہلوان کو ڈھونڈ نکالا اور بتایا کہ اس کا نام لاٹو تھا۔ اقبال اور آغا باقر اس کے بچپن کے دوست تھے۔ دونوں کو اس نے اپنی شاگردی میں لے کر زور کرانے شروع کر دیئے۔ سو برسوں علامہ لنگر لنگوٹ باندھ کر لاٹو کے اکھاڑے میں زور کرتے رہے کشتی لڑتے رہے۔

مگر اقبالیات والوں نے ان کی اقبالیاتی تحقیق کی قدر نہیں کی اور ایک سوال انہوں نے ایسا اٹھایا تھا کہ شہر کے مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینا چاہیے تھا مگر نہیں دیا۔ یہ لڑائی انہوں نے اکیلے ہی لڑی۔ جب مسجد شہداء تعمیر ہو رہی تھی تو انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ مسجدوں کا جو روایتی طرز تعمیر ہے یہ اس سے انحراف ہے۔ اس مسئلہ کو وہ عدالت تک لے گئے۔ مگر بیچاروں نے اکیلے ہی یہ لڑائی لڑی۔ اکیلا آدمی کتنا لڑ سکتا ہے۔ بیچارے ہار گئے۔ اور مسجد شہداء اپنے اکیلے مینار کے ساتھ بخیر و خوبی کھڑی ہو گئی۔

اور ہاں اپنے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید جنہیں میں نے بی این آر میں بھی بہت سنا اور پاکستان کونسل میں بھی۔ کیا وضعدار آدمی

تھے۔ نپا تلا لباس پہنتے تھے' نپا تلا مضمون لکھتے تھے۔ گرمی جاڑا برسات جو بھی موسم ہو اور جو بھی پہر ہو بیشک جون کی کھڑی دوپہر ہی ہو وہ سوٹ میں ملبوس نظر آتے۔ مولانا صلاح الدین احمد اور عبدالمجید بھٹی کے بعد وہ اس شہر کی تیسری شخصیت تھے جنہوں نے سوٹ کو ایسی وضعداری کے ساتھ نبھایا کہ جون جولائی کی گرمی بھی اس کے سامنے بے اثر نظر آئی۔

ڈاکٹر صاحب کی کسی نہ کسی سے ٹھنی ہی رہتی تھی۔ ایک زمانے میں ان کی مرغوب صدیقی سے بہت چلی ہوئی تھی۔ مرغوب صدیقی اللہ کو پیارے ہو گئے تو انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی سے دشمنی مول لے لی۔

ادھر ابوالاثر حفیظ جالندھری سے ہمیشہ بگڑے رہتے تھے۔ حفیظ صاحب جواب میں کہتے کہ یہ میرا نالائق بھتیجا ہے۔ میں اسے کیا کہوں اور پھر خوب کہتے بھی تھے۔ میں نے حفیظ صاحب سے ایک گفتگو کی اور اسے اپنے کالم میں شائع کر دیا۔ عبدالسلام خورشید کو ایسا موقع خدا دے۔ فوراً خط لکھا۔

''آپ نے اپنے والہ وشیدا حفیظ جالندھری پر جو کچھ لکھا تشنگی سے عبارت ہے۔ ہم نے مانا فیض شاعر نہیں ہے' جگر سوچتا نہیں ہے۔ یگانہ انانیت کی وجہ سے اقلیم شعر سے نکالا گیا۔ رہا جوش تو حفیظ فرماتے ہیں کہ ''اگر وزن میں لکھنے والے کو شاعر کہتے ہیں تو وہ شاعر ہے۔'' تعجب کی بات ہے کہ آپ نے اقبال کے بارے میں نہ پوچھا۔''

ادھر حفیظ صاحب نے میری خبر لی۔

''میاں صاحبزادے تم نے میری گفتگو کا وہ حصہ قلمبند نہیں کیا جو ڈاکٹر عبدالسلام خورشید و نیز فیض احمد فیض سے متعلق تھا۔ علاوہ ازیں یہ کہ جوش کو واقعی میں قافیہ ردیف کے لحاظ سے کسی بات کو نظم کر دینے والا مانتا ہوں اور لغات الفاظ جانتا ہوں' شاعر نہیں۔''

چچا بھتیجے کی لڑائی سے قطع نظر میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا ایک لحاظ سے بہت قائل تھا۔ طول کلام کے بالکل قائل نہیں تھے۔ ناپ تول کر لکھتے تھے۔ جو مضمون جلسہ کے لیے لکھ کر لاتے نو منٹ کا ہوتا۔ نہ ایک سیکنڈ کم نہ ایک سیکنڈ زیادہ۔ پھر جلسوں کے رنگ کو دیکھ کر طے کیا کہ نو منٹ زیادہ ہیں۔ مضمون سات منٹ کا ہونا چاہیے۔ جلسہ کے مقرروں' مقالہ نگاروں میں ایجاز اور اختصار کا قائل میں نے صرف انہیں کو دیکھا۔ مجھ پہ مہربان ہوئے تو مجھے بٹھا کر نصیحت کی کہ اگر دل کی بیماری سے بچنا چاہتے ہو تو انڈے اور مکھن کو بالکل بھول جاؤ۔ گرم مصالحوں اور چکنی چیزوں سے پرہیز کرو۔ اپنا وزن بڑھنے مت دو۔ صبح کی سیر کو اپنی عادت بنالو۔

میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ سارے پرہیز آپ کرتے ہیں۔ صبح کی سیر بھی باقاعدگی سے کرتے ہیں۔ موٹاپے سے بھی آپ کوسوں دور ہیں۔ مگر دل کی بیماری تو پھر بھی آپ کو لگ گئی۔ اس بات کا جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

خوش آ گئی ہے ضیا کو جالندھری میری
وگرنہ شعر مرے کیا ہیں شاعری کیا ہے

یہ شعر خوب چلا۔ شاید حفیظ صاحب کے کانوں تک بھی پہنچ چکا تھا۔ ضیا الدین جالندھری کی طرف دیکھ کر بے ساختہ بولے۔ ''ایک میں جالندھری ہوں جس کے گال پچکے ہوئے ہیں اور رنگ کالا پڑ گیا ہے۔ ایک یہ جالندھری ہے جس کے گال بھرے ہوئے ہیں اور رنگ سرخ وسفید ہے۔''

یہ کرنل صدیق سالک کی کتاب ''Witness to Surrender'' کی افتتاحی تقریب بھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال صدارت کر رہے تھے۔ ایس ایم ظفر مقررین میں شامل تھے۔ کہہ رہے تھے کہ میں نے جلدی جلدی یہ کتاب پڑھی اور یہاں حاضر ہو گیا۔ جاوید اقبال نے تعجب بھرا نکرا لگایا' اچھا' کتاب پڑھ لی۔ پاکستان کے لیڈر حضرات تو کتاب پڑھنے کے سرے سے قائل نہیں ہیں۔''

اچھا حفیظ صاحب اگر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو بھتیجا بتاتے تھے تو مولانا عبدالمجید سالک کے ہمعصر اور رفیق ہونے کے ناتے سے کہتے تھے کہ سالک صاحب سے تو مجھے کبھی نیاز حاصل نہیں ہوا مگر ان کی وجہ سے مجھ پر ایک چوری کا الزام ضرور لگا تھا۔ دیکھئے پھر مجھے م' حسن لطیفی یاد آ گئے۔ کیا کمال کے آدمی اور کیا کمال کے شاعر تھے۔ پستش بغایت پست۔ بلندش نہایت بلند:

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا کہ تم نے فراموش کر دیا

ان کی دلچسپ شخصیت نے مجھے ایک مرتبہ گدگدایا تو میں نے ایک کالم لکھ ڈالا۔ بس ناراض ہو گئے اور ایسے ویسے ناراض۔ اس وقت آفاق کے مینجنگ ایڈیٹر میر نور احمد تھے۔ انہوں نے مجھے بلا کر پوچھا کہ م' حسن لطیفی کے بارے میں آپ نے کیا لکھ دیا ہے۔ وہ آپ سے بہت ناراض ہیں۔ یہ کہتے کہتے ان کا مکتوب گرامی میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ لکھا تھا کہ یہ جو آپ کے دفتر میں ایک شخص انتظار حسین کام کرتا ہے۔ یہ اصل میں عبدالمجید سالک کا گماشتہ ہے۔ اس کے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔ عبدالمجید سالک میرا دشمن ہے۔ اس کے کہنے پر اس نے میرا دماغ چرا لیا ہے۔

شام پڑے میں ٹی ہاؤس گیا تو ناصر کاظمی نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا ''تم نے لطیفی صاحب کو ناراض کر دیا۔'' پھر جب لطیفی صاحب آئے تو ناصر نے ان کے سامنے میری پیشی کرائی۔ میں نے معافی مانگی اور ناصر نے انہیں منا کر مجھے معافی دلوائی۔

ویسے تو ڈاکٹر سید عبداللہ بھی کئی بار مجھ سے ناراض ہوئے۔ مگر انہیں خوش کرنے کا نسخہ میرے پاس تھا۔ اردو کے حق میں ان کے

بیان یا ان کی تقریر کی تھوڑی تعریف کر دی تو بس خوش ہو گئے مگر اردو کے سوا بھی تو ان کی کچھ پریشانیاں تھیں۔ یوں سمجھو کہ ان کی بڑی پریشانیاں دو تھیں اردو اور نیچی نظر کی تہذیب۔ ان کی اس دوسری پریشانی میں ان سے ہمدردی جتانا ذرا مشکل تھا۔ اصل میں وہ زمانہ گزر گیا تھا جب اورینٹل کالج میں وہ پرنسپل تھے اور طالبات برقعوں میں لپٹی لپٹائی نظر آتی تھیں۔ اب وہ جس جلسہ میں جاتے دیکھتے کہ بیبیاں لڑکیاں بالیاں کھلے سر منہ طباق سا لئے بیٹھی ہیں اور وہ اپنی تقریر میں بتاتے کہ پاکستان کا معاشرہ اصل میں پردہ دار معاشرہ ہے اور اس کی تہذیب نیچی نظر کی تہذیب ہے۔ مگر یہاں تو لڑکیوں کے دیدوں کا پانی ڈھلتا چلا جا رہا تھا اور دوپٹے مختصر ہوتے چلے جا رہے تھے۔

پھر جب امرتسر میں بوسٹر لگا اور ہندوستان کے ٹی وی پروگرام پاکستان میں نظر آنے لگے تو انہوں نے سخت احتجاج کیا کہ ہندوستان نے پاکستان پر ثقافتی حملہ کر دیا ہے۔

بہر حال خوب زمانہ تھا اور خوب لوگ تھے۔ ہر بزرگ کی اپنی ایک لنک تھی۔ وہ زمانہ کیا ہوا۔ وہ لوگ کہاں چلے گئے۔ اس کے بعد تو محفلوں میں درہمی آتی چلی گئی اور جلسوں کا رنگ بدلتا چلا گیا۔ جن ایوانوں میں یہ جلسے ہوا کرتے تھے ان ایوانوں میں خاک اڑنے لگی۔ وائی ایم سی اے کا حال بدحال ہو گیا۔ بی این آر آڈیٹوریم ایوب خاں کے دور کے ختم ہونے سے پہلے ہی اجڑ گیا تھا۔ پاکستان کونسل کا حال رفتہ رفتہ ابتر ہوا۔ آخر کے تئیں اس ادارے ہی کا بستر لپٹ گیا۔ کافی ہاؤس میں تو بہت پہلے تالا پڑ گیا تھا۔ پھر چینیز بھی بند ہو گیا۔ پھر مال پر ایک ایک کر کے سارے ریسوراں بند ہو گئے۔ ٹی ہاؤس ٹائروں کی دکان بننے سے بال بال بچا۔ مگر کیا بچا۔ اس کا نقشہ حلقہ ارباب ذوق کے نقشہ سے ابتر۔ حلقہ ارباب ذوق کا نقشہ ٹی ہاؤس سے بڑھ کر ابتر۔ پھر ہمارا جی بھی محفلوں صحبتوں سے اچٹ گیا۔

ہاں نواز شریف کے دور ثانی کے ایک جلسہ کا ذکر سن لیجئے۔ نیا ہال نئے رنگ کے مقررین۔ ہال ادارہ حقوق انسانی کا کہ عین شاکر علی میوزیم کے سامنے تعمیر ہوا۔ مشعل نے کوئی بھلی سی کتاب چھاپی تھی۔ اس حوالے سے برداشت کے موضوع پر مذاکرہ ہو رہا تھا ایسے عالم میں کہ ہندوستان ایٹمی دھماکہ کر کے برداشت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ چکا تھا اور پاکستان اس دبدا میں تھا کہ برداشت کا دامن چھوڑے یا پکڑے رہے۔

مذاکرے کے پہلے مقرر منو بھائی تھے۔ منو بھائی نے تقریر کرنے سے پہلے خبر سنائی کہ میں ابھی ابھی باہر سے یہ خبر سن کر آ رہا ہوں کہ پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کر دیا ہے۔

منو بھائی نے یہ خبر سنا کر اپنے ایک قیمتی سامع سے تو فوراً ہی ہاتھ دھو لیے۔ عبداللہ ملک فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے ''اچھا۔'' اتنا کہا اور یہ جا وہ جا۔ باقی لوگ بیٹھے رہے۔ مگر اب منو بھائی کی تقریر کسے سننی تھی۔ ادھر تقریر ہوتی رہی۔ ادھر پاکستان کے ایٹمی دھماکے پر یار لوگ کانا پھوسی کرتے رہے۔

خدا خدا کر کے منو بھائی کی تقریر ختم ہوئی۔ دوسرا مقرر تقریر کرنے کھڑا ہوا۔ اسی آن ایک صاحب باہر سے لپکے ہوئے آئے اور خبر سنائی کہ لیجیے پاکستان نے ایک اور دھماکہ کر دیا۔ یہ خبر اس مقرر پر بھاری پڑی۔ تقریر کر کے جلدی ہی بیٹھ گئے۔ مگر پھر یہ ہوا کہ جو مقرر تقریر کرنے مائیک کے سامنے آتا اسے ایک نئے دھماکے کی خبر تقریر سے پہلے آ لیتی۔ پانچویں اور آخری مقرر آئی اے رحمن تھے۔ وہ جب مائیک کے سامنے آئے تو خبر لانے والا خبر لایا کہ لیجیے پانچواں دھماکہ بھی ہو گیا۔ ہندوستان کے ساتھ معاملہ برابر ہو گیا۔ آئی اے رحمن نے بہت مایوسی کے لہجہ میں کہا کہ اس کے بعد کوئی بھی بات کرنے کی کہاں گنجائش رہ جاتی ہے۔ آخر کیا بات کی جائے میں تو سمجھ نہیں پا رہا۔ اسی لہجہ میں مایوسی میں ڈوبے ہوئے چند فقرے اور بولے۔ رکے۔ میں سمجھا کہ وہ واپس آ کر اپنی نشست پہ بیٹھ جائیں گے۔ مگر پھر وہ بولتے ہی چلے گئے۔ اس شام انہوں نے اپنی زندگی کی شاید سب سے لمبی تقریر کی۔

اگلے دن مجھے اسلام آباد جانا تھا۔ وہاں کشور کی سرکردگی میں پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس نے ایک ڈرامہ فیسٹیول کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مجھے اس میں شریک ہونا تھا۔ سہ پہر کو بیکٹ کے ایک مختصر ڈرامے سے اس کا آغاز ہوا۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ بیکٹ کا ڈرامہ ڈرامے کی اس تحریک کے واسطے سے پہچانا جاتا ہے جسے ایبسرڈ (Absurd) ڈرامے کا نام دیا گیا ہے۔ اردو میں اسے لایعنیت کا کھیل کہہ لیجیے۔ کھیل شروع ہونے لگا تھا کہ کشور یکایک داخل ہوئی۔ میرے قریب آ کر کھلکھلا کر ہنسی۔ ''لو پاکستان نے چھٹا دھماکہ کر دیا۔'' اسی آن ہال میں اندھیرا ہو گیا۔ بیکٹ کا لایعنی کھیل شروع ہو چکا تھا۔ میں سمجھا کہ یہ قہقہہ اور یہ خبر بیکٹ کے لایعنی کھیل ہی کا حصہ ہے۔

کتنے برس گزر گئے۔ مگر مجھے اب تک یہی لگ رہا ہے کہ جیسے میں پی این سی اے کے تھیٹر ہال میں بیٹھا ہوں اور بیکٹ کا لایعنی کھیل جاری ہے۔ یا الٰہی یہ ایبسرڈ ڈرامہ یہ لایعنیت کا ناٹک آخر ہے یا شیطان کی آنت ہے ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا۔

◆◆◆